

مقالاتِ حافظ محمود شیرانی

جلد اول

اردو زبان اور اس کے آغاز و ارتقاء سے متعلق مضامین

سرستبہ

مظہر محمود شیرانی

مجلس ترقی ادب

کلب۔ روڈ۔ لاہور

مقالاتِ حافظ محمود شیرانی

جلد اول

لٹریچر، ان اور اس کے آغاز و ارتقاء سے متعلق مضامین

سرِتبہ

مظہر محمود شیرانی

مجلسِ ترقیِ ادب

کلب — روڈ — لاہور

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول : جنوری ۱۹۶۶ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : سید امتیاز علی تاج ، ستارہ امتیاز

ناظم مجلس ترقی ادب ، لاہور

مطبع : شفیق پریس ، لاہور

مستقیم : ایس - ایم - شفیق

قیمت :

فہرست

کیر شہار

صفحہ

مقدمہ و حالات زندگی

- ۱ - مقدمہ از ڈاکٹر سید عبد اللہ ... ۱
 ب - مصنف کے حالات زندگی از مظہر محمود شیرانی ... ۱۵

مضامین

- ۱ - ریختہ ۱
 ۲ - اردو زبان اور اس کے مختلف نام ... ۱۰
 ۳ - اردو کے قدیم کے متعلق چند تصریحات ... ۳۵
 ۴ - آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فارسی ... ۵۳
 ۵ - فارسی زبان کی ایک قدیم فرہنگ میں اردو زبان کا عنصر ... ۱۰۲
 ۶ - اردو کے قرعے اور دوسرے آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فارسی تصنیفات ... ۱۳۲
 ۷ - گوجری یا گجراتی اردو دسویں صدی ہجری میں ... ۱۵۹
 ۸ - مثنوی لیلیٰ جتوں از احمد دکنی ... ۲۰۱
 ۹ - سب رس از ملا وجہی ... ۲۱۷
 ۱۰ - مثنوی ہوسٹ زلیخا از شیخ محمد امین ... ۲۷۹

تلفیذ و تبصرہ

- ۱۱ - رسالہ 'تاج' کا اردو سے قدیم بحیرہ ... ۲۸۶
- ۱۲ - 'اردو شہ ہمارے' از ڈاکٹر سید علی الدین قادری زور ۲۸۹
- ۱۳ - رسالہ 'ہندوستانی' کا پہلا شمارہ ... ۳۱۲
- ۱۴ - اشارہ ... ۳۲۱
- ۱۵ - صحت نامہ اغلاط ... ۳۶۲

(۱)

مقدمه

از

فلاکثر سید عبدالله

(۲)

حالات زندگی حافظ محمود شیرانی

از

مظفر محمود شیرانی (مراتب)

مقدمہ

(ڈاکٹر سید عبد اللہ)

بزرگ وار استاد مرحوم و مغفور پروفیسر حافظ محمود شاہ شیرانی ان فضلاء کبار میں سے تھے جن کی تحریر کی ہر ہر سطر کو مستند اور معیاری قرار دیا جا سکتا ہے اور قرار دیا گیا ہے ، — انہوں نے فارسی ادب اور اردو زبان کے اہم شاہکاروں اور ان سے متعلق پیچیدہ مسئلوں پر قلم اٹھایا — اور اپنی صد گہر اور محیط تحقیق و کاوش سے ان عقیدوں کو حل کیا اور ان مفالطوں کو دور کیا جن پر صدیوں سے بے خبری کی تاریکی چھائی ہوئی تھی — انہوں نے جو کچھ لکھا اس کی تردید ، کرنے کو ، تو کی گئی ہوگی مگر حق یہ ہے کہ تردید کسی سے ہو نہ سکی ۔

پروفیسر شیرانی ادب کے مؤرخ اور محقق ہونے کے علاوہ عتیقات کے بھی منفرد ماہر تھے ۔ علم سکہ شناسی ، کتبہ شناسی ، سہر شناسی ، تصویر شناسی ، قدیم کاغذ ، روشنائی ، آرائش ، نقش و نگار اور عام خط کی شناخت کے علاوہ اصالیب ادب سے گہری واقفیت رکھتے تھے اور اس مہارت کی وجہ سے تصنیفات کے تاریخی مفالطوں کو کامیابی سے دور کرنے میں بد طولوں رکھتے تھے ۔ ان معاملات میں برصغیر پاک و ہند میں صرف مرحوم استاد مولوی ہد شفیق ہی ایک ایسے شخص تھے جنہیں پروفیسر شیرانی کا ہم رتبہ سمجھا جا سکتا ہے ۔ اس مضمون میں (جو یہ طور مقدمہ لکھا جا رہا ہے) استاد مرحوم کے علمی کام اور طریق کار کے بارے میں تفصیل کی گنجائش نہیں ، البتہ بعداً کچھ عرض کیا جا سکتا ہے ۔

پروفیسر شیرانی کی تین حیثیتیں نمایاں تھیں : استاد ، مورخ اور محقق۔ ان کا علمی کام زیادہ تر تحقیق زبان اور تحقیق واقعات سے متعلق ہے۔ انھیں سب سے زیادہ شہرت دو موضوعات کی بنا پر حاصل ہوئی : اول تنقید 'شعرالعجم' ہے ، دوم 'پنجاب میں اردو' کی وجہ سے۔

'تنقید شعرالعجم' کہنے کو 'شعرالعجم' کی بعض تاریخی غلطیوں کی اصلاح سے متعلق ہے لیکن درحقیقت اس میں ساری فارسی شاعری کی ایک بڑی قاعدہ تاریخ آگئی ہے۔۔۔۔۔ شاہ نامہ فردوسی اور محمود غزنوی کے بارے میں چند صدیوں سے جو غلط فہمیاں فارسی عقائد کا حصہ بن چکی ہیں ، شیرانی کے گہرے مطالعے نے ان سب کو ناقابل تردید دلائل سے دور کر دیا ہے۔ اس سلسلے کی تحقیق 'فردوسی پر چار مقالے' میں درج ہے۔ ایک اہم تحقیق دیوانت اس اقواء کے بارے میں ہے کہ فردوسی نے محمود غزنوی کے ایماء پر اور علی کے وعدے پر 'شاہ نامہ' لکھا مگر آخر میں وہ موعودہ صلہ نہ ملا۔ اس سے ناراض ہو کر اس نے محمود کی جگو لکھ ڈالی۔ یہ ایک ایسی چند اقواء تھیں جو تاریخی حقائق سے بھی زیادہ ہفتہ اور محکم ہو چکی تھیں۔ شیرانی نے داخلی شواہد کی مدد سے اس تخیل کا طلسم توڑا اور اس سارے قصے کو افسانہ ثابت کر کے محمود غزنوی کو اس جھوٹ کی گرفت سے آزاد کیا۔

'تنقید شعرالعجم' کے معرکہ آرا مباحث میں چند ایسے مباحث بھی ہیں جن میں تاریخ پر افسانے کا قاترانہ غلبہ تسلیم ہو چکا تھا۔ ان میں کئی مضامین نئے حقائق و انکشافات پر مشتمل ہیں۔ ان میں عطار سے متعلق بحثیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

شیرانی نے اپنی تحقیق میں خارجی شواہد کے علاوہ داخلی شہادت کا طریقہ استعمال کیا اور یہ بہت کامیاب رہا۔۔۔۔۔ اسی طریقے سے انھوں نے بعض کتابوں کے غلط انتساب کے مغالطوں کو دور کیا۔ مثلاً دیوان حسن ، دیوان معینی ، ہر تہی راج راسو اور خالی باری جو اصلی مصنفوں کی بجائے بعض دوسرے لوگوں کی طرف منسوب ہو گئی

تھیں ، پروفیسر شیرانی نے اصل مصنفوں کو ان کی کم شدہ کتابیں واپس دلائیں ۔ یہ بازیافت یعنی کم شدہ کی بازیافت پروفیسر شیرانی کا خاص میدان تحقیق تھا اور اس میں ان کی یکتائی تسلیم شدہ امر ہے ۔

پروفیسر شیرانی کو ہندوستان کے فارسی ادب سے گہری دل چسپی تھی ۔ ان کی آرزو تھی کہ اس ادب کی تاریخ میں جو بڑے بڑے خلا موجود ہیں ان کو پر کیا جائے ۔ شمس العالی پروفیسر عبدالغنی نے اس ادب کی جو تاریخ لکھی اس سے وہ مطمئن نہ تھے ، اور پروفیسر براؤن اور علامہ شبلی کی متعلقہ تصانیف کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ اس میں اجمال ناگزیر تھا ۔ ان وجوہ سے وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ہندوستان کے فارسی ادب سے ایرانیوں کی بے اعتنائی تو قابل فہم ہے مگر خود ہندوستان والوں نے بھی اس ذخیرے کو محفوظ نہ رکھا ۔

اس معاملے میں بڑی مشکل ادب پاروں کی جستجو اور بازیافت کی تھی ۔ وہ مخطوطات و مطبوعات کی تلاش کے لیے جہاں بھی جاتے ، اس پر خاص نظر رکھا کرتے تھے کہ ہندوستان کے فارسی ادب کی کوئی نئی کتاب مل جائے ۔ اس کوشش میں مثنوی عروۃ الوثقیٰ شبلی ، ہر الفاضل اور اخلاق ظہیری وغیرہ وغیرہ ان کے کتاب خانے میں آئیں ۔ بہت سی کتابیں ایسی بھی انہوں نے جمع کیں جن کے نسخے دوسرے کتب خانوں میں ہیں ، مگر ان کے مد نظر یہ تھا کہ ادب ہند (فارسی) کا ذخیرہ ان کے پاس زیادہ سے زیادہ مکمل ہو جائے ۔ ہندوستان کے فارسی ادب کے سلسلے میں منیر لاہوری پر ان کا مضمون قابل ذکر ہے ۔

پروفیسر شیرانی عروض کی تشکیل نو کے مسئلے میں بھی بڑی دل چسپی رکھتے تھے — اس سلسلے میں انہوں نے نئے اوزان دریافت کرنے کی کوشش کی اور رباعی کے اوزان کے بارے میں جو مقالے پہلے ہوئے ہیں ان کو بھی دور کیا ۔

اردو کے سلسلے میں ان کی توجہ کا آغاز 'ہنچاب میں اردو' سے ہوتا ہے ۔ یہ کتاب انہوں نے اس وقت لکھی جب وہ اسلابہ کالج لاہور

میں اردو اور فارسی کے استاد تھے۔ اس کتاب نے ہر صلیب میں تحقیق کے رجحان پر خاصا اثر ڈالا۔ اس کتاب کے فوراً بعد تحقیق زبان کی سوہانی تاریخیں وجود میں آنے لگیں مثلاً دکن میں اردو، گجرات میں اردو اور بعد میں بہار میں اردو، سرحد میں اردو اور بنگال میں اردو مرتب ہوئیں۔

اردو کی ابتدا کے نظریے اب تک بے زیادہ ہیں — بعض مصنفوں نے پروفیسر شیرانی کے اس خیال کی بے ضرورت طور پر تردید کی ہے کہ اردو کی ترقی مسلمانوں کی تاریخ عند کے واقعات کے تابع رہی ہے۔ اس کا آغاز مسلمانوں کی آمد اور اس کے نتیجے کے طور پر ہندوؤں سے میل جول کے ذریعے ان علاقوں میں ہوا جن میں مسلمان سب سے پہلے آئے۔ چنانچہ پہلے وادی سندھ میں عربوں کے حملے کے بعد، پھر شہان سے آنے والے ترک حملہ آوروں کی بے دریغ یورشوں اور بالآخر تسخیر و قبضہ کی وجہ سے پنجاب اور شمالی ہندوستان میں اختلاط اور ایک نئی زبان کا مایہ خمیر تیار ہوا۔ اس کے بعد مسلمان فاتحانہ حیثیت سے جلدھر جلدھر گئے یہ نئی زبان نئی شکلیں اختیار کرتی گئی — تاکہ اس میں ادب پیدا ہوا اور نظم و نثر کے بڑے بڑے شاہکار وجود میں آئے۔ گجرات، دکن، دہلی، یورپ، کلکتہ وغیرہ سب اس کے بڑے بڑے مرکز تھے، ان مرکوزوں کے قیام میں سیاسی واقعات نے بہت بڑا حصہ لیا۔

پروفیسر شیرانی کے نظریے کا ماحصل یہی ہے۔ جو صاحب اس صحیح تاریخی نظریے سے انکار کرتے ہیں وہ پنجاب کو وہ حق بھی نہیں دینا چاہتے جو تاریخی واقعات کی روشنی میں اسے حاصل ہے۔ تاریخ کی شہادت یہی کہتی ہے کہ :

اردو زبان کا پہلا مایہ خمیر پنجاب میں تیار ہوا — اس کا کھڑی بولی یا برج بھاشا والے نظریے سے کوئی تعادم نہیں، نہ دکن میں اردو یا گجرات میں آغاز تصنیف والے نظریے سے کوئی ٹکراؤ ہے — اس نظریے کا یہ لازمی تقاضا تھا کہ مغلوں سے پہلے کے دور میں

اردو کا خارجی وجود بھی ثابت کیا جائے ، ورنہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل جول سے کسی نئی زبان کی پیدائش کا قصہ محض خیال رہ جاتا ہے ۔ اس کے لیے بروکسر شیرانی نے دور مغلیہ سے پہلے کا فارسی ادب سامنے رکھا اور گہرے مطالعے کے بعد اردو کی موجودگی کے ثبوت ہم پہنچائے ۔

اس سلسلے میں انہوں نے شعرائے فارسی کے دواوین اور ان فرہنگوں کی چھان بین کی جن میں تشریح کی خاطر ملکی زبان کے الفاظ بھی پیش کیے گئے تھے — بروکسر شیرانی لکھتے ہیں :

”ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ زبان ہندوستان میں مسلمانوں کے داخلے اور توہان گزینی کا نتیجہ ہے اور جون جون ان کی سلطنت اس ملک میں وسعت اختیار کرتی گئی ، یہ زبان بھی مختلف صوبوں میں پھیلی گئی ۔ دسویں صدی سے اس میں تصنیفات کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے جو سب سے پہلے گجرات میں اور بعدہ دکن میں شروع ہوتا ہے ۔ اس سے پیشتر اس زبان کے وجود کا ہمارے فارسی تصنیفات سے لگ سکتا ہے جو نویں و آٹھویں اور ساتویں قرن ہجری میں ہندوستان میں لکھی گئی ہیں ۔“

اس مفہوم کے پیش نظر انہوں نے الجیرونی ، ابوالفرج رونی ، محمود سعد مسلمان ، عثمان غنٹاری ، سنائی غزنوی ، تاج الدین ریوہ ، منہاج سراج ، امیر خسرو ، ضیاء برلی ، سید محمد بن مبارک کرمانی ، شمس سراج عقیف اور بحر الفضائل کے مصنف محمد بن قوام بن رستم بن احمد بلخی اور دوسرے مصنفوں کی تصانیف سے اردو الفاظ ، محاورات ، فقرے اور دوسرے جمع کیے اور یہ ثابت کیا کہ اردو ساتویں صدی میں گھروں کی زبان بن چکی تھی ۔

خلیجوں اور نغٹوں کی فتوحات کا سلسلہ پھیل کر گجرات اور دکن تک جا پہنچتا ہے — اور سب سے پہلے گجرات ہی میں اودو کو ادبی شکل ملتی ہے ۔ یہ صوبہ ۶۹۹ء میں سلاطین دہلی کے زیر نگیں آتا ہے — ”قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گجرات میں مسلمان شروع ہی سے

اردو بولتے ہیں“ (صفحہ ۱۶۱ ، اس کتاب کا) اس سلسلے میں پرولیسر شیرانی نے شیخ بہاء الدین ہاجن (نویں صدی کے بزرگ) کی تصنیفات سے استفادہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ قاضی محمود دریائی کی ’چکریوں‘ (= ذکرہوں) سے بھی استفادہ کیا ہے۔ شاہ علی محمد جیو کام دہنی (متوفی ۱۰۹۵ھ) ، میان خوب محمد چشتی (متوفی ۱۰۶۳ھ) اور دوسری تصانیف سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اس مجموعے میں احمد ذکئی (جو قطب شاہی دور کا ایک شاعر تھا) کی ’مشنوی‘ ’لیلیٰ مجنوں‘ اور وجہی کی ’سب رس‘ پر بھی ایک مضمون ہے۔ ان سب سے قدیم اردو زبان اور قدیم ترین اردو ادب پر بڑی روشنی پڑتی ہے۔

شیرانی صاحب نے اردو کے مختلف ناسوں پر بھی بحث کی ہے اور لفظ ’رغختہ‘ کے صحیح معنی متعین کیے ہیں اور رختہ کے یہ معنی بالینا نئے ہیں اور شیرانی سے پہلے کسی نے رختہ مصطوب کے اس مفہوم پر غور نہیں کیا۔ [ملاحظہ ہو ”اردو کے مختلف نام“]

لفظ ’اردو‘ کا قدیم ترین استعمال فارسی میں کتب ہوا ۱ شیرانی اس کا سراغ ترقی زبان میں ڈھونڈنے کے بعد فارسی ادب میں اس کے اولین استعمال کے مواقع کا ذکر کرتے ہیں۔ ابتدائی مفہوم تو لشکر ہی کا ہے مگر اسی ابتدائی مفہوم سے اردوئے نظر قرین ، اردوئے شاہی ، ’اردوئے معلیٰ‘ ، اردو بازار وغیرہ اصطلاحات پیدا ہوئیں۔ زبان کے معنوں میں اس لفظ کا استعمال سب سے پہلے شاید خان آرزو کی کتابوں میں ہوا ہے۔ نوادرالانفاذ ، ’مشر‘ اور ’داد سخن‘ میں خان آرزو اس لفظ کو زبان کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ مگر یہ وہ زبان ہے جو شاہی ماحول میں پروان چڑھی — نہ کہ محض لشکر کے ماحول میں۔ شیرانی نے اپنے مضامین میں اس پر زور دیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ مصحفی اور شہاد مراد لاہوری سے پہلے آرزو اس لفظ کو رائج کر چکے تھے۔

زبان اردو کے دائرہ اثر کے سلسلے میں وہ اردو ادب ، مؤرخین زبان اردو کی نظر سے عموماً اوجھل رہا جسے شیرانی اپنے مضامین میں

ہریانوی ادب کہہ رہے ہیں۔ ہریانے کا علاقہ قریب قریب پنجاب کی فیروز پور تحصیل سے شروع ہو کر حصار، رھتک اور آگرے تک جا پہنچتا ہے۔ ممکن ہے یہ حدود اربعہ غیر واضح ہو اور اس میں کئی بڑی ہو۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ ہریانوی اردو کا علاقہ اس سے بھی وسیع تر تھا۔ ادھر خالص پنجابی کے علاقوں سے شروع ہو کر ادھر راجستھان اور آگرے تک اس کی حدیں پھیل جاتی ہیں۔

شیرانی نے اس ادب کو گوشہ گم نامی سے نکالا۔ اس سلسلے میں جو کتابیں ملیں، ان پر مضمون لکھے اور اس زبان کی خصوصیات پر روشنی ڈالی اور یہ ثابت کیا کہ اس ادب کی ابتدا عالم گیر اورنگ زیب کے زمانے میں ہو جاتی ہے اور برابر اس زمانے تک اس میں سلسلہ تصنیف جاری رہتا ہے جب دہلی میں احمد شاہ کے دور میں شمالی ہندوستان کا پہلا بڑا دبستان ادب اردو وجود میں آتا ہے اور ظہور الدین حاتم کے بعد مر، سودا اور درد وغیرہ اردو شاعری کو ایک خاص مقام بخشتے ہیں۔

ہریانے کا ادب اردو مؤرخین کی نظروں سے اس لیے اوجھل رہا کہ اس کا تعلق قصباتی سرگزوں سے تھا اور وہ زمانہ ایسا تھا کہ ہر وہ شے جس پر دوبار یا اردو سے معلیٰ کی سہرا نہ لگی ہو، مستند نہیں سمجھی جاتی تھی۔ دہلی میں فارسی اور اس کے بعد زبان اردو سے معلیٰ کا رعب اس حد تک تھا کہ میر تقی میر اپنے تذکرہ 'لغات الشعراء' میں دکن کی خاصی پر وقار شاعری کو بھی 'برے رتبہ' اور بے وقار کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں؛ انیسے میں ہریانے کی اردو کو کون پہچانتا؟

شیرانی کا یہ جہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے شمالی ہندوستان میں اردو کی تصنیفی عمر کے بارے میں یہ مفالطہ رفع کیا کہ اس کا آغاز چھ شاہ کے عہد میں یا اس کے بعد ہوا۔ پھر یہ مفالطہ بھی دور ہوا کہ اس زبان کا تعلق صرف اردو سے معلیٰ سے تھا۔ حقیقت یہ نکلی کہ اردو ایک عوامی زبان کی حیثیت سے ہر اس جگہ ترقی پاتی جہاں اس کو بھلنے بھولنے کا موقع مل سکا، اس سے اردو کی

وسعت کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور ہتجائی زبان کی حدود کی بھی تعیین ہوتی ہے ، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لاہور ، امرت سرے لکھنے ہی ہتجائی کے اثرات کم اور اردو کے اثرات زیادہ سے زیادہ ہوتے اور بڑھتے جاتے ہیں ۔

ہریان کی طرح راجستھانی کا مطالعہ بھی شیرانی کے مد نظر رہا ۔ دواصل وہ اپنے اس مطالعے کی مدد سے اردو کی وسعتوں اور اس کے مختلف رنگوں کا اندازہ لگانا چاہتے تھے ، اور یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اردو زبان کا وقیع عام خیال کے برعکس کافی وسیع تھا ؛ گو کہ اس کی شکلیں ہر خطے میں مختلف تھیں مگر ایک عوامی زبان جس پر مسلمانی تہذیب کی سہر بھی لگی ہوئی تھی ، دور دور تک پھیلی ہوئی تھی ۔ اس کے مقامی نام مختلف تھے مگر سب کی مرکزی ہستی ایک تھی ۔ ہریان ، راجستھانی ، گوالیاری ، گوجری گجراتی ، دکنی — یہ ایک زبان کے مختلف علاقائی روپ تھے ۔

راجستھانی ادب کے سلسلے میں شیرانی صاحب کا ایک اہم مضمون 'تاریخ غریبی' کے بارے میں ہے ۔ اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ راجستھانی اور ہریان کے ڈائلے آپس میں کس طرح مل رہے ہیں اور دونوں زبانیں ایک دوسرے پر اثر ڈال رہی ہیں ، مگر ان کے اندر وہ عاورد قدر مشترک ہے جو مسلمانی اثرات کا آئینہ ڈال رہے — اور یہ قدر مشترک شمال سے لے کر دکن تک سب ان بولیوں میں موجود ہے جن پر مسلمانوں کا اثر بڑا ۔ ہرانی اردو کے سلسلے میں متفرق مضامین اور بھی ہیں ۔ دائرے کے مہدویوں کا اردو ادب میں حصہ ، 'اہلی عبتوں' احمد دکنی (۱۱ ویں صدی) ، 'مثنوی یوسف زلیخا' از شیخ محمد امین ، 'بکت قصہ' محمد افضل جھنجھانوی وغیرہ ۔ ان سب میں شیرانی نے لسانی خصوصیات کی چہان بین کی ہے یا پھر 'قصہ چہار فرویش' وغیرہ میں 'باغ و بہار' کے مآخذ سے بحث کی ہے ۔

شیرانی کی تنقیدیں جنہیں دواصل تاریخی تحقیق ہی کہنا چاہیے ، فارسی ادب کی طرح اردو ادب سے بھی متعلق ہیں ۔ ان میں 'آب حیات'

پر ان کے مضامین شامل ہیں ، لیکن 'آب حیات' پر تنقید کا سلسلہ مختصر رہا ۔ 'آب حیات' پر شیرانی کی تنقید میں وہ تندی اور لہجے کی درستی نہیں جو ہمیں 'تنقید شعر العجم' میں ملتی ہے ۔ محمد حسین آزاد سے بھی گہری عقیدت جو محبت کے انداز دکھاتی ہے شائد اس کا باعث ہوئی ہو ۔ 'آب حیات' کی غلطیوں کی نشان دہی سے پہلے شیرانی نے روح آزاد سے بڑے ادب سے معافی بھی مانگی ہے ۔ اس کا مقابلہ تنقید 'شعر العجم' کے ان نقروں سے کیجیے جن میں شبلی کو ٹوکا گیا ہے ۔

اس تفاوت کا باعث کیا ہے ؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں مولوی عبدالحق (بابائے اردو) کا ہاتھ ہے جو شبلی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے ۔ اس کا آغاز حیدرآباد میں ہوا ، وہی سوانح المراجہ آگے چل کر ندوہ اور انجمن ترقی اردو کے معاملات پر اثر انداز ہوئی اور شیرانی بھی اس کا شکار ہو گئے ۔

ممکن ہے یہ درست ہو مگر شیرانی کا انداز تحقیق بھی اس کا ذمے دار تھا — شبلی یک سر و ہزار ہوا تھے سرسید ہی کی طرح ، چنانچہ وہ معلم ، محقق ، مؤرخ ، شاعر ، نقاد ، سوانح نگار ، سیاست کے معاملات میں دل چسپی لینے والے ، ندوہ کے بانی ، صحیفہ نویس ، غرض بہت کچھ تھے ۔ اس لیے ان کی تحریروں میں اگر یک سوئی کی کمی نظر آئے تو انہیں معذور خیال کیا جا سکتا ہے اور سچ بوجھ سے تو اتنے مشاغل کے باوجود شبلی کا نکھرا ہوا انداز تصنیف قابل تعجب معلوم ہوتا ہے ۔

شیرانی تحقیق و تصنیف میں یک سو آدمی تھے ۔ ماخذ کے وسیع اور گہرے مطالعے کی انہیں فرصت میسر تھی — ان کے سامنے کوئی ندوہ ، کوئی مسلم لیگ ، کوئی کانگرس نہیں تھی ۔ بس اپنا ہی کام — تصنیف و مطالعہ ! اس صورت میں شیرانی کو بہتر مواقع ملے ۔ چنانچہ انہوں نے ان مواقع سے بڑا فائدہ اٹھایا ۔ قصہ عبدالحق کا بھی ہو سکتا ہے لیکن مسئلہ دراصل یک سوئی کا ہے ۔ یہ ظاہر ہے کہ شبلی ہو یا کوئی اور ، غلطیوں سے مبرا نہیں ہو سکتا ۔ یہ حق کسی کو حاصل

نہیں ہو سکتا کہ اس کی غلطیوں کی اصلاح ہی نہ کی جائے — باقی
 رہی ججے کی بات ، سو اس کے درست ہونے کی شکایت اگر شبلی کے کسی
 عقیدت مند کو ہے تو اس پر ہم اسے بھی سلامت نہیں کر سکتے ۔
 اس میں کچھ شبہ نہیں کہ شبلی اور جد حسین آزاد کے ساتھ مختلف طرح کا
 سلوک ہوا ہے ۔ اسی لیے دونوں پر تنقید کا لہجہ بھی مختلف ہے !
 لیکن تقلیدی روح دونوں میں یکساں ہے ۔ ’ دیوان ذوق ’ مرتبہ
 جد حسین آزاد پر انہوں نے جو مضمون لکھا ہے اس کے بارے میں بھی
 یہی کچھ کہا جا سکتا ہے ۔

پروفیسر شیرانی عنایت کے بھی بڑے ماہر تھے ، کتبہ شناسی اور
 سکے شناسی بھی ان کے کمالات میں شامل تھی ۔ وہ سکوں کی تلاش میں
 دور دور کا سفر کیا کرتے تھے ۔ چنانچہ وفات سے قبل ان کے پاس
 ہزاروں سکے جمع ہو چکے تھے جن کے مطالعے سے انہوں نے چند
 مضامین مرتب کیے ۔ ان میں پہلی صدی ہجری میں ”عرب حال کے
 ایرانی مسکوکات“ اور ”مسکوکات کی ایک نمائندگی کی روداد“ —
 دونوں مضمون معلومات سے لبریز ہیں ۔

پروفیسر شیرانی دشوار پسند طبیعت کے مالک تھے ، اس لیے نئی
 دریافتوں کے علاوہ بعض نہایت ہی مشکل فنون کی طرف خاص طور سے
 متوجہ تھے ۔ فن قنوج گوئی کے رموز کے ماہر تھے اور مشکل سے مشکل
 جملوں اور شعروں سے (جن میں تعمیہ کی بیچ دار صورتیں ہوتی تھیں)
 بڑی آسانی سے تاریخ نکال لیتے تھے ۔ اسی طرح ان کی مہارت عروض بھی
 تسلیم شدہ ہے ۔ ان کی ایک آرزو یہ بھی تھی کہ عروض کی تشکیل نو
 کی جائے ؛ خاص طور سے یہ امر ان کے مد نظر تھا کہ عروض مروجہ
 کو سہل بنایا جائے تاکہ وزن کا شعور آسانی سے پیدا ہو جائے ؛
 اس سلسلے میں رباعی کے اوزان یاد رکھنے کا ایک آسان طریقہ اور
 عروض جدید — ان کے دو مضامین خاص توجہ کے لائق ہیں ۔

یہ ہے مختصر سا جائزہ پروفیسر شیرانی کے فضائل و ”کمالات“ کا ،
 جس کو مقدمے کی احتیاط سے میں نے بڑے اجمال سے پیش کیا ہے ۔

پروفیسر شیرانی ایک نابالغ ہستی تھے۔ ان کے جملہ علمی کوشاں جہ جن کا مذکور ہوا ہے ، مختصر زمانے میں ظہور میں آئے ، یعنی اسلامیہ کالج لاہور کی ملازمت کے آغاز سے (۱۹۲۲ء) اور پینٹل کالج کی ملازمت کے اختتام تک (۱۹۳۰ء)۔ اس سے قبل اتفاقات نے انہیں قلم اٹھانے کا زیادہ موقع نہ دیا۔ وہ زیادہ تر انگلستان میں رہے اور مشہور ناشر لیوڑک کے ہاں نوادرو و عتیقات کے مبصر کے طور پر کام کرتے رہے۔ قلمی لحاظ سے یہ سارا زمانہ تیاری میں گزرا لیکن علمی لحاظ سے یہ زمانہ بغایت مفید رہا۔ اسی زمانے میں انہوں نے عتیقات کی نفاہی سیکھی اور وہ نظر حاصل کی جو کسی اعلیٰ فن شناس کو عطا ہوتی ہے۔

پروفیسر شیرانی نے شاعری بھی کی مگر اس کا سلسلہ جاری نہیں رکھا ، جو کچھ لکھا ہے اس سے زور طبیعت اور قدرت کا اندازہ ہوتا ہے ۔

پروفیسر شیرانی نے تھوڑے ہی عرصے میں جو بڑے بڑے کام کر دکھائے ، ان میں ایک اسی لائق توجہ یہ ہے کہ انہوں نے ارزاں تصنیف اور سہل الحصول مؤرخانہ خامہ فرسائی کے راستے بند کر دیے۔ تاریخی تحریروں پر سہات اور کڑی تنقید کر کے لکھنے والوں میں ذمے داری کا احساس پیدا کیا ، مصنفوں کو محنت کا عادی بنایا اور قدیم ادب کو سمجھنے کا ایسا گر بنایا جو لوگوں کو اگر معلوم بھی تھا تو اس پر عمل نہیں ہوا کرتا تھا — اصول یہ بتایا کہ کسی کتاب کے بارے میں سب سے زیادہ راہ نکالی کتاب کے اندر ہے ملتی ہے کیونکہ ہر کتاب خود اپنی شہادت ہے ، کتاب کی تنقید کے اصول کتاب کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ شیرانی نے اس اصول پر عمل کر کے مصنفوں کو ایک راستہ دکھایا —! شیرانی نئی دریافتوں کے شائق تھے ، انہوں نے کئی نئی باتیں دریافت کیں ، بہت سے تاریخی مسائل (جو مسلمات کا درجہ رکھتے تھے) دور کیے ، تاریخ اور تاریخ ادب کا ذوق پیدا کیا ، مسلمانوں کے ورثے کی طرف توجہ دلائی اور فنون اسلامی کے علم و شعور کو بہت ترقی دی ؛ خصوصاً ادب و فن

کے اس حصے کو مد نظر رکھا جس کا تعلق ہندوستان سے تھا —
 یہ کارنامے ہماری ادبی تاریخ کا ولیع حصہ ہیں ۔

مضامین شیعرائ کی اشاعت ایک ضروری فرض تھا اور مقام مسرت
 ہے کہ مجلس ترقی ادب لاہور اس فرض کو ادا کر رہی ہے ۔
 مظہر محمود خان شیرانی بھی مستحق مد تحسین ہیں کہ انہوں نے
 اپنے نامور بزرگ کے مقالات جمع کر کے مراتب کیے اور اعلیٰ عام کو
 موقع دیا کہ ان کا یک جا مطالعہ کر سکیں ۔

سید عبد اللہ

۱۹۴۰-۶۵

الہامی - اردو نگر

ملتان روڈ - لاہور

حالات زندگی خالقا محمود شیرانی

از

مظہر محمود شیرانی (مرتب)

حالات زندگی

(مظہر محمود شیرانی)

سابقہ صوبہ سرحد اور بلوچستان کی سرحد پر واقع پہاڑ تخت سلیمان کے ارد گرد افغانوں کا ایک قبیلہ 'شیرانی' نہایت قدیم زمانے سے آباد ہے^۱۔ یہ علاقہ جو تحصیل شیرانی کے نام سے موسوم ہے، چند سال ہوئے خلعِ ژوب سے علیحدہ کر کے انتظامی لحاظ سے ضلع ڈیرہ اسماعیل خان سے متعلق کر دیا گیا ہے۔ شیرانی صفت نسبتی نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کے جدِ امجد کا نام ہے جس کے سبب پورا قبیلہ اسی نام سے معروف ہو گیا۔ پٹھانوں کی قاریوں کی رو سے 'شیرانی' افغانوں کے جدِ اعلیٰ ملک قیس عبدالرشید کے ایک پربوئے کا نام تھا^۲۔ پہاڑی علاقہ ہونے اور بارش کی کمی کی وجہ سے یہ لوگ خاطرِ خواہ کثافت کاری نہیں کر سکتے۔ چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں مکی بونی جاتی ہے۔ ان کا اہم پیشہ کھ بانی ہے۔ آج کل چلغوزے کی پیداوار کے اعتبار سے یہ علاقہ پیش پیش ہے۔

غزنوی حملوں کے سلسلے میں اس قبیلے کے کچھ افراد غالباً ذرائع معاش کے کافی نہ ہونے کے سبب لشکر میں شامل ہو کر ہندوستان چلے آئے۔ شاید حملہ سوماتپتہ سے واپسی پر یہ لوگ راجپوتانے میں قیام پزیر ہو گئے۔ ان کی روایات کے علاوہ یہ اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ شیرانیوں کے قیام کی جگہ محمود کی سوماتپتہ سے واپسی کے راستے کے نزدیک واقع ہے۔

۱۔ 'حیات افغان' صفحہ ۱۳۸۔

۲۔ 'تاریخ افغانہ' حصہ اول، صفحہ ۱۰۶۔ 'تذکرہ افغانی' صفحہ ۵۔

سابقہ ریاست جودہ بور کے ضلع ناگور میں کھاٹو نام کے دو موضع ہیں جو ایک دوسرے سے دو تین میل کے فاصلے پر ہیں۔ دونوں میں امتیاز کرنے کی خاطر مشرق قصبے کو چھوٹی کھاٹو اور مغربی کو بڑی کھاٹو کہتے ہیں۔ کھاٹو جدید تلفظ ہے جس کی قدیم صورت کھٹو ہے۔ تمام پرانی کتابوں، فرامین اور کتابوں میں یہ نام یہ صورت 'کھٹو' ملتا ہے۔ بڑی کھاٹو کسی زمانے میں نہایت اہم مقام رہا ہے۔ اس میں بہت سی مساجد، مزارات اور دیگر پرانے آثار موجود ہیں۔ ان میں سب سے قدیم ایک مسجد^۱ ہے جو سلطان شمس الدین التمش (موتی ۶۳۳) کے دور سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی عہد کا ایک کتبہ بھی موجود ہے۔ سنگ مرمر کے اس کتبے پر جو عربی میں کندہ ہے، رمضان ۶۶۹ھ تاریخ دی گئی ہے۔ کتبے کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدا میں التمش کے عہد میں کسی تالاب پر نصب کیا گیا تھا۔ یاد رہے کہ اس علاقے میں پانی کی قلت کے سبب برسات کا پانی بڑے بڑے تالابوں میں محفوظ کیا جاتا ہے جو سال بھر استعمال ہوتا ہے۔ آج کل یہ کتبہ حضرت اسحاق مغربی کی درگاہ میں جو آٹھویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں، موجود ہے۔ انہی حضرت اسحاق مغربی (موتی ۶۳۷ھ) کے مرید مشہور بزرگ شیخ احمد کھٹو تھے جن کا مزار مرکھبیج (گجرات) میں واقع ہے۔ یہ اپنے پرخانے کی نسبت سے کھٹو کہلاتے ہیں۔ جہانگیر اپنی توڑک میں گجرات کے سفر کے سلسلے میں لکھتا ہے :

”جون مزار شیخ احمد کھٹو بر سر راہ واقع بود نخست پدا نغا رقتہ
فائقہ خواندہ شد۔ کھٹو نام قصبہ اہست از سرک ناگور و مولد
شیخ از آہست۔“

لیکن شیخ کی پیدائش کے معاملے میں جہانگیر کو سمجھ ہوا ہے۔ آپ کی پیدائش کھٹو نہیں بلکہ دہلی کی ہے جیسا کہ ابوالفضل نے آئین میں تحریر کیا ہے :

۱۔ حافظ صاحب نے بچپن میں قرآن حفظ کرنے کے بعد ایک بار اس مسجد میں حراہ سنائی تھی۔

”لقب جمال الدین - در دہلی سال ہفت صد و سی و ہفت ہزار - از
بزرگ زادہای آنجاست - مرید و خلیفہ بابا اسحاق مغربی - نام او
نصیر الدین“

علاوہ ازیں :

”شیخ احمد کھٹو در سال ہفت صد و سی و ہفت در دہلی متولد شد“
(ہمراہ التواریخ)

اس سلسلے میں ایک لطیفہ من لہجے - ایک بار مولوی عبدالحق
مرحوم ہمارے ہاں آئے ہوئے تھے - حافظ صاحب سے بے تکلفی تھی -
ان دنوں والد مرحوم کی ایک نظم ”او دہس سے آنے والے بنا“ بڑی
مشہور تھی جس میں ٹونک کے بعض مقامات مثلاً ”ان پورنا کا بندر“
”رسیا کی ٹیکری“ وغیرہ کے نام موجود تھے - مولوی صاحب نے طنزیہ
انداز میں کہا کہ ”اغتر نے اس نظم میں ٹونک کو اپنا وطن کیوں
بنا یا ، آپ لوگوں کا وطن تو کھٹو ہے کھٹو -“ حافظ صاحب نے مسکرا
کر کہا : ”جی ہاں ، شیخ احمد کھٹو -“ شیخ علیہ الرحمۃ کا نام
آنے ہی مولوی صاحب تعظیماً کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور
شرمندہ ہوئے -

شیرانی سب سے پہلے اس قصبہ کھٹو میں سکونت گزین ہوئے -
ان کے متعلق سب سے قدیم تلمیح کتاب مرقاة الوصول الی اللہ والرسول^۱
میں ملتی ہے جو شیخ احمد کھٹو کے حالات میں نویں صدی ہجری کے
وسط کی ایک تالیف ہے^۲ - بعد میں بعض افراد چھوٹی کھٹو نقل مکانی کر
آئے - لیکن انیسویں صدی کے وسط میں یہاں سے دو تین میل کے فاصلے
پر اپنی نوآبادی ڈھانی^۳ شیرانیاں کے نام سے بنائی - یہ نوآبادی آج تک
۱- یہ کتاب حضرت شیخ احمد کے کسی معتقد محمد قاسم نامی نے
مرتب کی ہے - اس کا قلمی نسخہ احمد آباد میں حسینی زیر کے
کتب خانے میں موجود ہے -

۲- تنقید پرتھی راج راجا از حافظ محمود شیرانی ، صفحہ ۱۷۸ -

۳- ڈھانی ، راجستھانی زبان کا اسم جمع ہے اور پنجابی میں بھی
مستعمل ہے -

موجود ہے اور قی زمانہ چار مواضع پر مشتمل ہے ۔

یہ علاقہ ریکستانی ہے ، جا بجا خشک پہاڑیاں ہیں ، برسات میں اگر بارش مناسب موقع پر ہو جائے تو باجرے اور موٹو کی فصل ہو جاتی ہے ورنہ قحط سالی سے دو چار ہونا پڑتا ہے ۔ سواری اور باربرداری کے لیے اونٹ کام آتا ہے ، اسی سے ہل چلایا جاتا ہے ۔ قحط کی صورت میں لوگ مالوے کے سرسبز علاقوں کا رخ کرتے ہیں اور اگلے سال برسات کے موسم میں واپس آتے ہیں ۔ ان خشک پہاڑیوں میں جا بجا پتھر کی کانیں ہیں ۔ چنانچہ کھائو کا سرخ اور زرد پتھر بڑا اعلیٰ ہوتا ہے اور دور دور جاتا ہے ۔ عمدہ پتھر کے لحاظ سے مارواڑ کا علاقہ بڑا خوش قسمت ہے ۔ منگراڑ کی مشہور سنگ مرمر کی کانیں بھی اسی علاقے میں ہیں ۔ پتھر کی پخت کی وجہ سے مکانات اسی سے تعمیر کیے جاتے ہیں ۔ چھتوں کے لیے بھی پتھر کی لمبی لمبی پٹیاں استعمال کی جاتی ہیں ۔ یہ مکانات نہایت مضبوط ہوتے ہیں ۔ گھراؤں اور چالیوں وغیرہ میں پتھر کی تراش دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے ۔

مارواڑ کے مختلف علاقوں میں ان گنت آثار قدیمہ موجود ہیں ۔ یہاں کئی بعض قصبے مثلاً ناگور ، ڈھڈوانہ ، لاندوں ، کھائو ، ہالی ، جالور ، سوانا ، میرٹا وغیرہ تاریخی یادگاروں کے اعتبار سے نہایت اہم ہیں ۔ ڈاکٹر عبدالقہ چغتائی حافظ صاحب مرحوم کے ہمدرد اس علاقے میں گھومے اور بعد میں یہاں کے اسلامی کتبائے متعلق تحقیقات بھی کی جس کے نتائج ایک مقالے کی صورت میں پیش کیے گئے ۔ تاہم ابھی اس علاقے پر اسلامی تاریخی نقطہ نظر سے بہت کام کرنے کی گنجائش ہے جس میں تقسیم ملک کے باعث دشواریاں حائل ہو گئی ہیں ۔

پیشہ سپہ گری کی مناسبت سے شہرانی تمام علاقے میں سپاہی کے نام سے مشہور ہو گئے اور عموماً مارواڑ کے غیر مسلم انہیں اسی نام سے یاد کرتے ہیں ۔ ذرائع معاش کی کم پائی نے یہاں بھی انہیں لوجی خدمت کی طرف متوجہ کیا ۔ چنانچہ ریاست جودھ پور مارواڑ کی فوج

میں داخل ہونے لگے اور مرے مارے میں قام پیدا کیا۔ میں وجہ نہیں کہ جب عہد شاہ جہانی میں جوہہ پور کے شاہی خاندان کے ایک فرد رتن سنگھ رائیوڑ کو مالوے کا علاقہ تفویض ہوا تو وہ اس پر قبضہ جانے کی غرض سے یہاں سے ایک دستہ شیرانیوں کا ہموار لے گیا۔ مالوے پر قابض ہونے کے بعد اس نے یہ طور دارالریاست و قلام کی بنیاد رکھی اور اس میں ایک محلہ شیرانی پورہ کے نام سے آباد کیا جو اب بھی موجود ہے۔

تیسری صدی ہجری کی دوسری اور تیسری دہائی میں تمام راجپوتانہ اور وسط ہند نواب امیر خان کی کچھار بنا ہوا تھا۔ انگریز دشمنی کا نشہ ان کے رگ و پے میں سراپت کر چکا تھا۔ جسوت رائے گلگر سے مل کر فرنگیوں کو ہر ممکن زک پہنچانے کی کوشش کی۔ ایک جیل تھی کہ کبھی شال ہند پر کوندی اور کبھی دکن پر جا چمکتی۔ جوہ پور پر خان کی نوکرتازیوں کے دوران میں چند شیرانی بھی ان کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ غالباً ۱۸۱۰ء میں حضرت سید احمد برہیلوی کا ورود مسعود امیر خانی لشکر میں ہوا۔ خان عالی مقام سید صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے اور پورے لشکر میں آپ کی بزرگی اور تقدس کا چرچا تھا۔ اکثر پٹھان آپ کے معتقد ہو گئے۔ یہ سلسلہ سات سال تک جاری رہا۔ ۱۸۱۷ء کے اواخر میں امیر خاں اور انگریزوں کے درمیان صلح کے معاہدے پر دستخط ہو گئے اور امیر خاں، نواب امیر الدولہ امیر خاں والی ریاست ٹونک بن گئے۔ اس کے چند ماہ بعد سید صاحب واپس دہلی تشریف لے گئے اور وہاں اعلیٰ کلمۃ الحق کا سلسلہ شروع کیا۔ معاہدے کی رو سے امیر خاں نے اپنی فوج کا بڑا حصہ برخاست کر دیا۔ ان برخاست شدہ فوجیوں سے چند آدمی جو سید صاحب سے بہت متاثر تھے، ان کے پاس دہلی پہنچے اور پھر انہیں کے ہو رہے۔ ان میں ایک سپاہی چاند خان نامی شیرانی بھی تھے۔ ۱۸۲۲ء

۱۔ صحیفۂ زوہر، صفحہ ۹۱۔ ۲۔ سید احمد شہید، صفحہ ۸۴۔

۳۔ افتخار التواریخ، صفحہ ۳۵۸۔ ۴۔ سید احمد شہید، صفحہ ۲۴۰۔

میں جب سید صاحب نے ایک بڑی تعداد کے ساتھ فریضہ حج ادا کیا ، یہ بھی ہمراہ تھے ۔ اسی وجہ سے انہیں ہاڑے خاندان میں حاجی جی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔

حاجی صاحب جہاد کے واسطے سید صاحب کے ہمراہ سرحد شریف لے گئے اور ۱۸۳۱ء میں امیر کی شہادت کے بعد واپس لوٹے ۔ ان کے جسم پر زخموں کے بہت سے نشانات تھے ۔ مولانا غلام رسول مہر نے شہدائے بالا کوٹ کی قبرست میں ایک نام چاند خان ناگوری دیا ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ نام کسی غلط فہمی کی بنا پر روایات میں شامل ہو گیا ہو ، یا ممکن ہے کہ ناگور کے علاقے کے دو چاند خان جہاد میں شامل ہوئے ہوں ۔

نواب امیر خان کے صاحب زادے نواب وزیر الدولہ جو ۱۸۳۳ء میں مسند نشین ہوئے ، سید صاحب کے سرید باحق تھے ۔ انہوں نے بہت سے مجاہدین کو اپنے پاس ٹونک بلا لیا اور ۱۸۳۹ء میں سید صاحب کے اہل و عیال کو بھی خیر پور سے ٹونک لانے میں کام یاب ہو گئے ۲ ۔ یہ سادات اور مجاہدین چون کہ سید صاحب کے اہل قافلہ تھے ، اس لیے ٹونک میں وہ محلہ جس میں یہ اقامت پذیر ہوئے 'قافلہ' کہلاتے تھے ۔

حاجی صاحب کچھ عرصے رتلام (شیرانی پورہ) رہے ۔ وہاں ایک بیوہ سے نکاح ۳ کیا اور کھانلو چلے آئے ۔ کھانلو میں کئی برس مقیم رہے اور کھیتی باڑی کرتے رہے ۔ کبھی کبھی سید صاحب کی آل کی زیارت اور ساتھی مجاہدین سے ملاقات کے لیے ٹونک آتے ۔ کھانلو سے ٹونک براہ راست کوئی دوا سو میل کا سفر تھا ۔ حاجی صاحب کے تین بچے ہوئے : اسماعیل خان ،

۱۔ جماعت مجاہدین ، صفحہ ۱۸۹ ۔

۲۔ سید احمد شہید ، حصہ دوم ، صفحہ ۵۶ ۔

۳۔ اس زمانے میں نکاح بیوگان کا رواج بالکل نہ تھا اور ہندوؤں کے زیر اثر مسلمان بھی ایسے انتہائی معیوب سمجھتے تھے ۔ حضرت سید احمد شہید نے مسلمانوں میں جن بری رسموں کو روکنے کی کوشش کی ان میں امتناع نکاح بیوگان بھی شامل ہے ۔

اسحاق خان اور یعقوب خان - جب جیسے ذرا سیانے ہوئے تو ان کو لے کر ٹونک چلے آئے تاکہ تھوڑا بہت پڑنا لکھنا سیکھ جائیں - سب سے بڑے بھائی اسماعیل خان اس دور کی مروجہ تعلیم حاصل کر کے سرکار ٹونک میں ملازم ہوئے اور ترقی کر کے خوب معزز ہو گئے - کچھ کاروبار کا سلسلہ بھی شروع کر لیا - ٹونک کے محلہ مہندی باغ میں مکانات تعمیر کرائے - ڈھان میں بھی کبھی کبھی جا کر ٹھہرتے تھے لیکن سرخ کا ایک مکان بنوایا -

نواب وزیر الدولہ کا انتقال ۱۷۱۸ء میں ہوا - ان کے بعد ان کے صاحب زادے نواب محمد علی خان گدی پر بیٹھے لیکن بعض زیادتیوں کی بنا پر صرف تین سال بعد ریاست سے علیحدہ کر کے پٹنن بر بنارس بھیج دیے گئے - ان کے فرزند نواب ابراہیم علی خان ان کے جانشین ہوئے - ان کے نابالغ ہونے کی وجہ سے تین سال کے لیے ریاست کے انتظام کی خاطر ایک گونسل آف رجمنٹی قائم کر دی گئی جس کے صدر نواب زادہ عید اللہ خان خلیفہ نواب امیر خان تھے - اس گونسل کے دور کا ایک فرمان جو محرم الحرام ۱۲۸۶ھ کا نوشتہ ہے اور جس پر ”حافظ محمد عباد اللہ خان بن نواب امیر الدولہ محمد امیر خان شمشیر جنگ“ کی مہر ہے ، میرے پاس محفوظ ہے - اس کی رو سے اسماعیل خان صاحب کو چھاس ہیکھ زمین عطا کی گئی ہے - اس کا مضمون یہ ہے :

”دوبنولا بہ حکمہ تعالیٰ و تقدس موازی پنچاہ ہیکھ اراضی بازاری پیریم کشادہ از سواد موضع ہیکم پورہ نو آباد سرحد کشالہ ہرگنہ ٹونک بہ وجہ غیر خواہی و امناعت و غیر سگال سرکار و حق آبادان کاری موضع مسطور بہ نام محمد اسماعیل خان نسل بعد نسل و بطناً بعد بطن دواماً و مستداماً معاف و مرفوع القلم فرمودہ شد - سبیل کار پردازان سرکاری آن کہ اراضی مذکور را در قبض و تصرف خان مذکور وا گذاشتہ تعرضی و مزاحمتی نرسانند و ہر سال خواہان سند مجدد نشوند و سبیل خان مسطور آن کہ ہر اراضی

مذکور قابض و دخیل ہونہ حاصل آن را بہ صرف مایحتاج خود آوردہ ہوا۔ ہمدعاۃ از دیہاد عمر و دولت سرکار مصروف و مشغول باشند۔“

پد اسحاق خان صاحب کی دو بیویوں سے سات لڑکے ہوئے۔ پہلی بیوی سے دو، ابراہیم خان اور اسرائیل خان اور دوسری بیوی سے پانچ یعنی محمود خان، مسعود خان، سعید خان، مقصود خان اور مسعود خان۔ حافظ صاحب (حافظ محمود شیرانی) دوسرے پانچ بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ان کا نام اپنے والد اور دونوں بڑے بھائیوں کے ناموں کی مناسبت سے پد میکائیل بھی رکھا گیا۔ والد نے تاریخی نام نکالے جن میں ایک نظام الدین اسحاق تھا۔ ان کی پیدائش کی تاریخ کا استخراج ان کے والد نے یوں کیا ہے :

بہ تاریخ ۲۹ شوال ۱۲۹۷ھ مطابق کنوار یکم ۱۹۳۷ ہجری بم سنہ ۵۔ اکتوبر ۱۸۸۰ء بعد غروب آفتاب بر خوردار پد محمود عرف پد میکائیل تولد شد۔

اسم تاریخی : نظام الدین اسحاق۔ منظور میان۔ حمید الدین خان (معنوی)

۱۔ میرا خیال ہے کہ ۱۸۹۸ء میں اورینٹل کالج میں داخلے کے وقت ان کی تاریخ پیدائش ۵ اکتوبر ۱۸۸۰ء کی بجائے ۱۵ اکتوبر ۱۸۸۲ء لکھ دی گئی۔ یاد رہے کہ ان کی پیدائش کا دن ۵ شنبہ دیا گیا ہے۔ اب ۵ اکتوبر ۱۸۸۰ء کو تقویم کی رو سے ۵ شنبہ بنتا ہے لیکن ۱۵ اکتوبر ۱۸۸۲ء کو جمعے کا دن تھا۔ اس لیے صحیح تاریخ ۵ اکتوبر ہے نہ کہ ہندو۔ سال کی بابت یہ ہے کہ ان کے تاریخی ناموں سے ۱۲۹۷ء برآمد ہوتا ہے جو ۱۸۸۰ء کے مطابق ہے، ۱۸۸۲ء کے نہیں۔ علاوہ ازیں ان کے چھوٹے بھائی مسعود خان کی پیدائش کا سن ۱۸۸۲ء دیا گیا ہے، اس لیے حافظ صاحب کی پیدائش کا سن ۱۸۸۲ء (جو ان کی ملازمت و طالب علمی کے کاغذات میں درج ہے) غلط ہے۔ غالباً داخلہ فارم پر (باقی حاشیہ صفحہ ۲۵ پر)

اس زمانے میں نواب وزیر الدولہ اور نواب ابراہیم علی خان کی کوششوں سے ٹونک اسلامی علوم کا مرکز بن گیا تھا۔ اس ماحول میں حافظ صاحب نے آنکھ کھولی۔ ٹونک میں رواج تھا کہ ابتدائی قاعدہ پڑھانے کے بعد بچوں کو قرآن حفظ کرائے تھے۔ اس عمر میں ذہن تازہ ہوتا ہے اس لیے بچہ بڑی آسانی سے یہ سعادت حاصل کر لیتا ہے۔ اس رواج کی وجہ سے ٹونک کے چھوٹے سے شہر میں حفاظ کی تعداد اتنی ہوتی تھی کہ بڑے بڑے شہروں میں دست یاب ہوتی ممکن نہ تھی۔ خود نوابوں اور صاحب زادوں میں اکثر حفاظ تھے۔ حافظ صاحب نے بھی اوائل عمر ہی میں اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اس کے بعد مروجہ علوم کی تعلیم شروع ہوئی جن میں فارسی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس میں کئی سال صرف ہوئے۔

۱۶ مارچ ۱۸۹۷ء کو ڈھاتی شیرانیوں میں عالم خان ولد مہراب خان شیرانی کی دختر سے آپ کا نکاح ہوا۔ اسی سال انگریزی پڑھنا شروع کی۔ اس غرض سے انہیں چودہ بور بھیجا گیا۔ ان دنوں ریل گاڑی چلے بور سے ملا کرتی تھی، اس لیے ٹونک سے چلے بور تک ساتھ میل کا سفر یہاں یا اونٹ گاڑیوں میں طے کرنا پڑتا تھا۔ یہ اونٹ گاڑیاں ان جیسے دار پتھروں کی طرح ہوتی تھیں جن میں سرکس والے اپنے شہر اور چھتے بند کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔ اس میں دو منزلیں ہوتی تھیں۔ پھلی منزل میں آٹھ سے بارہ تک آدمی سہا سکتے تھے، اوپر کی منزل میں بھی جس پر سرکس کی چھت ہوتی تھی، چھ سات آدمی ٹھونس دیے جاتے تھے۔ داخلے کا دروازہ پھلی طرف ہوتا تھا جو سوار ہونے کے بعد بند کر دیا جاتا تھا۔

(ہفتہ حاشیہ صفحہ ۲۴)

اپنی تاریخ پیدائش انہوں نے اپنی یادداشت کی بنا پر لکھوائی جس میں ان کو سہو ہوا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عمر میں دو سال کی کمی جان بوجھ کر کی گئی ہو لیکن تاریخ میں تبدیلی محض حافظے کی غلطی ہی قرار پائے گی۔ انتقال کے وقت ان کی عمر عام خیال کے مطابق تریستہ سال تھی حالانکہ اس حساب سے پینستھ برس ہونا چاہیے۔

اس سفر کا ایک دل چسپ واقعہ حافظ صاحب میں سنایا کرتے تھے ! چاندنی رات تھی ، حضرت اونٹ اپنی روایتی سنجیدگی کے ساتھ لکھے چال چل رہے تھے ۔ سب مسافر مع گاڑی ہاں اپنی اپنی جگہ سٹکڑے سٹکڑے اونگھ رہے تھے ۔ خود ان کا لڑکپن تھا ، نیند نہیں آرہی تھی ۔ کبھی سلاخوں میں سے باہر چاندنی میں نظر دوڑانے لگتے اور کبھی گاڑی میں بیٹھی حالت میں سوئے ہوئے لوگوں کی حیثیت کڈائی پر مسکراتے ۔ جب گاڑی کے پیچے کسی پتھر یا گڑھے پر سے گزرتے تو دھچکے کے ساتھ نیند سے جھولتے ہوئے آدمیوں کے سر ایک دوسرے سے ٹکراتے ۔ چند لمحوں کے لیے وہ ہوشیار ہو بیٹھتے لیکن پھر نیند میں کھو جاتے ۔ اچانک حافظ صاحب کی نظر سامنے جو بڑی نو گاڑی سے کوئی بیس بیس فٹ کے فاصلے پر لکڑی کی ایک بلی سڑک کے آو پار بڑی نظر آئی ۔ یہ دل ہی دل میں اس بات پر غفلت ہوئے کہ جب کوئی دم میں گاڑی اس پر سے گزرے گی تو لوگوں کی زور زور سے ٹکریں ہوں گی اور خوب لعاب آئے گا ۔ تھوڑی دیر تک انتظار کیا لیکن بلی بے کہہ گاڑی کے پیچے کے نیچے آنے کا نام نہیں لیتی ۔ اس کی تلاش میں نظر دوڑائی ۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ لکڑی کی بلی سڑک کے بائیں طرف والے چیل میدان میں بھاگی جا رہی ہے ۔ انہوں نے زور سے کہا ”سانپ !“ اور کھٹ سے پھولا دروازہ کھول ، باہر چھلانگ لگا ، سانپ کے پیچھے دوڑے ۔ اب ادھر کی سننے ۔ سانپ کے نعرے نے اونکھتے ہوئے لوگوں پر جادو کا اثر کیا ۔ وہ سمجھے کہ سانپ گاڑی کے اندر موجود ہے اسی لیے تو یہ لڑکا فوراً باہر کود گیا ۔ چنانچہ اُن کی آن میں گاڑی خالی ہو گئی ۔ باہر آکر جب حواس بجا ہونے اور معاملہ سمجھ میں آیا تو لکھے پڑ پڑائے ۔ ایک ملازم ان کو چھوڑنے جا رہا تھا ، اسے مجبوراً پیچھے بھاگنا پڑا ۔ اُزدھا ادھر ادھر بلوں میں کھسنے کے لیے منہ مارنا لیکن دل تھے چوہوں کے اور وہ اچکر ۔ آخر ایک بڑا بل مل گیا ، اس میں داخل ہو گیا ۔ اتنے میں یہ بھی اُن پہنچے ۔ کوئی بالشت پھر دم باہر رہ گئی تھی کہ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے مضبوط تھام کر گھٹنوں کی نیک لکال ۔ اب مارنے کا سوال پیدا ہوا ۔ ملازم پہنچ گیا تھا ، اس سے

ہوجھا ”تیرے پاس کوئی چیز ہے؟“ اس نے کہا ”میاں ایک چاقو ہے۔“
 کہا ”ہلا ہے وہی نکال۔“ غرض ہوا یہ کہ چلتا حصہ باہر نکلا وہ ملازم کی
 مدد سے دو حصوں میں چیر ڈالا۔ پھر چھٹکا دے کر تھوڑا سا اور نکالا
 اچھے چیرا۔ اس طرح اس کا کلم تمام کیا۔ تمام کپڑے اس کے خون سے
 تر ہو گئے لیکن اس عمر میں ایسی باتوں کی پروا کہاں ہوتی ہے۔

غالباً ۱۸۹۸ء میں جودہ پور سے مدلل کے امتحان میں کامیاب
 ہو کر واپس آئے۔ اس زمانے میں شمس العلماء مفتی عبد عیادہ ٹوٹکی
 اورینٹل کالج لاہور میں پڑھایا کرتے تھے۔ وہ علوم اسلامیہ کے ساتھ ساتھ
 فلسفہ اور منطق کے بھی جید عالم تھے۔ جن دنوں حافظ صاحب جودہ پور
 سے آئے، اتفاق سے مفتی صاحب بھی ٹوٹک میں تھے۔ چنانچہ ان کے
 والد نے ان کو مفتی صاحب کے حوالے کر دیا تاکہ انہیں لاہور لے جا
 کر داخل کرا دیں۔ یہاں اورینٹل کالج سے انہوں نے منشی و منشی
 عالم اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ وہ عالم ۱۸۹۹ء کے امتحان
 میں اول اور فاضل ۱۹۰۱ء کے امتحان میں یونیورسٹی میں دوم آئے۔

شعر و سخن سے دل چسپی تو ٹوٹک کی تعلیم ہی کے دوران میں شروع ہو
 چکی تھی۔ چنانچہ اس عرصے میں آپ نے کچھ نظمیں و غزلیں کہیں
 جن میں ان کی مہرکہ آرا نظم ’لیو سلطان‘ بھی شامل ہے۔ فکر سخن
 کا لپکا آہندہ کئی برس تک جاری رہا اور اس وقت چھوٹا چب وہ
 میدان تحقیق کے شہسوار قرار پائے۔

اورینٹل کالج کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ پھر انگریزی کی
 طرف متوجہ ہوئے اور الترنر کا امتحان پاس کیا۔ اب ان کے والد
 نے مزید تعلیم کے لیے انہیں ولایت بھیجنے کا ارادہ کیا۔ ان کا خیال
 اپنے لڑکے کو بیرمنگھم لے جانے کا تھا۔ اس کے لیے حافظ صاحب کی انگریزی
 تعلیم کافی نہ تھی۔ تاہم فیصلہ یہ ہوا کہ اپنی انگریزی کی کمی بھی
 وہ ولایت جا کر ہی پوری کریں۔ چنانچہ وہ ستمبر ۱۹۰۳ء میں بمبئی
 کے راستے ہازم پاکستان ہوئے اور ۳ اکتوبر کو لندن پہنچے۔

انگلستان میں حافظ صاحب کے قیام کے حالات کا بہترین مآخذ وہ

خطوط ہیں جو انہوں نے وہاں سے اپنے والد ، بھائیوں اور دوسرے احباب کو لکھے تھے ۔ افسوس کہ ان میں سے بہت سے خط ضائع ہو گئے ، جو باقی ہیں ان میں سے بعض کے حصے غائب ہیں ۔ بہر حال یہ خطوط مکمل و نامکمل کوئی پراس کے قریب موجود ہیں ۔ یہ خطوط کچھ تو ان کے خاندانی حالات پر روشنی ڈالتے ہیں ، بعض سے ان کے ارادوں کا اظہار ہوتا ہے اور کئی اس دور کے لندن کی سماجی اور ثقافتی دل چسپیوں کے بیانات سے مملو ہیں ۔

حافظ صاحب کو ولایت پہنچنے سے ان کے والد کا بیٹا اگرچہ قانون کی تعلیم کا حصول تھا لیکن وہ خود قانون کی بجائے زراعت کی تعلیم اپنے لیے زیادہ مناسب سمجھتے تھے اور اس کا اظہار وہ دہی زبان سے والد کے سامنے کر بھی گئے تھے ۔ چنانچہ وہاں پہنچ کر اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا اور ایسے لوگوں سے جو اس معاملے میں کچھ جانتے تھے ، مشورے لیے ۔ اس کے متعلق والد کے نام ایک خط میں جو ۲۱ - اکتوبر ۱۹۰۳ء کو مرقوم ہوا ہے اور ولایت سے ان کا تیسرا خط ہے ، لکھتے ہیں :

”میں اس وقت تک مطمئن ہوں کہ کیا کروں ۔ اس وقت میرے سامنے دو صنفے ہیں ! ایک قانونی ، دوسرا زراعتی ۔ میں نے اپنے خیالات وہاں بھی جناب پر ظاہر کیے تھے کہ انگریز کاجر یعنی زراعتی صنفہ اچھا ہے ۔ یہاں آ کر جو اس کسے لیے میں نے خط و کتابت کی تو اس کی وقت میرے دل میں اور بھی بڑھ گئی ۔ اب تک اس میں صرف چھ مسلمان اور پچاس ہندو داخل ہوئے ہیں ۔ . . . میں زراعت کی بابت اور زیادہ دریافت کر رہا ہوں ۔ ہورے اطینان پر ہی مجھ کو اس میں داخلے کے لیے آپ کی اجازت درکار ہوگی ۔ یہ مجھے خوب معلوم ہے کہ جناب قانون کے صنفے کو پسند کرتے ہیں ، سو اس کی خلاف ورزی میں کچھ نہیں کروں گا ۔“

الطرح کچھ تو اس خیال سے کہ زراعت کے لیے زیادہ مشکل اور

فی قسم کی انگریزی کی ضرورت تھی لیکن زیادہ تر اپنے والد کی مرضی کے پیش نظر وہ قانون کی تعلیم کے لیے 'لنکنؤن' میں داخل ہو گئے۔ ساتھ ہی ساتھ انگریزی زبان میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش شروع کی اور انگریزی ادب کا یہ غور مطالعہ کرنے لگے۔

ابھی انہیں انگلستان پہنچے پورے تین ماہ بھی نہ ہوئے تھے کہ وہ سخت بیمار پڑ گئے۔ یہ بیماری انہیں دسمبر ۱۹۰۳ء کے آخری عشرے میں لاحق ہوئی، جب وہاں کی سردی پورے جون بر آئی۔ بیماری اتنی زبردست تھی کہ وہ زندگی سے ماہوس ہو گئے۔ اسی ناامیدی کی حالت میں ۵ جنوری ۱۹۰۴ء کے ایک خط میں اپنے والد کو لکھتے ہیں :

”مجھے اپنی زندگی کی کچھ امید نہیں رہی ہے۔ میرا تمام سر سوج رہا ہے، چہرے پر دم ہے؛ یہ بیماری میں نے کبھی ہندوستان میں نہیں دیکھی اور نہ سنی۔ ناک اور منہ سے خون جاری ہے اور دونوں سے رات دن ہپ بہہ رہی ہے۔ درد کی یہ شدت ہے کہ اللہم حفظنا۔ جب ڈاکٹر دو تین روز میں سونے کی دوا دے دیتا ہے تو چھ سات گھنٹے کے لیے سو رہتا ہوں ورنہ وہی بے قراری اور وہی ٹڑپنا۔ ڈاکٹر نے دو ٹریس بھیج دی ہیں، وہ الٹاتی بٹھاتی سلاتی ہیں۔ میں دل میں کیا کیا امیدیں لے کر یہاں آیا تھا لیکن کیا خبر تھی کہ یہاں میرا موت سے سامنا ہوگا۔“

آخر ان کا آپریشن ہوا اور ڈاکٹر نے دونوں کانوں کے بیچھے شکاف دے کر تمام فائدہ مادہ نکالا، لیکن اس بیماری نے کوئی ساڑھے تین ماہ تک انہیں بستر پر رکھا اور اس سے ان کے تعلیمی مشاغل میں تعطل پیدا ہو گیا۔ بیماری کے دوران میں شیخ عبدالقادر (مر)، سوج ٹرائن (پرسنر)، لالہ جگ ناتھ (امرتسری) اور دوسرے ہندوستانی احباب جو ان دنوں وہاں یہ طور طالب علم مقیم تھے، ان کی خبر گیری کرتے رہے۔ بلکہ اسی ٹریس سے شیخ عبدالقادر کی حافظ صاحب کے والد سے خط و کتابت کی ابتدا ہوئی۔ دو ایک بار پروفیسر آرنلڈ بھی عیادت کو آئے۔

بیماری سے ان کی بینائی اور سامعہ پر برا اثر پڑا، تاہم انہوں نے

ہمت سے کام لیا اور اپریل کی ٹرم میں شامل ہو گئے۔ مئی سے چار ماہ کی چھٹیاں ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ اس عرصے میں وطن چلے جاؤ، لیکن انہیں یہ پسند نہ تھا کہ بغیر کام یاں حاصل کیے گھر کا رخ کریں۔ دوسرے یہ ارادہ تھا کہ اس چار ماہ کے عرصے میں جب موسم بھی خوش کوار ہوگا، اپنی تعلیمی کمی پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ انہیں اب بھی زیادہ فکر انگریزی زبان کی تھی۔ ان دنوں کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

”میں ہندوستان آنا مگر میری موجودہ مشکلات مجھ کو روکتی ہیں۔ اگر میں یہاں رہا تو میرے حق میں نہایت مفید ثابت ہوگا۔ اسی خیال سے میں موجودہ مکان کو تبدیل کرنے والا ہوں کیوں کہ یہاں مجھ کو لوگوں سے میل جول کا موقع کم ملتا ہے۔“

اس غرض سے انہوں نے مکان تبدیل کر لیا اور اسی جگہ رہنے لگے جہاں زیادہ تر انگریز رہتے تھے۔ کھانا پابندی کے ساتھ یک جا کھایا جاتا تھا اور ملاقات کا کمرہ بھی ایک ہی تھا۔ اس کے علاوہ جہاں تک ہو سکتا، وہ کسی محفل یا جلسے میں پہنچنے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے بلکہ میلوں ٹھیلوں میں بھی شرکت کرتے سے نہ جو کئے۔ اسی بعض محفلوں اور میلوں کا دل چسپ حال ان کے خطوط میں موجود ہے۔

مارچ ۱۹۰۵ء میں انہوں نے رائل ایشیائی سوسائٹی کا رکن بننے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

”اسٹریٹنگ نے مجھ کو گزشتہ اتوار کو تین بجے بلایا۔ میری خیر و عافیت بوجھی۔ کہنے لگے سوارے والد کا خط آیا تھا۔ پھر میں نے رائل ایشیائی سوسائٹی کے واسطے کہا۔ انہوں نے اقرار کیا کہ وہ بڑی خوشی سے میرے لیے سفارش کریں گے کیوں کہ اس میں شمولیت ہے کہ دو ممبر داخل ہونے والے کی سفارش کریں۔ آئندہ اتوار کو ان کے پاس پھر جاؤں گا۔ وعدہ ہو گیا ہے۔“ (مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۵ء)

ایک خط میں جو انہی دنوں لکھا گیا ہے ، یہ طور والنیر فوجی ٹریننگ لینے کا خیال ظاہر کیا ہے :

”یہاں والنیر فوج کا ایک صیفہ ہے جس میں ہر ایک انگریز شامل ہو سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ وہ غیر ملک کے رہنے والوں میں انگریزی رعایا کو بعض خاص شرائط کے ساتھ شامل کر لیتے ہیں ۔ میں نے اس فوج کے کمرال سے ملاقات کی ہے ۔ بعد میں اس نے مجھ کو اس میں شریک ہونے کے قواعد بھیجے ۔ چندہ داخلہ تین ہونٹ ہے اور دس شلنگ جو سالانہ ادا کرنا پڑے گا ۔ قد اور سینہ کی شرط میں پوری کر سکتا ہوں لیکن ایک شرط یہ ہے جو ذرا سخت ہے کہ چار سال تک اس میں مشق کی جاوے ۔ اس شرط کو میں پورا نہیں کر سکتا کیوں کہ میں شائد تین ساڑھے تین سال سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا ۔“

یہ فوجی تربیت حاصل کرنے سے ان کے دو مقصد تھے : ایک تو یہ کہ وہی پر ہندوستان میں انگریز حکام انہیں قدر کی نظروں سے دیکھیں گے ، دوسرے یہ کہ اپنا شکار کا شوق پورا کرنے کے لیے وہ بغیر لائسنس بتدوق رکھ سکیں گے ۔

حافظ صاحب نے ہندوستان میں کبھی انگریزی لباس استعمال نہیں کیا تھا ، ولایت جا کر پہتا شروع کیا ۔ زیادہ تر قراک کوٹ ہسند کرتے ۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی ہندوستانی وضع قائم رکھنے کے لیے کبھی کبھی راجستھانی انداز کا ساتھ باندھا کرتے ۔ ۱۹۰۵ء کی ایک تصویر جو غالباً علیگڑھ کالج ایسوسی ایشن کے سالانہ ڈنر سے تعلق رکھتی ہے ، انہوں نے اپنے والد کو بھیجی تھی ۔ اس میں ہندوستانی صحاب میں میجر سید حسن بلگرامی ، جسٹس سید امیر علی ، سر کاؤس جی جہانگیر بار ایٹ لا ، شمس العالی سید علی بلگرامی ، شیخ عبدالقادر اور خود حافظ صاحب موجود ہیں ۔ زیادہ تر انگریز ہیں جن میں نہیوڈور مورینن سابق پرنسپل علیگڑھ کالج اور ڈبلیو ۔ اے ۔ جی آرج بولڈ شامل ہیں ۔ اس تصویر میں بھی حافظ صاحب اپنی راجستھانی پکڑی

اور سید علی بلکراسی اپنی ترکی ٹوی کی وجہ سے نمایاں ہیں۔ بعد کے زمانے میں حافظ صاحب بھی سوٹ کے ساتھ ترکی ٹوی استعمال کرنے لگے تھے اور ان کی بھی وضع آخر دم تک قائم رہی۔

۳۔ مئی ۱۹۰۵ء کو ٹونک میں حافظ صاحب کے فرزند داؤد خان (اختر شیرانی) پیدا ہوئے۔ یہ اطلاع انہیں لندن ہی میں ملی تھی۔

جولائی کے آخر میں وہ تفرج کے لیے ایک انگریز کی معیت میں ساحل سمندر پر واقع مقام ہرن بے چلے گئے اور کچھ دن وہاں پر کشتی رانی اور سیر سے جی بہلاتے رہے۔ وہاں کے دیہاتی ماحول سے وہ بہت متاثر ہوئے :

”پھر کو ہم لوگ باہر کٹھری میں پھرے گئے۔ تمام ولایت سرسبز اور شاداب ہے۔ سبزہ جو ہم ہندوستان میں صرف ہرسات میں دیکھتے ہیں، یہاں بارہ مہینے ہے۔ لیکن لندن میں یہ لطف نہیں ہے جو اس کٹھری کی سیر میں آتا ہے۔ تمام صحرا ایک باغ معلوم ہوتا ہے۔ خود رو جنگل اطراف سے ہیں اور ہمارے جنگلوں کی طرح یہاں کوئی جنگل نہیں بلکہ یہاں کا جنگل ہمارے باغات کے مطابق ہے۔“

والد صاحب کو ۳۔ اگست ۱۹۰۵ء کے خط میں اپنے تعلیمی مشاغل کی بابت لکھتے ہیں :

”لالہ سورج ٹرائن صاحب اور میں ایک ہی کالج میں ہیں لیکن جدا جدا کلاسوں میں۔ میں اور وہ پہلے ایک ہی دوڑے میں تھے یعنی وہ بھی روسن لا، کلاس میں تھے اور میں بھی، لیکن جون میں وہ روسن لا، امتحان میں شریک ہو کر فیل ہو گئے، اس لیے اب وہ گریجویٹ لا، یعنی قانون فوج داری کی جماعت میں لکچر سنے ہیں اور میں روسن لا، میں سورج صاحب روسن لا، میں کیوں فیل ہو گئے، نہ اس لیے کہ ان کی لیاقت میں کمی تھی؛ ان کی انگریزی لیاقت بہت اچھی ہے، مگر ان کے فیل ہونے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ انہوں نے لاطینی اصطلاحوں کو یاد نہیں کیا

اور یہی وجہ شیخ عبدالقادر صاحب کے قیل ہونے کی ہے۔ انہوں نے بھی لاطینی اصطلاحوں کو سرسری خیال کیا اور پرچہ امتحان کا تمام لاطینی اصطلاحوں سے پر تھا۔ نتیجہ یہ کہ دونوں صاحب قیل ہو گئے۔ شیخ صاحب کو لندن آنے ہوئے تیسرا سال شروع ہونے والا ہے۔ انگریزی دانی کے لیے عام معلومات کا ہونا ضروری ہے جو وقت پر منحصر ہے لیکن قانون کے لیے قانونی اصطلاحات، تعریفات اور تشریحات کا جانتا ضروری ہے۔ سو انگریزی دانی میں یہ دونوں صاحب مجھ سے بڑھے ہوئے ہیں لیکن قانون میں شاید ہم سب برابر ہوں۔ بیاری نے میرا یہ حرج کیا کہ میں اگر بیار نہ ہوتا تو شاید شیخ صاحب اور سورج صاحب کے ہمراہ ہی امتحان میں شریک ہو جاتا لیکن بیاری کی وجہ سے میں شریک نہ ہو سکا اور جو کچھ تیاری بیاری سے پیشتر میں نے کی تھی، سب رائیگ گئی۔ اب تمام کام لڑ سرنو شروع کرنا پڑا، لیکن آپ کو میری طرف سے کوئی فکر نہیں کرتی چاہیے۔ میں انٹرنس پاس ہوں تو کیا ہوا۔ نتیجہ انہی تین سالوں میں انہی لوگوں کے برابر کر دکھاؤں گا اور اپنی انگریزی میں غاسی کو بھی پورا کر لوں گا۔“

انہی دنوں انہیں فری میسن تحریک میں شامل ہونے کا شوق ہوا۔ اس تحریک کا اپنے والد سے تعارف کرائے ہوئے لکھتے ہیں :

”یہ ایک خفیہ جماعت ہے اور اس کے مقاصد دنیا میں ہم خیالی اور ہم دردی پھیلاتا ہیں۔ قدیم تاریخ میں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملیں گی جس میں قوموں نے اپنی خفیہ جماعتیں قائم کر کے زبردست سلطنتوں کو برباد کر دیا ہے۔ عرب میں اسی قسم کی ایک جماعت نے دولت بنو امیہ کا خاتمہ کیا۔ مصر میں خلفائے بنو عباس نے اسی قسم کا پہلو اختیار کیا۔ اُس وقت دنیا اخلاق اصول میں خام تھی۔ سو اس قسم کی جماعتوں اور خفیہ کوششوں سے اثر کا استعمال صرف سلطنتوں کی بربادی میں کیا جاتا تھا۔ لیکن

اب دنیا شائستہ ہے اور اس خفیہ اثر سے مفید نتائج حاصل کیے جاتے ہیں ، خواہ وہ ملکی ہوں یا قومی ۔ اس زمانے میں روس میں اس قسم کی ایک جماعت ہے جو حکمران حال خاندان کے خلاف ہے ، یہ جماعت نپلسٹ کہلاتی ہے ۔ لیکن اس کی طاقت کا اور اثر کا آپ اس سے اندازہ کر لیں کہ روس جیسی طاقت ور سلطنت اس جماعت کا کچھ نہیں کرتی اور روس میں جس قدر فساد اور سرکشیائی آپ سنتے ہیں ، اس کے سواچہ نپلسٹ ہیں اور ایک زمانہ آوے گا (جو شاید نہایت فریب ہے) جب کہ روس جیسی قوی سلطنت کو بھی نپلسٹ برباد کر دیں گے ۔ غیر یہ تو اس خفیہ اثر کی بڑی مثال ہے ۔ فری میسن کو نہلزم یعنی نپلسٹ نزع سے کوئی تعلق نہیں اور نہ کوئی مشابہت لیکن ان کے اصول ایک ہی بنیاد پر ہیں اس لیے کچھ مشابہت دے سکتے ہیں ۔ جماعت فری میسن ایک روشن جماعت اور نہایت ہی شائستہ فرقہ ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی تمام اغراض ، ہم دردی اور بہتری پر مبنی ہیں ، اس کے خواہ کچھ ہی قانون ہوں لیکن وہ خلیہ ہیں ۔ ان میں کچھ علامتیں ہیں جن سے ایک ممبر دوسرے ممبر کو پہچان سکتا ہے ۔ میں اس میں داخلے کو ضروری سمجھتا ہوں ۔“

معلوم ہوتا ہے کہ فری میسن میں داخلے سے متعلق ان کے والد نے کوئی ایسی شرط پیش کر دی جس کی وجہ سے وہ اس کے رکن نہیں ہوئے ۔

لندن میں انہوں نے اپنے دوستوں کا حلقہ زیادہ وسیع نہیں کیا ۔ اس کی بڑی وجہ ان کی تعلیمی بصرفیات تھیں ۔ هندوستان کے لوگوں کو چھوڑ کر جن کا وجود ، خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں ، ہر دہس میں تحیث معلوم ہوتا تھا ، ان کی واقفیت بڑی محدود تھی ۔ ایسے انگریزوں میں سے جن کے پاس وہ وقت نکال کر بھی جاتے تھے ، مجھے صرف دو نام بروکسر آرٹلڈ اور

میں میٹنگ ۱ کے ملنے ہیں۔ موخر الذکر ہے ان کے والد کی بھی خط و کتابت تھی۔

اس محدود حلقہ احباب کے ساتھ ساتھ جب کبھی انہیں کسی محفل میں شرکت کا موقع ملتا، خوب چہکتے اور نئے نئے ملنے والوں سے بھی تبادلہ خیال کرتے۔ موقع محل کی مناسبت سے لفظیہ گوئی بھی ہوتی اور ہلکہ منہجی کی داد ہوتی۔ ایسی مجالس اکثر انڈین ایسوسی ایشن، علیگڑھ کالج ایسوسی ایشن اور بین اسلامک ایسوسی ایشن کے ذریعے منعقد کی جاتیں۔ علاوہ ازیں عبدین کے موقع پر مختلف ممالک کے مسلمانوں کے اجتماع ہونے اور عید کے دن وہ بعض دوستوں کے ہمراہ مبارک باد کے پھانے اسلامی ممالک خصوصاً ترکی و ایران کے سفرا کے حلقہ میں پہنچ جاتے۔ علیگڑھ کالج ایسوسی ایشن کے جلسے کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”میرے برابر مسٹر ڈائلم سندھ تھے اور میرے مقابل میز پر ڈاکٹر ہالمر سی۔ آئی۔ ایل۔ ایل۔ ڈی۔ ڈاکٹر ہالمر سے میری خوب خوب باتیں ہوئیں۔ یہ فارسی بھی جانتے ہیں۔ مجھ سے پوچھا ”کہاں سے آئے ہو؟“ میں نے کہا ”راجپوتانہ سے“ بولے ”فارسی جانتے ہو؟“ میں نے کہا ”ہاں“ غیر ہم فارسی بولنے لگے۔ بعد میں بولے ”گجراتی جانتے ہو؟“ میں نے کہا ”سمجھ سکتا ہوں“

۱۔ پروفیسر آرٹلڈ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ میں میٹنگ انڈین ایسوسی ایشن کی آخری سیکرٹری تھیں۔ ۱۰ اگست ۱۹۰۵ء کو ۷۷ سال کی عمر میں وفات پائی، ہندوستان کی محبت گہنی میں بڑی تھی۔ دو بار سفر ہند بھی کیا۔ انتقال پر سالہ ہزار سے زیادہ روپیہ انڈین ایسوسی ایشن کو بطور عطیہ دیا۔ ان کا مکان ہندوستانیوں کے لیے بنائے گیا تھا۔ دامے درمے۔ پختے ہر طرح امداد کو تیار۔ کوئی بیمار ہے تو اسے بوجھنے جا رہی ہیں، کسی کو سفارشی خط دے رہی ہیں۔ ان کے انتقال پر شیخ عبدالقادر نے تفصیل حالات لکھے جو دسمبر ۱۹۰۵ء کے ’نور‘ میں شائع ہوئے تھے۔

وہ کجراتی میں بولنے لگے اور میں انگریزی میں جواب دیتا رہا ۔
 پھر بولے ”ہنجائی جانتے ہو؟“ میں نے کہا ”ہاں“ پھر ہم ہنجائی
 میں بولنے لگے۔ پھر اردو کی نوبت آئی اور پھر پشتو کی ، پھر بنگالی کی ،
 پھر مرہٹی کی اور میں نفی میں جواب دیتا رہا ۔ مسٹر ڈنلپ بولے
 کہ میں اٹھائیس سال ہندوستان میں رہا اور افسوس ہے کہ مجھے
 ہندوستانی بولنا نہیں آتی ۔ میں نے جواب میں کہا کہ میں حیرت
 کرتا ہوں اٹھائیس سال تم جس ملک میں رہے اس کی زبان بھی
 تم کو نہیں آتی ۔ بولے ”صرف دو چمٹے مجھ کو آتے ہیں“۔ میں نے
 کہا ”وہ کیا؟“ بولے ”چھ مہینا کا کڈ“ (چھ مہینہ کا قید یعنی چھ
 ماہ قید) اور ”ہم افسوس کرتا ہے“ (ہم افسوس کرتا ہے مجھے) میں
 افسوس کرتا ہوں ۔ انگریزی میں کسی فعل کے نفی میں جواب
 دینے کے وقت متکلم اخلاقاً تمہیداً یہ جملہ کہتا ہے کہ میں افسوس
 کرتا ہوں کہ یہ کام میں نہیں کر سکتا)۔ میں نے مسکرا کر کہا کہ
 اگر آپ کی اس اردو زبان دان سے کوئی شخص آپ کی اخلاق حالت
 کا موازنہ کرنا چاہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ خدا جانے
 کس قدر مفہوم نتیجہ نکلتے ۔ آپ کا پہلا کلمہ ہے کہ میں افسوس
 کرتا ہوں ، اس کے بعد ضرور ہے کہ آپ نے نفی میں جواب دیا ہو
 اور دوسرا جملہ ہے چھ مہینہ کا قید یعنی اس پر بھی باز نہ آئے
 تو آپ نے چھ مہینہ کا حکم دیا ۔ مسٹر ڈنلپ ساتھ ہنس پڑے اور
 بولے ’یو و کڈ بوائے‘ (شربرائنٹس لڑکے یعنی نالائق آدمی)۔“

مسٹر کولڈ سٹریم ’کنکرنان‘ کے ماسٹر آف دی ہنچ تھے ۔ جب
 کسی گرجے میں کوئی مذہبی تقریب ہوتی تو وہ ان کو بھی مدعو
 کرتے۔ ۳۔ مئی ۱۹۰۵ء کو عیسائی مشنریوں کا سالانہ جلسہ رائل البرٹ
 ہال میں منعقد ہوا ۔ اس میں انگریز مشنریوں نے ایشیا اور افریقہ میں
 اپنی تبلیغی کلم ہابیوں کی رو داد پیش کی ۔ ہندوستان کے لاث پادری
 نے دوسری باتوں کے علاوہ وہاں کے قدیم فرقے سنتھال کا ذکر کرنے
 ہوئے کہا کہ ان میں عیسائی مذہب بہت تیزی سے پھیل رہا ہے ۔ آگے
 حافظ صاحب ہی کی زبانی سنئے :

”میرے قریب ایک ہندوستانی (سندھی) بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میں سمجھ گیا تھا جس خیال سے انہوں نے یہ تکلیف کی تھی۔ میں نے اول تو ان کا نام دریافت کیا جس پر انہوں نے طعنے لہجے میں کہا ”عبدالحمید خان“ بعد میں میں نے مذاق میں کہا ”قرض کرو میرا نام بھوجو ہے جو سنتھالی نام ہے۔ اس پر وہ گھبرائے اور خاموش ہو رہے۔ میں نے چھیڑ کر کہا ”کیا تم ایک سنتھالی سے بات نہیں کرو گے؟ یہ لحاظ ہندوستانی ہونے کے ان کو مغرور آریہ اور وحشی مزاج پٹھانوں پر فوق ہے۔“ کچھ شرمائے اور بولے ”نہیں، میرا یہ منشا نہیں تھا۔ میں نے صرف نام دریافت کیا تھا“ میں نے کہا ”مگر تم سنتھالی کو حقارت کی نگاہ سے ضرور دیکھتے ہو“ بولے ”حقارت کی تو کوئی بات نہیں، ہاں یہ فرقہ وحشی ہونے میں مشہور ہے۔ بالکل غیر شائستہ اور غیر مہذب فرقہ کہلایا جاتا ہے۔“ میں نے کہا ”مگر یورپین کے مقابلے میں پٹھان اور سنتھالی دونوں طبع مہذب اور وحشی ہیں“ بولے ”ہاں وہ ایسا کہتے ہیں کم از کم۔ لیکن اگر تم سنتھالی ہو تو میں ایسے فرقے کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھوں گا جس میں تم جیسے شائستہ لوگ موجود ہیں۔“ میں نے کہا ”اگر میں یہ کہوں کہ میں سنتھالی نہیں ہوں تو شاید آپ کو افسوس ہو کیوں کہ میں اس فرقے کا ہوں جس فرقے کے آپ ہیں“ بولے ”کیا پٹھان ہو؟“ میں نے کہا ”ہاں، کہتے تو ہیں اور میرے نام سے پہلے حافظ کا لفظ بھی ہے جس سے آپ خیال کر سکتے ہیں کہ میں پٹھان یعنی کنڑ مسلمان اور حافظ یعنی اور بھی کنڑ مسلمان ہوں۔ یہ دیکھتے میرا کارڈ ہے، اس کے آخر میں منشی فاضل ہے جو میرے کنڑ مسلمان ہونے کو اور بھی خوف ناک کر دیتا ہے۔ میرا نام محمود ہے جس کے ساتھ ”بہت شکن“ کا لفظ ہمیشہ سے لگا ہے، جس نے سنتھالیوں اور آریہ کو مسلمان بھی کیا ہے۔ کہتے اب تو آپ شبہ نہیں کریں گے کہ میں عیسائی ہوں یا ہو جاؤں گا۔“

حافظ صاحب کا مزاج ابتدا میں سے مذہبی تھا۔ ان کی اسلامی اخوت کے جذبے کو ولایت کے قیام نے زیادہ بالیدگی عطا کی۔ لندن میں کیمپ ٹاؤن کے ایک مسلمان حاجی وولی اپنے بیٹوں کی تعلیم کے سلسلے میں متیم تھے۔ ان کے بڑے لڑکے محمد عمر نے ڈاکٹری داس کی اور وہ لوگ وطن لوٹنے کی تیاریوں میں تھے کہ حاجی صاحب اچانک انتقال کر گئے۔ پردیس میں مصیبت پڑ گئی، لچھیز و تکلیف کے لیے بھی آخر چند مسلمان ضروری تھے۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں :

”لندن میں مسلمان تو بہت سے ہیں اور ہم لوگ اگر جھوٹ بھی کسی جلسے کا نام سنے ہیں تو دس کام چھوڑ کر وہاں جاتے ہیں لیکن حاجی صاحب کی وفات کے موقع پر باوجود علم ہرنے کے نہیں گئے۔ مسٹر عبداللہ الہامون سہروردی اپنا تمام کام چھوڑ کر ادھر ادھر مسلمانوں کو کہنے گئے لیکن کوئی نہیں آیا۔ میرے ہاں بھی اسی غرض سے آئے۔ یہ ۱۹۔ فروری کا ذکر ہے۔ ۲۰۔ فروری کو میں اور مسٹر سہروردی اور خداداد خان تینوں حاجی صاحب کے مکان پر پہنچے۔ سب نے مل کر ان کو غسل دیا۔ ۲۱۔ کو جنازہ کا دن ٹھہرا۔ میں بھی اس روز گیا۔ ہندوستانہوں میں سے صرف میں اور خداداد خان تھے۔ میں نے نماز جنازہ پڑھائی۔ کفن کے بازے میں ہمیں مشکلات پیش آئیں۔ ہم میں کوئی بھی واقعہ نہیں تھا۔ ادھر ترکی سفارت خانہ کا امام کہیں باہر تھا۔ الغرض یہ مشکلات ایک کتاب کے ذریعے حل ہوئیں۔“

جناب عبداللہ الہامون سہروردی نے لندن میں بین اسلامک سوسائٹی کے نام سے ایک انجمن قائم کی جس کے مقاصد میں اسلام کے مختلف فرقوں میں یکجہتی پیدا کرنا، لندن میں مسجد کی تعمیر اور یورپ میں تبلیغ اسلام شامل تھے۔ اس معاملے میں حافظ صاحب نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

”سید امیر علی جج، سید علی بکراسی، شیخ عبدالقادر اور دیگر

ہیں خواراں قوم بالخصوص جو کہ علی گڑھ کالج سے ہم دردی رکھتے ہیں ، سہروردی صاحب کے خلاف ہیں ۔ صاحبان مسبق الذکر فرماتے ہیں کہ ایسا کرنا گورنمنٹ کے خلاف عمل کرنا ہے ، اور بالخصوص انگریزوں میں دعوت اسلام کرنا گورنمنٹ کی نگاہ میں بغاوت کا ثبوت دیتا ہے ۔ سہروردی صاحب کہتے ہیں آپ گورنمنٹ سے اتنا ڈرا کریں میں نہیں ڈرتا اور دعوت اسلام سے اور گورنمنٹ سے کیا مناسبت ہے ۔ میں نے اب تک بارہ لوگوں کو مسلمان کر لیا ہے اور انشاء اللہ اگر زندگی یہ غیر ہے انہی انگریزوں میں سے اور سینکڑوں کو مسلمان کرتا ہوں ۔ میں کہتا ہوں ”سہروردی صاحب شاہاش ، میں تمہارے ساتھ ہوں ۔ تم سچے مسلمان ہو ، ہاں ہم تو صرف کہنے کے مسلمان ہیں ۔“

تعلیم کے معاملے میں انہیں علی گڑھ تحریک سے کچھ اختلاف تھا ۔ ان کے خیال میں اس کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اس سے مسلمانوں میں زبردست قسم کا احساس کم تری پیدا ہو جاتا ہے ۔ اپنے ایک دوست کے نام خط میں اس معاملے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”اگرچہ شخصی طور پر میں سرسید کا مداح ہوں لیکن ان کے کالج سے مجھ کو ہم دردی نہیں ۔ اگرچہ کالج کا نمائندگی اس کی لمبی چوڑی عمارت اور مسلمان بچوں کا ایک گروہ کثیر وہاں دیکھ کر غیرہ ہو جاتا ہے لیکن میں اس تعلیم کو ”اینٹی اسلامک موومنٹ“ کے نام سے یاد کروں گا ۔ کیوں کہ وہ کالج مسلمانوں کو ایسا خاصا انگریز بنا دیتا ہے ۔ اور جب یہ انگریز زیادہ بڑھ لکھ جاتا ہے تو وہ اسلامی علما ، حکما اور فلسفیوں کو تو بھول جاتا ہے اور بات بات میں کسی رسول کی تائید میں کسی انگریز کو پیش کر دے گا ۔ وہ اگر چاہے تو ابن رشد کو اپنے قول کی تائید میں پیش کر سکتا ہے لیکن نہیں ، وہ لارڈ ہیکن ہی کو پیش کر دے گا ۔ سعدی وہ بھول جاوے گا اور دوڑ کر شیکسپیر ہی کو لاوے گا ۔ حالانکہ سعدی شیکسپیر سے ہزار

درجہ اور دس ہزار درجہ بڑھا ہوا ہے ، خواہ قبولیت کے لحاظ سے ، خواہ قابلیت کے لحاظ سے ۔ وہ اگر چاہے تو شہاب الدین مقتول کا حوالہ دے سکتا ہے لیکن نہیں وہ ڈارون کا حوالہ دے گا ۔^۱

قیام لندن کے زمانے میں حافظ صاحب زیادہ تر ’سہان کرایہ دار‘ کے طور پر رہے ۔ اس معاملے میں وہ کفایت شعاری کا زیادہ خیال کرتے تھے ۔ انہیں اس بات کا بڑا احساس تھا کہ والد سب بھائیوں سے زیادہ ان پر صرف کر رہے ہیں ۔ وہ حتی الامکان گھر سے کم سے کم روپیہ منگوانے کی کوشش کرتے ۔ والد ان سے بہت محبت کرتے تھے ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سب بھائیوں میں صرف یہی ایک تھے جو حصول تعلیم کا شوق رکھتے تھے ۔ اپنے غلطوں میں وہ بیٹوں کی نافرمانی کی شکایت ان سے کرتے اور گھریلو معاملات میں رائے طلب کرتے ۔ جواب میں حافظ صاحب بھائیوں کو سمجھاتے اور والد کو مشورے دیتے ۔ والد کے نام غلطوں میں بعض لغزے احترام اور نصیحت کا اچھا امتزاج ہیں ۔ کسی خط میں والد نے بڑی یکم^۱ کی شکایت ان سے کی ہوگی ۔ اس کے جواب میں صرف ایک فقرہ لکھ کر نکل گئے ہیں :

”بڑی والدہ کے باب میں جناب نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے ، سب بجا و درست ہے لیکن ”والکاملین الفیظ والعافین عن الناس“ کے جو لوگ مصداق ہیں ان کے بڑے دوجے ہیں اور یہی چشم داشت مجھ کو آن حضرت سے ہے۔“

ستمبر کے ایک خط میں اپنے بھائی مسعود خان کو سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں :

”بھائی میں تو یہی کہوں گا تم جوان ہو ، ہر طرح تمہارے حواس درست ہیں ۔ ہاوا جان جو کچھ کریں ان کو کرنے دو اور چشم پوشی کرو ۔ صرف ایک ان کی ضعیفی اور آخری وقت پر رحم کرو ۔ وہ تیز مزاج ہمیشہ سے ہیں ۔ تم نے ہمیشہ ان کے

۱۔ حافظ صاحب کے والد کی دو بیویاں تھیں ۔ حافظ صاحب چھوٹی یکم کے بطن سے تھے ۔

مزاج کو برداشت کیا ہے اور ہمیشہ سلیم الطبع اور ملائم رہے ہو۔ اب بھی سلیم الطبع رہو، اسی نرمی سے کام لو، اب اپنی اس فرشتہ نفسی کو نہ بدلو۔ وفاداری بہ شرط استواری اصل ایمان ہے۔“

انہی دنوں والد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

”آپ ان مسافروں میں سے ہیں جو دنیا سے جلد بھڑکنے والے ہیں۔ یہ دور دور آخر ہے اور یہ بہار آخری بہار ہے۔ ایسے وقت میں فضول امور میں دل چسپی لینا خلاف حقیقت ہے۔ اولاد اور ان کی مال کے غم کو بھول جائیے۔ یہ طول امل ہے۔ یہ ان کا کام ہے، چاہے سنواڑیں اور چاہے بگڑیں۔ آپ کا ان کا تعلق مجاز ہے نہ حقیقت۔ مجاز کو چھوڑے حقیقت لیجیے۔ بہت سے غیر ضروری اسباب ہیں جو حقیقت سے زیادہ آپ کو رنج پہنچا رہے ہیں اور فی الحقیقت وہ غیر ضروری ہیں :

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب معاش

آنچه ما در کار داریم اکثرے در کار نیست

میں اسباب معاش میں انسانی اندرونی جذبات کو بھی شامل کرتا ہوں۔ یہ کتاب زندگی جو آپ کے سامنے ہے، بہت جلد غم ہونے والی ہے۔ ہوائے خدا جو کچھ باقی ہے اس کے مطالعے کی داد دیجیے، اس کو اس طرح پڑھیے جس سے آپ کے مزاج کو آرزوی حاصل نہ ہو بلکہ خوشی۔ یہ آخری بہار ہے، اس بہار میں آپ سے جو بھول چنے جاویں چن لیجیے۔ اگلی بہار میں خدا جائے آپ کہاں ہوں۔ میری یہ امید کہ اولاد اس قابل ہو کہ آپ کو عیش دکھائے، گو میری دعا ہے کہ خدا اس کو پورا کرے، لیکن اسر موهوم ہے۔ یہ ظاہر یہ خوش نصیب زمانہ ہماری قسمتوں میں نہیں کہ ہم آپ کو عیش دکھاویں لیکن میں نا امید نہیں ہوں۔ خدا آپ کو صد و سی سال کی عمر عطا کرے۔ وہ دن آوے گا ہم بھولیں گے، بھلیں گے اور ہمارے لیے آپ نے جو جو خوشیاں قربان

کی ہیں ان کا شکریہ کریں گے۔ ہم ہمیشہ اسی طرح نا سچو اور مفلانہ مزاج نہیں ہوں گے۔ ایک دن آوے گا کہ ہم آپ کی فکر کریں گے۔ خدا وہ دن کرے کہ آپ اس وقت تک ہمارے سروں پر قائم ہوں۔ ہم اس وقت اگرچہ کہنے کو جوان ہیں لیکن فی الحقیقت نادان ہیں۔ خدا آپ کو جملہ آفات سے محفوظ رکھے اور جملہ امراض سے تندرستی بخشنے۔“

اکتوبر میں ان کو ولایت گئے پورا سال ہو گیا۔ اس میں سے چار ماہ وہ بیمار رہے۔ باقی آٹھ مہینوں میں انہوں نے خوب محنت کر کے ایک طرف تو اپنی انگریزی زبان کی کسی کو کالی حد تک پورا کیا، دوسرے دوسن لاء بھی تیار کر لیا۔ لیکن ابھی وہ اپنی انگریزی طرز تحریر سے مطمئن نہ تھے، اس لیے اس سال وہ امتحان میں نہ بیٹھے۔ ارادہ یہ تھا کہ آئندہ سال تحریر پختہ ہونے پر دونوں امتحان اکٹھے ہی دے دیں گے۔ چنانچہ وسط اکتوبر میں کالج کھلنے پر گریڈ لاء کے لکچر سننے لگے۔ ادھر انہی دنوں ان کے والد بیمار ہو گئے۔ وہ دس کے تو پرانے مریض تھے، عرق النساء کی بھی شکایت ہو گئی۔ اس خبر سے حافظ صاحب کو بڑی پریشانی ہوئی۔ وہ جانتے تھے کہ میری تعلیم کا سلسلہ باپ کے دم تک ہے، پھر بھائیوں میں کوئی اس لائق نہیں کہ پردیس میں میرے اخراجات کا کفیل ہو۔ چنانچہ والد کو لکھتے ہیں :

”اں حضرت کی موجودہ بیماری سے میں سخت متوحش ہوں۔ میرا حوصلہ پریشان اور خیالات ہست ہوتے ہیں۔ خدا جائے تقدیر میں کیا ہے۔ خدا جانے میں اپنے مقاصد میں کام باب ہوؤں یا نہیں۔ آپ کے ضعف کا زمانہ، ایک چھوڑ دو دو تین تین بیماریاں موجود، کھڑ کی طرف سے علیحدہ پریشانی۔ یہ چیزیں مجھ کو مایوس کر رہی ہیں۔ غیب کا علم عالم الغیب جانتا ہے۔ تقدیر کے لکھے سے کوئی واقف ہے۔ اللہ پاک آپ کو صحت کامل و شفا سے عاجل عطا فرماوے اور تمام آفات سے امن میں رکھے۔“

ان کی تیاری نے کافی طول کھینچا لیکن آخر حالت منبہل گئی اور حافظ صاحب کو ایک گونا گونا اطمینان ہوا۔ انہوں نے اپریل ۱۹۰۶ء کے امتحان میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا۔ اپنی طرف سے تیاری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ وہ زیادہ تر لاطینی اصطلاحات سے ڈرتے تھے جن کی قانون کی کتابوں خصوصاً رومن لاء میں بھر مار تھی۔ علاوہ ازیں وہ تحریری امتحان کے مقابلے میں تقریری امتحان سے غائب تھے۔ غرض وہ ہمت کر کے امتحان میں بیٹھے اور کام یاب رہے۔ امتحان سے فارغ ہوتے ہی نیچے کا انتظار کیے بغیر انہوں نے آئندہ امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ امتحان میں کام باقی ہے انہیں اپنے اوپر اعتماد ہو چلا تھا۔

قیام لندن کے اس عرصے میں انہوں نے کچھ نظمیں اور مضامین بھی سپرد قلم کیے۔ ان میں سے بعض چیزیں شیخ عبدالقادر کے توسط سے مخزن میں شائع ہوئیں۔ جنوری ۱۹۰۵ء کے شمارے میں ایک نظم ”نخلستان“ شائع ہوئی۔ یہ انگریزی نظموں کے انداز میں ہے۔ مارچ کے پرچے میں ان کی برائی لکھی ہوئی نظم ”ٹیپو سلطان“ چھپی جس پر انہوں نے نظر ثانی کی تھی۔ اس کے متعلق والد کو لکھتے ہیں :

”مخزن میں اس مرتبہ میری نظم ”ٹیپو سلطان“ شائع ہوئی ہے۔ شاید جناب کی نگاہ سے گزری ہو۔ میں نے ایک مرتبہ جب یہ نظم لکھی تھی، جناب کو سنائی تھی لیکن اب وہ پہلی نظم سے زیادہ دل چسپ اور مختلف ہے۔“

اگست کے پرچے میں مسز ہیمنز کی ایک انگریزی نظم کا منظوم ترجمہ ”موٹ کا وقت“ کے عنوان سے شائع ہوا۔ مضمون ”وکنٹورہ البرٹ میوزیم“ انہوں نے اکتوبر میں روانہ کر دیا تھا، اگرچہ شائع تاخیر سے ہوا۔ بعض غزلیات و منظومات جو ۲۰-۱۹۱۹ء میں مخزن اور اس کے بعد کے زمانے میں بعض اور رسائل میں چھپیں، اکثر اسی دور میں لکھی گئیں۔ انہی دنوں انہوں نے ایک قومی نظم کی ابتدا کی جو مکمل نہ ہو سکی۔ یہ نظم سسٹم کی صورت میں تھی اور سسٹم حالی کی بحر میں لکھی جانے والی تھی۔ مجھے اس کے صرف دو بند جو مختلف

حصوں سے تعلق رکھتے ہیں ، ان کے جنوری ۱۹۰۶ء کے ایک خط سے دست پاب ہوئے ہیں :

ہوا مست ہازوئے شمشیر زان
اڑی رونق چہرۂ ارغوانی
تشدد میں ہے گردش آسماں
سلف کی ترقی ہوئی اک کہانی
نہ وہ بزم باقی نہ وہ ہار باقی
مگر رات کے ہاسی ہیں ہار باقی

وہ یورپ میں ترکوں کا چو خاندان ہے
مسلمانوں کی شان و شوکت وہاں ہے
عجب اس کی قدرت عجب اس کی شان ہے
صلیبوں کے اندر ہلال نشان ہے
ابن کوغبتی ہے ایسا صوفیہ پر
سوزن کی آواز اللہ اکبر

لیکن سب سے دل چسپ بات یہ ہے کہ اکتوبر ۱۹۰۵ء میں انہوں نے شاہ اہلورڈ ہفتم کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھنے کا اواذہ کیا اور اس کی ابتدا بھی کر دی ، گو یہ بھی مکمل نہ ہوا ۔ اس سے ان کا کیا مقصد تھا انہی کے الفاظ میں سنئے :

”اس تکلیف ہے جا سے مجھ کو کوئی معتد بہ امید نہیں یہ جز اس کے کہ یہاں کے چند اختیارات اس کے متعلق رائے زنی کریں اور ایک خط بادشاہ سلامت کا میرے نام پہنچے ۔ پھر حال یہاں یہ کوئی بڑی بات نہیں لیکن ہندوستان کی نگاہ میں یہ بہت بڑی چیز ہوگی ۔

اور کچھ نہیں تو ہندوستان میں چرچا ضرور ہو جاوے گا۔“

ان کا خیال اس قصیدے کو مع انگریزی ترجمہ بادشاہ کی خدمت میں بھیجنے کا تھا ۔ اس کے انداز کے متعلق لکھتے ہیں :

”اس قصیدے میں کئی نئی باتیں ہوں گی ۔ اول تو یہ کہ تمہید

تمام قصیدہ گوئیوں سے جدا ہوگی اور علیٰ ہذا خیالات جدا ہمارے فارسی شاعروں کی جس قدر سمجیدیں ہیں وہ مشرق مذاق کی ہیں ، مغربی لوگ اس سے کوئی دل چسپی نہیں لے سکتے ۔ عشقیہ سمجیدیں ایسی ہو سکتی ہیں کہ یورپ اور ایشیا دونوں اس کو پسند کریں لیکن اس میدان میں مہجری رسائی نہیں اور نہ زور طبیعت دکھا سکتا ہوں ، اس لیے کسی اور زمین کی تلاش ہوئی اور آخر یہ وقت تمام مل گئی ۔ اب زمین مل گئی ہے خیال آفرینی بھی ہو جائے گی ۔ یہ تشبیہ زیادہ تر انگریزی مذاق سے ملتی جلتی ہوگی لیکن خیالات مشرقی ہوں گے ۔“

بڑی مشکل یہ تھی کہ انگریزی نام جن کا قصیدے میں آنا ناگزیر تھا ، کسی شگفتہ بحر میں نہ آسکتے تھے ۔ آخر انہوں نے عربی کے مشہور قصیدے :

صبح عید کہ در تکیہ کہ ناز و نغم
کدا کلاہ کند کج نہاد و شہ دیہم

والی زمین اختیار کی ۔ ان کا خیال تھا کہ آہستہ آہستہ یہ قصیدہ مکمل کر کے جون ۱۹۰۶ء میں بادشاہ کی سالگرہ کے موقع پر پیش کر دیا جائے ۔ کہنے کے اشعار میں یہاں درج کرتا ہوں :

بشر ہے نوع مری میرا شیوہ ہے تسلیم
ازل نے کی ہے مجھے رسم بندگی تعلیم
بنوں کے آگے سرا سر جھکا ہے صدیوں تک
گواہ جس کی ہے تاریخ سال ہائے قدیم
کمز صانع و مصنوع سے نہ تھا واقف
میں فلسفی نہ تھا مشکل تھی اس قدر تفہیم
ابھی ہوئے تھے نہ یزدان و اہرمین پیدا
عدم میں بحر تھا افسانہ بہشت و جہیم
جہاں میں چار سو سکھ تھا دین آذر کا
غسائل بن کے نہ آیا تھا اب تک ابراہیم

بہت زمانہ تھا درکار اس کو جب ہوتا
ظہور واقعہ طور و داستان کلمہ
بہ کل کی بات ہے تثلیث کہیے یا توحید
مرے زمانے میں ان کی ہوئی نہ تھی تقسیم

۱۹۰۹ء کی تعطیلات میں بھی ان کا ارادہ وطن آنے کا نہ تھا لیکن
جس بات کا اندیشہ تھا وہی ہوئی ، یعنی ۲۹ - جولائی کو ان کے والد کو
اختلاج قلب کا دورہ پڑا اور وہ آنا فانا ختم ہو گئے ۔ حافظ صاحب کو
بذریعہ تار اطلاع موصول ہوئی ۔ حادثہ اتنا اچانک تھا کہ وہ فوراً
عازم وطن ہوئے ۔

ابا صاحب (وہ پورے خاندان میں اسی نام سے یاد کیے جاتے ہیں)
کی آنکھ بند ہونے ہی تمام کارخانہ درہم برہم ہو گیا ۔ دو بیویوں کی
اولاد ہونے کی وجہ سے بیٹے پہلے ہی ایک دوسرے کو مشکوک
نظروں سے دیکھتے تھے بالکہ والد کی زندگی ہی میں خود سری کے آثار
ان میں نمایاں ہو گئے تھے ۔ دونوں بیویاں الگ الگ حویلیوں میں
رہنی تھیں ۔ بڑی یکم سے وہ کچھ نالاں رہا کرتے تھے ۔ چنانچہ
حافظ صاحب کی غیر موجودگی کی وجہ سے ان کے معتمد مسعود خان تھے
جو ان سے دو سال چھوٹے تھے ۔ تمام حساب کتاب اور نقد و جنس ان
کے علم میں تھا ۔ باپ کے فوت ہونے ہی انہوں نے نقدی کے ٹوڑے
اپنے آدمیوں کے ذریعے نکالوا کر مختلف لوگوں کے پاس بطور امانت
رکھوا دیے ۔ لیکن اس معاملے کی فریق ثانی کو بھی اطلاع ہو گئی ۔
نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی باپ کا گفن بھی سیلا نہ ہوا تھا کہ بیٹوں میں
مقدمہ بازی کا سلسلہ شروع ہو گیا ۔ یہ صورت حال تھی جو حافظ صاحب
گھر پہنچے ۔ کچھ تو مال و منال کے معاملے میں وہ طبعاً درویش منش
واقع ہوئے تھے ، کچھ علمی ذوق و شوق کی وجہ سے ان جھکڑوں
سے دور بھاگتے تھے ۔ انہوں نے فریقین کو سمجھانے کی کوشش کی
لیکن معاملہ سمجھانے کی حد سے آگے نکل چکا تھا ۔ ابھی انہیں گھر پہنچے
ایک ہفتہ گزرا تھا کہ ایک دن محکمہ شرع شریف کے ناظم ہادی

لیے کر تھی حوصلے کے کمروں کو مہر و موم کرنے آگئے۔ یہ حالت دیکھ کر انہوں نے اپنی سائیکل، جو وہ ساتھ لیے کر آئے تھے، سنبھالی اور سادات قافلہ کے خان چلے گئے۔ سادات میں بزرگوں کے علاوہ ان کے عزیز دوست سید حسن بھٹی بھی تھے۔ یہ چند ماہ کا عرصہ جو انہوں نے نوٹک میں گزارا، سادات ہی کے خان رہے۔ کبھی کبھی والدہ سے ملنے گھر آ نکلتے۔

آخر انہوں نے واپس لندن جانے کا ارادہ کیا۔ واپسی کا ٹکٹ وہ لیے کر آئے تھے۔ آٹھ لڑکیاں انہوں نے پوری کر لیں تھیں، اب صرف چار باقی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ اگر مسعود خان کچھ روپیہ میرے حصے میں سے دے دیں تو میں اس کام کو اختتام تک پہنچا دوں۔ لیکن مسعود خان کبھی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ انہوں نے یہ معاملہ زیر بحث آنے پر بڑے بھائی کو خوب سبز باغ دکھائے اور کہا کہ آپ ہلا تردد و لاپت تشریف لیے جائیں، آپ کے اخراجات کے لیے رقم باقاعدگی سے پہنچی رہے گی۔ حافظ صاحب اس بات سے مطمئن ہو گئے۔ ان کو جائیداد کا لالچ بالکل نہ تھا، ان کی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح اپنی تعلیم مکمل کر لیں۔

انہیں اپنے سب سے چھوٹے بھائی مشہود خان سے، جن کی عمر والد کی وفات پر صرف سات سال تھی، بڑی محبت تھی۔ اسی محبت کی بنا پر اس کا مستقبل بھی عزیز تھا۔ چنانچہ جانے سے قبل والدہ سے مشہود خان کو ساتھ لیے جانے کی اجازت طلب کی اور کہا کہ یہ جہاں ان لوگوں کی صحبت میں خراب ہوگا اور تعلیم حاصل نہ کر سکے گا۔ از راہ تلقین یہ بھی کہا کہ میں آپ کا لڑکا اپنے ساتھ لیے جاتا ہوں اور اپنا آپ کے پاس چھوڑے جاتا ہوں۔ غرض والدہ سے اجازت لیے کر وہ بھائی کو بھی ساتھ لیے گئے۔ مسعود خان بیٹیوں کو بمبئی تک چھوڑنے گئے اور جہاز میں سوار کرا کے واپس آئے۔ یہ دسمبر کے آخر میں لندن پہنچے۔ جون ۱۹۰۵ء سے شمالی کنزنگٹن میں اٹھارہ سنگلیئر روڈ پر رہتے تھے اور ستمبر ۱۹۰۷ء تک وہیں رہے۔

ہندوستان جانے سے ان کی اکتوبر ۱۹۰۶ء کی نرم ضائع ہو گئی تھی۔ آخر وہ مارچ ۱۹۰۷ء کی ٹرم میں شریک ہوئے۔ اس طرح گویا انہیں کم از کم مارچ ۱۹۰۸ء تک وہاں ٹھہرنا تھا۔ دوبارہ لندن پہنچنے پر انہوں نے کانسیٹیوشنل لا اور لیگل سٹری کا امتحان دیا اور اس میں کامیاب رہے۔ وہاں جا کر جلد ہی مسعود خاں کے روئے پر ان کا ماتھا ٹھنکا جب کہ اخراجات کے لیے ۶۵ پونڈ کی پہلی قسط انہیں مئی سے پہلے نہ مل سکی۔ چنانچہ ۱۲-اپریل ۱۹۰۷ء کے خط میں اپنے دوست سید حسن کو لکھتے ہیں :

”حسن! تم یہ یاد رکھو کہ میں یہاں خوش نہیں ہوں۔ مشہود کو لے آیا ہوں، یہ ایک اور غلطی کی۔ میرا آنا ہی پہلی غلطی تھی۔ نہیں سمجھتا کہ کیا کروں۔ دونوں ساحل مجھ سے دور ہیں۔ کبھی سوچتا ہوں کہ واپس لوٹ جاؤں اور کبھی شرم آتی ہے اور سوچتا ہوں کہ اس قدر کیا ہے، آگے بڑھا چلا جاؤں۔ لیکن میرا واسطہ ایسے لوگوں سے بڑا ہے جن کو میرے خیال اور میرے مذاق سے ذرہ بھر بھی آشنائی نہیں۔ والد مرحوم کو میرے مذاق سے کچھ مذاق تھا لیکن ان کے مٹنے پر وہ بھی مٹ گیا۔“

کس زبان مرا بھی ٹھہد
بمزیاں چہ الناس کتم
میں خالی غول سبز باغوں میں یہاں چلا آیا اور شاید وہ دن نہایت قریب ہے جب کہ میں اس بلندی سے کروں۔ میں اگرچہ حالات نہایت ہی بد مزہ اور واقعات نامساؤں میں ہوں، تاہم کوشش میں ہوں کہ اگلے امتحان کے لیے تیاری کروں۔“

لیکن ابھی وہ بھائی کی طرف سے بوری طرح نا امید نہیں تھے اور اسی امید و ہم کی حالت میں ۱۹۰۷ء کے آخر تک رہے۔ اس کے باوجود علم حاصل کرنے کے لیے ان کے ارادے بلند تھے۔ اس علم سے ان کی مراد صرف قانون کے امتحان پاس کرنا نہیں تھی بلکہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں :

”مجھ کو ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے اور بہت کچھ پڑھنا ہے لیکن جلد ان امتحانات سے فراغت ملے۔“

سہروردی صاحب کے ولایت سے واپس آ جانے کی وجہ سے انہیں بین اسلامک سوسائٹی کی طرف زیادہ توجہ کرنی پڑی۔ اس کے متعلق حسن میاں کو لکھتے ہیں :

”میں اس وقت بین اسلامک سوسائٹی کا چائنٹ میکر بنی ہوئی لیکن کچھ ہی عرصے میں سیکرٹری بن جاؤں گا۔ اس وقت میرا ارادہ ہے کہ اس کی اشاعت میں از سر نو کوشش کی جائے اور لیکچروں کا سلسلہ باقاعدہ جاری کیا جائے۔ اس میں میں بھی ذاتی طور پر عملاً حصہ لوں گا۔ اس سوسائٹی کے مقاصد آپ کو اگر معلوم نہ ہوں تو یہ ہیں :

- ۱۔ عالم اسلام کی تمدنی اور اخلاقی اور علمی اصلاح۔ مسلمانوں کے لیے ایک مرکزی طاقت کا قیام۔ ان میں ”کل یومن اخوة“ کا عمل۔
- ۲۔ غیر مسلم اقوام سے اسلام کی بابت غلط فہمی کا رفع کرنا۔ در پردہ اس میں داخل ہے اشاعت اسلام۔ الغرض اور بھی اسی قسم کی اغراض ہیں جن سے صرف مفاد اسلامی مقصود ہے۔

اس سوسائٹی کی بہت سی شاخیں مختلف اسلامی سرگروہوں میں قائم ہو چکی ہیں؛ مثلاً مصر، شام، عرب، مراکو، ٹونس، الجیریا، ٹریپولی، ایران، مقامات وسط ایشیا، قسطنطنیہ، سرانڈیپ، برما اور ہندوستان کے بعض مقامات مثلاً کلکتہ، اودھ وغیرہ۔“

اس سوسائٹی کے مقاصد کے حصول میں عبداللہ کوئٹلم صاحب سے کافی مدد ملی۔ مسعود خان سے ان کا تعارف کرائے ہوئے ۲۵ جولائی کے خط میں لکھتے ہیں :

”شیخ الاسلام عبداللہ کوئٹلم گزشتہ جمعہ کو میرے ہاں تشریف لائے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے بیٹے عبداللہ کوئٹلم بھی تھے۔ مشہود خان کوئٹلم صاحب کی گود میں بیٹھے رہے اور بائیں

ہوتی رہیں۔ شیخ عبداللہ کونیلیم فاضل اجل ہیں۔ عربی بہت کم جانتے ہیں، ویسے نہایت لائق اور عمدہ تقریر کرنے والے آدمی ہیں۔ آئندہ منبر میں ہم ان کو اپنی سوسائٹی میں تقریر کرنے کے لیے بلاویں گے۔ انگریزوں میں یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد انہوں نے تبلیغ اسلام اپنا طریقہ اختیار کیا اور اب تک دو سو سے زیادہ مسلمان ہو چکے ہیں۔ سلطان عبدالحمید خان غازی نے ان کو شیخ الاسلام، آفتدی اور اے وغیرہ کے خطابات دیے ہیں۔ اسلام پر کئی کتابیں انہوں نے تصنیف کی ہیں۔ ایک اخبار ہفتہ وار اور ایک رسالہ ماہوار اسلامی مضامین پر نکالتے ہیں۔ اللہ ان کو سلامت رکھے۔“

۱۹۰۷ء میں مسعود خان کے نام انہوں نے جو خط لکھے ہیں ان میں زیادہ تر خاندانی مقدمہ بازی کے متعلق استفسارات اور مشورے، دو چھوٹے بھائیوں کو تعلیم حاصل کرنے کی نصیحتیں، خود مسعود خان کو کوئی ملازمت تلاش کرنے کی بجائے کاروبار کی طرف متوجہ ہونے کے مشورے اور والدہ کی تسلی کے لیے مشہود خان کے مفصل حالات شامل ہیں۔ ایک خط میں مودود خان کو حصول تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لیے لکھتے ہیں :

”مودود تم بہ یاد رکھو کہ میں غریب آدمی کی صحبت سے نہیں کہہ رہا، کیوں کہ غریبی میں کوئی عیب نہیں لیکن چہالت عیب ہے۔ اس عیب کو تم دور کرو۔ سمجھا رہا ہوں گزر گیا، وہ جب گزرا گزرا لیکن جوان اس طرح نہ گزارو، اس میں تو کچھ سیکھ لو۔ میں خود غریب آدمی ہوں اور غریب ہی رہوں گا، لیکن میری بیٹی آرزو ہے کہ علم میں نام پیدا کروں۔ والد مرحوم کی بیٹی آرزو تھی۔ تم بھی ان کی یہ آرزو پوری کرنے میں سعادت مند بیٹوں کی طرح کام کرو۔“

مسعود خان کسی رئیس کی مصاحبت اختیار کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں ان سے بھی مشورہ کیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے ایک خط میں مصاحبت کی خرابیاں تفصیل سے گنوانی ہیں۔ آخر میں کہتے ہیں :

”اگر میرے دل کی بات پوچھو تو میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر تم کہیں دس روپے کی حلال ملازمت میں لگو تو میرے نزدیک ہزار درجہ بہتر ہے یہ نسبت اس مصاحب کے جس میں تم چار سو پانچ سو ماحوار کما سکتے ہو۔ اسلام کی نگاہ میں مصاحبت پیشگی حرام ہے۔ بس یہ تمہارے لیے کافی ہے۔ مجھ کو امیری پسند نہیں ہے۔ اسلام غریب ہے اور غریبی ہی ہمارا فخر ہے۔ ہماری خوبی یہی ہے کہ ہم میں جوہر اخلاق ہو اور جوہر علم۔ اس کے علاوہ اگر ہم سے ہو سکے تو اپنی نوع انسان کی خدمت کریں۔ اگر میں اور تم ان تین فرائض میں سے ایک بھی ادا کر سکتے تو یہ سمجھ لو کہ ہم نے اپنی زندگی کا جواز دے دیا ہے جس کے لیے خدا نے ہمیں پیدا کیا تھا۔“

۲۵۔ اکتوبر کے خط میں تحریر کرتے ہیں :

”مسعود میں ہر مرتبہ تم کو لکھتا رہا ہوں کہ تاوتھیکہ نام طرف سے تم اپنے خیال کو سمیٹ کر ایک طرف نہ چلو گے کام نہیں چلے گا۔ تم اور تمام خیالات کو دور کرو ، صرف تجارت کر لو اور اسی میں خدا تم کو کلیاب دے گا۔ میں علم کا جوہا ہوں اور تم کو خوش حالی کی خبر دیتا ہوں ، خدا ہمیں دونوں کو کلیاب کرے۔“

مئی کے ۶۵ بونڈ کے بعد مسعود خان نے اگست میں ۵۰ بونڈ اور بھیجے۔ وفاقوں کے ساتھ تھوڑی تھوڑی رقم بھیجنے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس پر احتجاج کریں گے اور یہ جانہ اس سلسلے کو بند کرنے کے لیے نہایت معقول ہو گا۔ لیکن حافظ صاحب نے اس معاملے کے متعلق شکایتاً ایک لفظ بھی تحریر نہیں کیا۔ اگست کے بعد پھر انہوں نے چپ سادہ لی۔ ان دونوں بھائیوں کا اوسط خرچ سولہ سترہ بونڈ ماحوار تھا۔ چنانچہ دسمبر تک وہ کوئی ستر بونڈ کے مفروض ہو گئے۔ اس وقت انہوں نے بھائی کو کچھ رقم روانہ کرنے کے لیے لکھا۔ جواب میں مسعود خان نے

لکھ دیا کہ والدہ صاحبہ فرماتی ہیں کہ یہ بیسے آخر کب تک بھیجے جائے رہیں گے۔ نیز یہ کہ تم ۱۹۰۳ء میں گئے تھے، اب تک تم نے کیا کیا ہے۔ اس روکھے اور احمقانہ جواب پر انہیں رنج بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ اس موقع پر انہوں نے ایک درد بھرا خط بھائی کو لکھا۔ ۳۔ جنوری ۱۹۰۸ء کے اس خط کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں :

”تمہاری شکایتوں کے جواب کیا دوں۔ تم لوگ اگر سوچو تو ان کا خود ہی جواب پیدا کر سکتے ہو۔ اگر نہ سوچو اور سمجھو تو میرے جوابات یہی تم کو تشفی نہیں دے سکیں گے۔۔۔۔۔ تم کو اگر غیروں نے فرضاً تکلیفیں دی ہیں تو ان کی اس میں غرض تھی یا فائدہ تھا لیکن تم نے مجھ کو جو پریشانیاں دی ہیں اس کا کیا جواب ہے۔۔۔۔۔ جب میں ہندوستان میں تھا تو تم اس قدر قیاض بن گئے کہ میرے اغراجات کا بوجھ خواہ غواء اپنے سر لے لیا اور اس کے بعد جس طرح تم نے اپنا وعدہ نبھایا وہ خدا ہی جانتا ہے۔ تم پر جو ہلائیں آئیں وہ تمہارے ناسپرہان بھائیوں کے طفیل لیکن میری مصیبتیں میرے سہریان بھائیوں کی وجہ سے ہیں۔ ہر حال میری وہی کیفیت ہے ”سردہ ہست زندہ“۔ جب تمہارا جی چاہے مجھ کو خرچ بھیج دو اور پھر لطف یہ کہ احسان کا احسان شکایت کی شکایت۔۔۔۔۔۔۔ تمہیں اگر باپ کے کفن کی شرم ہو، تمہیں اگر بھائی کا درد ہوتا تو تم سمجھتے کہ آخر میں جو رلا رلا کر خرچ بھیج رہا ہوں تو وہ کمبخت لندن میں کس طرح گزارا کر رہا ہو گا۔ وہ اکیلا ہی نہیں ہے، اس کے ساتھ ایک اور تحفہ عات بھی ہے۔ آخر کار اس پر کچھ نہ کچھ خرچ آتا ہے۔ تمہاری اس دینہ دلیری کا کیا علاج کہ میں جو تم کو لکھوں اس کو چھوٹ مانو، بیہودہ سمجھو اور پھر کہے جاؤ کہ اس قدر خرچ ہو گیا۔ آپ کو اپنی سعادت مندی

اور ہوا کی تابعداری کا خیال میرے ہی معاملے میں آتا ہے۔ والد کے انتقال کے بعد اب تک آپ نے جو فیاضی میرے ساتھ کی ہے وہ میرے حق سے زیادہ نہیں کی.....
 بھارا صرف ایک اصول ہے کہ روپیہ کھایا جائے لیکن کس طرح اور کیوں کر؟ اس سے بحث نہیں۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس کے لیے بھی لیاقت ذاتی اور لیاقت علم دوکر ہے۔
 سمجھیں اگر علم اور لیاقت سے لغت ہے تو ہو لیکن دوسرے جو اس کی طرف متوجہ ہیں ان کو کیوں روکتے ہو.....
 سمجھیں اگر مشہود کی تعلیم میں دلچسپی نہیں تو مجھے تو ہے۔
 لونگ میں رہ کر وہ بھی تباہ ہوتا۔ اس کے واسطے سمجھیں اور بوا کو دو ہونڈ ماہوار بھی گران گزرتے ہیں، اگرچہ یہ لندن ہی کا خرچ کیوں نہ ہو.....
 میں اس وقت تک ستر ہونڈ کا فرخدار ہوں۔ اس کے علاوہ تین ماہ اور مجھ کو اپنے امتحان میں لکھیں گے۔
 ان تین مہینوں کا خرچ ۸۸ ہونڈ ہو گا۔ علاوہ ازیں ۶ ہونڈ مجھ کو پیرسٹری کی ڈگری ملنے پر ادا کرنے ہوں گے۔
 الغرض کاہم پیرسٹر ہونے تک مجھ کو ۱۷۸ ہونڈ پہنچنا چاہییں۔
 یاد رکھو ۱۷۸ ہونڈ۔ اس رقم سے گریز نہیں، خواہ میں رؤوں اور خواہ تم۔ یہ رقمیں ضروری ہیں، سمجھیں بھیجنا ہوں گی اور اگر نہیں بھیجو تو ہمیں اپنی تقدیروں پر چھوڑ دو۔“

یہ ان کا آخری خط تھا، کیوں کہ مسعود خان نے اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

گھر کی طرف سے مایوس ہو کر وہ تفکرات میں گھر گئے۔ ایک طرف قرضے کی تشویش، دوسری جانب مزید خرچ کی ضرورت۔ ایسے میں تعلیم کسے یاد رہتی۔ کچھ عرصہ لیڈ لیڈی کی سہربانی سے گزر اوقات ہوئی، آخر ایک دن پریشان ہو کر گھر سے نکلے اور ہلا متصد شہر گردی کرنے لگے۔ ایک کباڑے کی دوکان پر کھڑے ہو کر برائی کتابوں پر نظم ڈالنا شروع کی۔ اچانک انہیں کوئی قیمتی کتاب

خستہ حالت میں دکھائی دی۔ قیمت دریافت کی تو نہایت معمولی۔ اتفاق سے جیب میں اتنے ہی دام تھے ! کتاب لے کر پرانی چیزوں کا کاروبار کرنے والی مشہور فرم لوزک اینڈ کمپنی کے ہاں پہنچے۔ انہوں نے بڑی خوشی سے وہ کتاب کئی ہونڈ میں خرید لی۔ یہ واقعہ لوزک اینڈ کمپنی والوں سے ان کے تعارف کا سبب ہوا۔ یہ فرم ۴۶۔ گریٹ ویل سٹریٹ پر برٹش میوزیم کے بالمقابل واقع تھی اور آج بھی وہیں موجود ہے۔

اب وہ پرانی کتابوں پر نظر رکھنے لگے اور ساتھ ساتھ ترجمہ کرنے اور طلباء کو پڑھانے کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ زیادہ تر پروفیسر آرنلڈ ترجمہ کرنے کے لیے مواد مہیا کرتے۔ علاوہ ازیں انہیں ایک لائبریری کی فہرست کتب تیار کرنے کا کام بھی مل گیا۔ اس طرح ان کا گزارا بہ خوبی ہونے لگا اور انہوں نے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری میں اسلامی تاریخ پر تحقیق شروع کی۔ یہ اس قسم کا علم تھا جس کے حصول کی آرزو انہیں مدت سے تھی۔ انہیں دنوں انہوں نے بین اسلامک سوسائٹی کے لیے ایک لائبریری کی بنیاد رکھی اور چھ سال کی لگاتار کوشش سے دو ہزار کم یاب اور نایاب کتابیں جمع کیں۔ اس لائبریری کا مختصر حال ”لندن لائبریریز ۱۹۰۹ء“ میں درج ہے۔

۱۹۰۹ء میں وہ لندن یونیورسٹی کے ایک فارسی کے امتحان میں اول آئے اور اس بنیاد پر انہیں ”آؤزلے اسکالرشپ“ دیا گیا جس سے انہوں نے پروفیسر ٹی۔ ڈیبلو آرنلڈ کی براہ راست رہنمائی میں ایک سال تک عربی زبان کا مطالعہ کیا۔ اس وقت تک لوزک اینڈ کمپنی والے عنقیات کے کاروبار میں ان کی افادیت کے قائل ہو چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے انہیں معقول معاشرے پر ملازم رکھ لیا۔ ۱۹۱۰ء میں انہوں نے ڈاکٹر ہنری اسٹب کی کتاب ”طلوع و غروب اسلام“ کم ناس کے پردوں سے نکال کر مرتب کی اور اس میں ایک ضمیمہ شامل کر کے لوزک اینڈ کمپنی کے ذریعے شائع کی۔ اس کی اشاعت میں بہت سے مسلمانوں، اسلام سے دل چسپی رکھنے والے لوگوں اور اداروں نے مالی

معاونت کی۔ ایسے اکتالیس ناموں کی ایک فہرست کتاب کی ابتدا میں دی گئی ہے۔ ان میں نواب عہد الملک سید حسین بلگرامی، مشیر حسین قدوائی، سید امیر علی اور پروفیسر آرنلڈ کے نام بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب جو ڈھائی سو سال تک مسودے کی شکل میں رہنے کے بعد حافظ صاحب کی مساعی سے طبع ہوئی، اسلام سے متعلق عیسائی فضلاء کی کتابوں میں نہایت اہم مقام رکھتی ہے۔ اس کے دیباچے میں حافظ صاحب لکھتے ہیں :

”یہ کتاب ہمیں اسلام کے متعلق برائے نظریات سے واقف ہونے کا بڑا نادر موقع مہیا کرتی ہے۔ گو ان تصورات کی دھجیاں اڑ چکی ہیں، تاہم آج بھی مغربی تصانیف پر ان کا گہرا اثر موجود ہے۔ اس غرض سے کتاب میں ایک ضمیمے کا اضافہ کیا گیا ہے جس سے امید ہے موضوع پر مزید روشنی پڑے گی۔ اگر اس تصنیف کے منظر عام پر آنے سے انگریزی زبان میں مطالعہ اسلام کے فروغ کے لیے سرگرمی کی اشد ضرورت مسلمانوں کے ذہن نشین ہوگئی تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری محنت ٹھکانے لگی۔ اس موضوع سے لا برواہی کے نتیجے میں وہ جس افسوس ناک رسوائی کا شکار ہوئے ہیں، اس کے بیان کرنے کی چنداں حاجت نہیں۔ ہمیں یہ مرکز فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ مغرب سے بہت سی چیزیں حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں اسلام کا حقیقی منشا اور اس کے عقائد بھی اے سکھانے ہیں۔ ایسے لوگ بیسویں صدی میں بھی موجود ہیں جو انتہائی متانت کے ساتھ انکشاف کرتے ہیں کہ مسلمان نجد نامی ایک ہرست کے برستار ہیں۔“

در اصل اس کتاب کی اشاعت بین الاقوامی سوسائٹی والے سلسلے ہی کی ایک کڑی تھی۔ اس کا ایک اور پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ یہ حافظ صاحب کا واحد کام ہے جو انگریزی میں انجام دیا گیا۔

اسی طرح ۱۹۱۳ء کی ابتدا تک وہ ملازمت کے ساتھ ساتھ لندن کے گراں قدر کتب خانوں سے استفادہ کرتے رہے۔ اس عرصے میں ان کے

ہاس کافی روپیہ بھی جمع ہو گیا۔ اس وقت اگر وہ چاہتے تو اپنی قانون کی تعلیم مکمل کر سکتے تھے لیکن انہوں نے دوبارہ اس طرف توجہ نہ کی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ طبی طور پر اسے پسند نہ کرتے تھے اور صرف والد کے حکم کی تعمیل میں اس میں داخل ہوئے تھے، اور اب تو انہیں علمی جستجو کا چسکا بھی پڑ چکا تھا۔ چنانچہ کبھی کبھی کہتا کرتے تھے کہ خدا نے عین وقت پر بھالیا۔

۱۹۱۲ء میں لوزک اینڈ کمپنی نے یہ پروگرام بنایا کہ حافظ صاحب ان کے خرچ پر ہندوستان جائیں اور وہاں سے برائی چیزیں یعنی کتابیں، سکے، ہتھیار، تصویریں، سورتیاں وغیرہ روانہ کیا کریں۔ اس وقت ان کی تنخواہ اسی ہونڈ ماہوار تھی۔ ملے یہ پایا کہ یہی تنخواہ جاری رہے گی اور برائی چیزوں کی خرید پر جو صرفہ ہوگا وہ انہیں برابر ملتا رہے گا۔ کمپنی والوں کو یہ تشویش تھی کہ کہیں یہ شخص ہندوستان جا کر ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ اس کا علاج انہوں نے یہ سوچا کہ انہیں ایک برائے نام رقم کے عوض کمپنی میں حصہ دار بنا لیا جائے۔ اس غرض سے حافظ صاحب نے سات سو ہونڈ یہ ذریعہ چیک بن کو ادا کیے جس کی رسید ۳۔ فروری ۱۹۱۳ء کی نوشتہ موجود ہے۔ بتایا ایک ہزار ہونڈ انہوں نے مشہود خان کے نام کیے اور اسی سال موسم بہار میں ٹونک چلے آئے۔

ٹونک پہنچ کر وہ برائی اشیاء کی فراہمی میں مصروف ہو گئے اور روانہ بھی کرتے لگے۔ مثلاً ۱۷۔ جولائی کو لندن سے کمپنی کے منتظم حصہ دار مسٹر جے۔ ایچ۔ رینز نے جو خط لکھا ہے اس میں ان کی روانہ کی ہوئی چیزوں کی رسید اور بعض کی فروخت کی اطلاع ہے۔ مثلاً دیوان حافظ کے قلمی نسخے کا ایک ورق سات ہونڈ میں فروخت ہوا اور شاہ ناسے کا ایک پرانا نسخہ تیس ہونڈ میں گیا۔ لیکن ان چیزوں میں زیادہ تعداد سورتیوں کی تھی۔ اس خط کے آخر میں یہ بھی استفسار ہے کہ آپ نے بتلوق کا لائسنس بتوا لیا ہے یا نہیں۔ یہ غالباً اس لیے کہ لائسنس بننے پر کمپنی کو وہاں سے حافظ صاحب کے لیے بتلوق روانہ کرنی تھی۔

اس کے بعد آٹھ اگست کے خط میں لکھا ہے کہ آپ کا تار موصول ہوا۔ ۱۰۔ ہونٹ (۱۰۵۰ روپے) بذریعہ تار نیشنل بینک آف انڈیا کی معرفت روانہ کر دیے ہیں۔ اگلے ہفتے اتنے ہی اور روانہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس کے ساتھ معاہدے کی ایک نقل روانہ کرنے کا ذکر بھی موجود ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ میں اکتوبر ۱۹۱۳ء سے قبل ہندوستان نہیں آ سکتا۔

برائی اشیا روانہ کرنے کا یہ سلسلہ پہلی عالم گیر جنگ کی ابتدا تک جاری رہا۔ ان چیزوں کی تلاش میں انہوں نے دور دور تک چکر لگا کر؛ خصوصاً راجپوتانہ میں وہ خوب پھرے۔ اجمیر، جودھ پور، جے پور، چنؤ، رتھمبھور اور مند سور وغیرہ کے برائے شہر اور قلعے چھان مارے۔ ٹونک شہر اور ارد گرد کے دیہات میں جانے کی خاطر تانگا رکھ لیا۔ اس ٹانگے میں جو برائے زمانے کی رتھ کی ترقی یافتہ شکل تھی، بیل جوئے جاتے تھے۔ ٹونک میں اس کا بہت رواج تھا۔ شرفا ایک دوسرے کے مقابلے میں عمدہ سے عمدہ جوڑیاں تلاش کرتے اور بہتر سے بہتر ٹانگے بنواتے۔ ہلکا پھلکا ہونے کی وجہ سے بیل خوب تیز دوڑا کرتے تھے۔ اندر گدیلمے پر گاؤں تکیہ لگا ہوتا۔ مسطورات کے لیے نہایت آسانی سے باہر دے بھی کیا جاسکتا تھا۔ ہندوؤں کا لائسنس بن چکا تھا اور اس سیر و سیاحت کے ساتھ ساتھ وہ اپنا شکر کا شوق بھی پورا کرتے تھے۔

جنگ چھڑنے کے بعد سمندری راستے محفوظ نہ رہے، ڈاک کا نظام درہم برہم ہو گیا؛ چنانچہ یہاں سے آثار قدیمہ روانہ کرنے کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور وہاں سے رقم آنا بھی ممکن نہ رہا۔

۲۲۔ دسمبر ۱۹۱۳ء کو ان کا دوسرا بچہ حامد پیدا ہوا۔ اس کے انہوں نے بہت سے تاریخی نام نکالے جو ان کے اپنے لہم سے ایک کتاب میں درج ہیں۔ بلکہ حامد بھی ایک دل چسپ طریقے سے تاریخی نام ہے۔ اس کی تفصیل انہوں نے اس طرح لکھی ہے:

$$\left. \begin{aligned} \text{حامد} &= ۳ \times ۴ \times ۵ \times ۶ = ۳۶۰ \times ۱ \times ۸ = ۱۲۸۰ \\ \text{حامد} &= ۳ + ۴ + ۵ + ۶ = ۱۸ + ۱ = ۱۹ \end{aligned} \right\} + ۵۳ = ۱۳۳۳$$

لیکن یہ بچہ ۲۸ - مارچ ۱۹۱۵ء کو فوت ہو گیا ۔

کام کی طرف سے بے فکر ہو کر وہ شکار ہی کے ہو گئے ۔ گاڑی بان اور دو ایک ملازموں کے ہمراہ نانکھ لے کر نکل جانے اور کئی کئی دن غائب رہنے ۔ دو چوڑیاں پیالوں کی تھیں جو باری باری جوتی جاتی رہیں ۔ دوستوں کے معاملے میں وہ پہلے سے بھی زیادہ محتاط تھے ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بھائیوں سے براہِ راز یوسف کا سا سلوک دیکھ کر وہ مردم گزیدہ ہو گئے تھے ۔ یہ آدم بیزاری تمام عمر ان کے مزاج میں رہی ۔ اس کا اندازہ ان کے سب جائے والوں کو تھا ۔ چنانچہ ان کے دوست سید محمد عمر حسنی ۱۹۳۰ء میں اختر صاحب کے نام ایک خط میں رسالہ ”خیالستان“ کے متعلق اظہارِ رائے کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”رسالہ ماشاء اللہ بہت دل چسپ ہے ۔ خدا سمجھاری عمر میں ہرکت دے اور والد کی سی لیاقت ، مگر ویسی مردم بیزاری نہ ہو ۔“

اس دور میں ٹونک میں موجود لوگوں میں ان کے کھرمے دوستانہ تعلقات صرف دو آدمیوں سے تھے ۔ ایک وہاں کے ہسپتال کے اہارج ڈاکٹر ڈیسانی ، دوسرے وکیل احمد علی صاحب ۔ ریاستوں میں قاعدہ تھا کہ لگان کی وصولی کے غمضے سے بچات ہانے کی خاطر دیہات کو مختلف مدتوں کے لیے ٹھیکے پر دے دیا جاتا تھا ۔ یہ طریقہ اجارہ داری کہلاتا تھا ۔ وکیل احمد علی صاحب نے ایک گاؤں بھائی اجارے پر لے رکھا تھا ۔ یہ ٹونک سے کوئی دس میل دور دریائے بناس کے پار واقع تھا ۔ حافظ صاحب نے اس گاؤں کو شکار کی خاطر مرکزی مقام قرار دیا اور یہاں ایک مختصر سا کچا مکین بنوا لیا جو دیہاتی عوام میں بابو جی کا پتنگہ کہلاتا تھا ۔ ہندوؤں کے علاوہ بھیلی کا شکار بھی بناس میں خوب ملتا تھا ۔ کبھی کبھی گھر بھی چکر لگا جاتے ۔ جنگ غیر معمولی طوالت اختیار کرتی جا رہی تھی ۔ یہاں آمدنی کی کوئی صورت نہ تھی ، اور پھر شکار کے اخراجات ۔ آخر ولایت بھجمنے کے لیے جو برائی چیزیں جمع تھیں ان کو آہستہ آہستہ فروخت کرنا شروع کیا ۔

۱۲ - ستمبر ۱۹۲۷ء کو ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا ۔ وفات سے

چند دن پہلے یعنی یکم ستمبر کو انھوں نے اپنے تمام زیورات جو کافی

حالت کے تھے، ایک سریری دستاویز کے ذریعے حافظ صاحب کو عنایت کر دے، کیوں کہ ایک تو وہ والد کی وراثت سے ان کی محرومی سے متاثر تھیں، دوسرے مشہود خان کے اخراجات کی گراں باری بھی انہیں ہر تھیں۔ مشہود خان کو وہ بہت دیر بعد تک ایسے بھجوتے رہے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے کی غالباً آخری کڑی مورخہ ۱۱۔ دسمبر ۱۹۳۳ء کو لاہور کے سنٹرل بینک آف انڈیا کے ذریعے بھیجا ہوا اسی بوقت کا ایک ڈالٹ ہے۔

۱۹۱۷ء کے موسم سرما میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی۔ شدت اتنی تھی کہ شہر و دیہات کوئی بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے۔ انہوں نے ایک بڑا ڈیرہ خرید لیا۔ شکازی تنبو ان کے پاس پہلے ہی تھا۔ ڈاکٹر ڈیسائی کے مشورے سے بھانگی سے چند میل ہٹ کر دریا کے بیچوں بیچ رہتی ہر ڈیرہ لگایا۔ یہاں وہ ٹونک میں موجود تمام اقربا کو لے گئے اور کوئی تین ماہ تک وہاں ٹھہرنے کے بعد بیماری کا زور ٹوٹنے پر واپس لائے۔ اس دوران میں زیادہ تر پھل کا شکر مرکز توجہ رہا کیونکہ چرند و برند بھی طاعون کی زد سے محفوظ نہ تھے۔ ٹونک کے بناس کی رہتی کے غریبوں سے ہندوستان میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ اس سال انہوں نے اپنے ملازموں سے غریبوں کی بازی بھی لکوائی۔ یہ شوق ان کی زندگی کے آخری دنوں میں بہت بڑھ گیا تھا۔

۱۹۱۸ء میں ٹونک کے ہولشیکل ایجنٹ ہالینس صاحب تھے۔ ایجنٹی ہنگامہ ایک پہاڑی ہر مہندی باغ کے ساتھ ہی واقع تھا۔ مسٹر ہالینس کو فارسی بڑھنے کا شوق چرایا۔ ڈاکٹر ڈیسائی نے اس غرض سے حافظ صاحب کا تعارف ان سے کرا دیا۔ یہ خوش ہوئے کہ اپنے مذاق کا آدمی مل گیا۔ چنانچہ ہفتے میں دو بار ہلماواشہ انہیں بڑھانے جایا کرتے۔ رہاستی حلقوں میں ان کی اس ملاقات کو پسندیدہ نظروں سے نہ دیکھا گیا کیوں کہ نواب محمد علی خان کی معزولی کے بعد سے انگریزوں اور ان کے ایجنٹوں کو مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ خود حافظ صاحب کی لندن سے خط و کتابت ان کے لیے وسوسوں سے خالی نہ تھی، چہ جائے کہ ایجنٹ سے ہفتے میں دو بار ان کی میٹنگ ہوتی۔

تدریس کا یہ سلسلہ کوئی سال بھر ہالینس صاحب کے تبادلے تک برابر جاری رہا ۔

۱۶۔ ستمبر ۱۹۱۸ء کو ان کے ہاں ایک بھی پیدا ہوئی جس نے نو دس سال عمر پا کر لاہور میں انتقال کیا ۔ اگلے سال بھر ایک بھی ہوئی لیکن چند ماہ بعد ہی فوت ہو گئی ۔

۱۹۱۹ء میں ریاست میں نواب ابراہیم علی خان کے خلاف ایک سازش کا انکشاف ہوا ۔ مجتہد طور پر اس کے سرغنہ خود ولی عہد ریاست فیروز جنگ بہادر تھے ۔ مقصد یہ تھا کہ نواب ابراہیم علی خان کو جو بہت بوڑھے ہو چکے ہیں ، گدی سے اتار کر قبل از وقت ان کی جگہ لے لیں ۔ معاملہ منکشف ہونے ہی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی ۔ جس شخص پر معمولی سا شبہ بھی ہوتا ، گرفتار کر لیا جاتا ۔ حافظ صاحب تو پرانے مشکوک تھے ، چنانچہ ان کی گرفتاری کے احکام بھی جاری ہو گئے ۔ ان کے لوشنوں کو بھی خبر نہ تھی ۔ اس وقت کئی دن کے بعد شکر سے ٹھکے ماندے آئے تھے ۔ کھانا کھانے بیٹھے ہی تھے کہ کسی نے آکر وارنٹ کے اجرا کی خبر سنائی ، بڑے پریشان ہوئے ۔ بے گناہی ثابت کرنے کا موقع نہ تھا ۔ دسترخوان سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک ملازم عظیم الدین کو ساتھ لے کر نکل گئے ۔ پہلے ہالینس صاحب کے پاس اٹھ آباد پہنچے ۔ چند دن وہاں ٹھہرے ، پھر تفحص حال کے لیے عظیم الدین کو ٹونک بھجوا اور آب ڈھانی چلے گئے ۔ ایک مقررہ دن ٹونک کی طرف روانہ ہوئے ۔ خیال تھا کہ اب تک معاملہ ٹھنڈا پڑ چکا ہوگا لیکن بھلیرا جنکشن پر عظیم الدین آسلا اور بتلایا کہ آپ کی تلاش بڑی سرگرمی سے جاری ہے ؛ چنانچہ وہیں سے مارواڑ لوٹ آئے ۔

ابا صاحب مرحوم نے مشہود خان کے علاوہ تمام بیٹوں کی شادیاں ڈھانی شیرانیاں ہی میں کی تھیں ۔ ان کے انتقال کے بعد حافظ صاحب اور مودود خان کے علاوہ چاروں بھائیوں نے اپنی پسند کی شادیاں کیں ۔ ان میں موصود خان مزاج کے بڑے تیز تھے ۔ انھوں نے ”مہ والائے سم یہ کیا کہ پہلی سیکم کو جواب دے دیا ۔ وہ واپس

اپنے گھر چلی گئیں۔ اس بات کا پہلے والوں نے بہت برا مانا۔ بعض نے یہاں تک کہا کہ آٹھ۔ نو لاکھ والے یہاں آنے اور رشتہ لینے کا نام نہ لیں۔ جب حافظ صاحب وہاں پہنچے، پہلے کے سرکردہ لوگوں نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حافظ صاحب نے خود ان غائبوں سے عقد کر لیا۔ ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔

مارواڑ میں بھی انہیں ایک عزیز کی بددوق مل گئی جس سے شکار کا مشغلہ جاری رہا، لیکن اس وقت مالی لحاظ سے ان کا ہاتھ بہت تنگ تھا۔ اس کے علاوہ مستقبل کی فکر بھی پریشان کر رہی تھی۔ ارادہ کیا کہ بھوپال جا کر کوئی گاؤں اجاڑے ہر لیں لیکن اس کے لیے روپیہ درکار تھا۔ جنگ کے شعلے سرد پڑ چکے تھے۔ لوزک اینڈ کمپنی کو اپنے حصے میں سے کچھ رقم بھیجنے کے لیے لکھا۔ ادھر ٹونک اپنے گھر پیغام بھیجا کہ ”دیوان آفتاب“ اور اس کے ساتھ کی ایک اور کتاب بارہ سو روپے کے عوض فلاں شخص کے حوالے کر دیں۔ ۱۹۲۰ء کے موسم بہار میں لندن سے ڈرافٹ پہنچ گیا۔ اس کی رقم وصول کرنے کے لیے انہیں اجیمیر جانا پڑا۔ اجیمیر ہی سے سینڈے بھوپال روانہ ہو گئے۔ عظیم الدین ہمراہ تھا۔ سادات ٹونک کے بعض کھرانے بھی جو سازش کے سلسلے میں جلا وطن کیے گئے تھے، بھوپال میں مقیم تھے؟ یہ انہی کے ہاں جا کر ٹھہرے۔ کوئی سپینڈ ڈپڑ سپینڈ وہاں کے علاقے دیکھنے اور شکار کھینچے پھرے۔ شکار کے لیے بددوقوں کے علاوہ سواوی کے تانکے کا انتظام میزبانوں کی جانب سے کیا گیا تھا۔ غرض وادی چمپل کے جنگل انہیں بہت پسند آئے۔ وہاں کے شکار کے بڑے دل چسپ واقعات سنایا کرتے تھے۔

بالآخر انہوں نے بھوپال میں آباد ہونے کا ارادہ کر لیا اور مارواڑ واپس ہوئے۔ ٹونک اپنے گھر اطلاع بھیج دی کہ وہ لوگ بھی مارواڑ چلے آئیں تا کہ بھوپال جانے سے پہلے کچھ دن عزیزوں میں گزار سکیں۔ چنانچہ چند دن بعد وہ آ پہنچے۔ اختر صاحب کی عمر اس وقت پندرہ برس کی تھی۔ ٹونک میں ان کی تعلیم وہی پرانے انداز میں ہوتی ہی۔ اب حافظ صاحب کو خیال آیا کہ بھوپال جانے سے پہلے انہیں

لاہور اور نیشنل کالج میں داخل کروا آئیں۔ اس غرض سے وہ انہیں لے کر ستمبر ۱۹۲۱ء میں لاہور پہنچے۔ داخلے سے فارغ ہو کر واپس جا رہے تھے تو وہ اپنے برائے دوستوں سے ملائے ہوئے۔ ان میں شیخ عبدالقادر بھی تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ حافظ صاحب اپنی گونا گوں صلاحیتوں کے باوجود اب تک بے کار ہیں تو انہوں نے ان کے لیے کوئی جگہ نکالنے کا وعدہ کیا؛ چنانچہ وہ واپسی کے کچھ ہی دن بعد ان کو اسلامیہ کالج لاہور میں بطور لکچرار تقرری کی چٹھی روانہ کی گئی جو اتفاق سے ان تک نہ پہنچ سکی۔ پھر شیخ صاحب کا خط ملا کہ آپ کے آنے میں تاخیر کا کیا سبب ہے۔ یہ اطلاع ملنے پر وہ دسمبر ۱۹۲۱ء کے وسط میں لاہور پہنچے اور اوائل جنوری ۱۹۲۲ء سے ان کی ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے ۱۹۲۳ء کی تعطیلات موسم گرما تک قلعہ کوہر سنگھ کے ایک مکان میں قیام کیا، بعد ازاں چھ ماہ میوہ منڈی کے ایک گھر میں رہے اور اس کے بعد ۱۸۔ نائینگ روڈ پر چلے آئے جہاں وہ ملازمت سے سبک دوش ہوئے تک قیام پذیر رہے۔ ۱۹۲۳ء سے وہ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں مارواڑ چلے جاتے اور وہاں کی برسات میں سیر و شکار سے لطف اندوز ہوتے۔ البتہ ۱۹۳۷ء سے وہ مارواڑ کی پچائے ٹونک جانے لگے کہیں کہیں رہنا اثر ہونے کے بعد وہیں رہنے کا ارادہ تھا۔

یہ ملازمت حافظ صاحب کی دل پسند تھی۔ اب وہ ہر طرف سے بے نیاز ہو کر علم کی خدمت پر کمر بستہ ہو گئے اور ان کا زیادہ وقت تحقیق و تنقید پر صرف ہونے لگا یا پھر برائی کتابیں، سکے اور دوسری قدیم اشیاء جمع کرنے پر۔ ان چیزوں کے لیے انہوں نے بڑی دور دور کے سفر کیے۔ ایک شکار کا شوق تھا کہ ان علمی مشاغل کے ساتھ ساتھ قائم رہا۔ اس سے وہ اپنی دماغی کاوشوں کی تھکن اتارا کرتے تھے۔ ملازمت کے بعد سے شکار کا زیادہ موقع انہیں گرمیوں کی چھٹیوں ہی میں میسر آتا، تاہم لاہور میں بھی کبھی کبھی راوی کے کنارے پہنچ جاتے جہاں ان دنوں کالی شکار ہوتا تھا۔

ان کے تحقیق اور تنقیدی مضامین ۱۹۲۰ء سے رسالہ ”بخون“ اور ۱۹۲۱ء

ہے رسالہ ”اردو“ میں شائع ہونے لگے۔ ابتدا میں ذیلی، قابوس نامہ، فردوسی اور شاہنامہ سے متعلق مضامین لکھے گئے۔ پھر شعرا المعجم کی تنقید شروع ہوئی۔ تنقید کا یہ قبی انداز ہندوستان کے لیے بالکل نیا تھا۔ ان مضامین نے پورے ملک میں دھوم مچا دی! ان کے متعلق چند سربزآوردہ لوگوں کی آرا پیش کرنا یہاں بے موقع نہ ہوگا۔

نواب محمد الملک سید حسین ہنگرامی نے مولوی عبدالحق صاحب کے نام ۲۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء کے خط میں لکھا :

”میں سمجھتا تھا کہ میں کسی قدر فارسی جانتا ہوں مگر شعرا المعجم کی تنقید پڑھ کر مجھے معلوم ہوا کہ میں فارسی مطلق نہیں جانتا۔ کسی قدر عالمانہ و عارفانہ تنقید ہے۔“

مولوی عبدالحق صاحب نے ۲۹۔ نومبر کے خط میں حافظ صاحب کو تحریر کیا :

”حقیقت یہ ہے کہ آپ کی کاوش و جستجو اور تنقید ہر طرح قابل تحسین اور لائق قدر ہے۔ یہ مضامین اردو زبان میں بالکل نئے ہیں اور جو ڈھنگ آپ نے تنقید کا اختیار فرمایا ہے، اس سے ہمارے ہاں کے انشا پرداز اور ادیب بالکل ناواقف ہیں۔“

نواب حبیب الرحمان خان شروانی :

”اس مقالے (فردوسی کی ہجو محمود) کے لکھنے والے کے ہاتھ چوم لینے چاہیے۔“

مولوی وحید الدین سلیم پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی :

آپ کے دو مقالوں (محمود کی ہجو اور فردوسی کی یوسف زلیخا) نے مجھے آپ کا گرویدہ بنا دیا ہے۔ ان مضامین کی مناسب تعریف کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ کلاں کہ ان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے حالی ہائی ہی زندہ ہونے۔

اورینٹل کالج میگزین میں مضامین کا سلیبلہ ۱۹۲۵ء میں شروع ہوا۔ اسی زمانے میں ان کی توجہ فارسی ادب کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی

طرف مہذول ہوئی اور جلد ہی عبداللہ یوسف علی صاحب کی فرمائش پر انہوں نے ”پنجاب میں اردو“ جیسی محرکہ آرا کتاب سپرد قلم کی۔ یہ کتاب ۱۹۲۸ء میں اسلامیہ کالج کی لجنہ اردو کی جانب سے شائع کی گئی۔

۱۹۲۷ء میں انہوں نے یورپ میں فارسی زبان کے مطالعہ خصوصی کے لیے پنجاب گورنمنٹ کے ایک وظیفے کی خاطر درخواست دی، لیکن انہیں اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو ان کی عمر کی زیادتی تھی، دوسرے وہ پہلے ہی ایک طویل عرصے تک انگلستان میں رہ چکے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں پنجاب یونیورسٹی میں ایک اردو کے لیکچرار کی اساسی ترقی کی گئی۔ مئی میں انہوں نے اس کے لیے درخواست دی۔ ادھر انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی میں اردو و فارسی لیکچرار کی اساسی کے لیے بھی درخواست دے رکھی تھی۔ ستمبر میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں ان کا تقرر ہو گیا، لیکن اسی عرصے میں انہیں لاہور میں کامیابی کی آسید ہو چکی تھی، اس لیے انہوں نے ڈھاکہ جانے سے انکار کر دیا۔ وہ لاہور چھوڑنا نہ چاہتے تھے اور اسی وجہ سے اس سے پہلے دو بار عثمانیہ یونیورسٹی کی پیش کش ٹھکرا چکے تھے۔ آخر ان کی خواہش کے مطابق یکم اکتوبر ۱۹۲۸ء کو ان کا تقرر پنجاب یونیورسٹی میں ہو گیا۔

مئی ۱۹۲۸ء میں پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی جانب سے انہیں دو ہزار روپے کے عوض ڈپلومہ۔ ٹی۔ وورٹائیٹ کی عربی انگریزی لغات کا اردو ترجمہ کرنے کی پیش کش کی گئی، لیکن یہ کام دسمبر تک ختم کرنا ضروری تھا اور وہ اس کی خاطر اپنی دوسری مصروفیتوں کو بالائے طاق نہ رکھ سکتے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے ان کو ”پنجاب میں اردو“ پر ایک ہزار روپیہ انعام دیا۔ علاوہ ازیں بیرون پنجاب کی بعض یونیورسٹیوں اور لجنوں نے بھی انہیں انعام سے نوازا۔

یونیورسٹی میں ان کا تقرر بطور اردو زبان کے استاد کے ہوا تھا اس لیے ان کی توجہ زیادہ سے زیادہ اردو زبان اور اس کے

ارتقا پر مرکوز ہوتی گئی اور ان کے مضامین کافی باقاعدگی سے 'اورینٹل کالج میگزین' میں شائع ہوتے رہے۔ اودو زبان سے متعلق مضامین کے علاوہ ان کی پروفیسر جے حبیب کے "ترجمہ خزائن الفتوح" چند بردائی کی "برنہی راج راسا" اور مولانا آزاد کی "آب حیات" پر تنقیدی بڑے پائے کی چیزیں ہیں۔ علم عروض، مسکوکات، کتب نصاب اور تفسیر وغیرہ کے متعلق بھی انہوں نے مضامین مہر قلم کیے۔

لوژک اینڈ کمپنی سے ان کا معاہدہ ۱۹۳۰ء میں ختم ہو گیا اور ان کی باقی ماندہ رقم کمپنی نے لندن سے روانہ کر دی۔

۱۹۳۳ء میں انہوں نے میر تقی میر کی "مجموعہ نثر" کی ترقیب مکمل کی جو اس سال یونیورسٹی نے شائع کی۔ اپریل ۱۹۳۴ء میں لاہور میں ادارہ معارف اسلامیہ کا اجلاس ہوا جس میں انہوں نے بچوں کے تعلیمی نصاب سے متعلق اپنا مقالہ پیش کیا۔ ادارے کے کاموں میں وہ ایک عام کارکن کی طرح شریک ہوتے۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں ادارے کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا جس میں انہوں نے 'مثنوی عروۃ الوثقی' پر ایک مضمون پیش کیا۔

لاہور میں ان کی عادت کے مطابق قریبی دوستوں کا دائرہ وسیع نہ تھا۔ دوستوں میں پروفیسر شیخ جہا اقبال صاحب اور پروفیسر جہا فضل الدین قریشی صاحب کے نام سر فہرست ہیں۔ سر شیخ عبدالقادر، میان عبدالعزیز بیرسٹرا، لاء اور علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب سے ولایت کی واقفیت تھی۔ سر اقبال سے بھی لندن میں ہی ملے تھے۔ وہ ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور ان کی علمیت کے مداح تھے۔ میرے پاس اسے رکھے موجود ہیں جن میں اقبال مرحوم نے ان سے بعض فارسی کتابوں یا الفاظ کے متعلق استفسار کیے ہیں۔ مولوی شفیق صاحب مرحوم تو خیر ان کے پرنسپل تھے لیکن بڑے قنودان بھی تھے۔ پروفیسر سید عبدالقادر سے بھی گہرے مراسم تھے۔ چھوٹوں میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب اور پروفیسر عبداللطیف تپش کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ لاہور سے باہر کے اصحاب میں خصوصیت کے

ساتھ مولوی عبدالحق صاحب مرحوم ، جناب قاضی عبدالودود صاحب ،
ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی ، پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی اور
پروفیسر ابراہیم ڈار صاحب مرحوم سے خط و کتابت ہوتی تھی ۔

حافظ صاحب انتہائی سادہ مزاج رکھتے تھے ۔ ولایت میں انہی سال
گزارنے اور اعلیٰ سوسائٹی میں رہنے کے باوجود ان میں بے حد انکسار
تھا ۔ لاہور میں عموماً فرش پر بیٹھ کر کلام کیا کرتے ۔ آخری عمر
میں بیماری کے باعث بلنگ پر بیٹھ کر کرتے لگے ۔ جب تک اسلامیہ کالج
(ریلوے روڈ) میں رہے ، پیدل کالج تک جاتے تھے ۔ جب اورینٹل کالج
پہنچے ، مکان سے دور ہونے کی وجہ سے ٹانگیں کا انتظام کرنا پڑا ۔
لیروز ٹانگیں والا روز صبح کالج لے جاتا اور چھٹی کے وقت واپس لے آتا ۔
صحت کی خرابی کی وجہ سے کھانے کے معاملے میں بہت محتاط تھے ۔ سادہ غذا
پسند کرتے تھے ۔ عموماً پتلے پتلے بھلکے شوربے میں بھگو کر کھایا
کرتے تھے لیکن دوسروں کو کھلانے کا بڑا شوق تھا ۔ دعوتوں کا
بڑے تکلف سے اہتمام کرتے تھے ۔ بھلوں سے بہت رغبت تھی ۔ ان کے
پسندیدہ بھل آم اور خربوزے تھے ۔ امرود ڈاکٹر کی ہدایت کی بنا پر
زیادہ استعمال کرتے لگے تھے ۔ ولایت میں انہوں نے بڑی ہاشیزہ زندگی
بسو کی ، دخت رز سے انتہائی نفرت تھی ۔ جن دنوں لندن میں سخت
سردی کے باعث بیمار ہوئے ، وجود ڈاکٹر کے اصرار کے اجتناب کیا ۔
ان کی اولاد میں ایک اختر صاحب (اختر شیرانی) زندہ بچے تھے ۔
ان سے کیا کچھ محبت نہ ہوگی لیکن جب ان کی مے نوشی کا علم ہوا ،
گھر کے دروازے ان پر بند کر دیے اور سوائے ان چند دنوں کے جب
انجمن ترقی اودو میں دونوں باپ بیٹے اکٹھے ہوتے ، جینے میں سامنے
نہ آنے دیا ۔

ولایت میں ذہنی پریشانیوں کے زمانے میں سگریٹ نوشی البتہ
شروع کر دی تھی ۔ بعد میں یہ عادت بڑھ گئی ۔ نظام ، عبداللہ
کیریوں سا بھر گولڈ فلیک استعمال کرتے تھے ۔ لاہور میں جب
ضیق النفس کے عارضے میں مبتلا ہوئے تو ہنگامت سگریٹ ترک

کردیا اور کچھ عرصہ بالکل نہیں بیا۔ پھر حقہ تیار ہوا۔ ونگلام اور دوسرے دور دراز مقامات سے خمیرے اور توام منگوائے۔ آخر اسے بھی ترک کر دیا۔ اب ہوں کیا کرے کہ سگریٹ کے چدو سے دو یا تین ٹکڑے کرتے اور کھانے کے بعد ایک ٹکڑا سگریٹ ہولٹر میں لگا کر پی لیتے۔ یہ سلسلہ کئی دیر جاری رہا لیکن دسے کی شدت کی وجہ سے اسے بھی بالآخر ختم کرنا پڑا۔

لیاس میں عیشہ سوٹ کے ساتھ ترکی ٹوپی استعمال کرتے تھے۔ پاؤں میں ہر موسم میں گل بوٹ پہنا کرتے۔ شکار کے موقعوں پر خاکی برہیس اور خاکی کوٹ ہوتے تھے۔ کھر میں بغیر کالر کی قمیص اور سفید ہاجرے کے ساتھ پیروں میں گرگاہی ہوا کتھی۔ لاہور کے قیام کے دوران میں نظر کم زور ہوئے کے سبب لکھنے پڑھنے وقت عینک لگایا کرتے تھے۔ دانت کسی زمانے میں بوش سے صاف کرتے رہے۔ مون کے، پھر بیول کی مسواک استعمال کرنے لگے اور آخر تک کرتے رہے۔ ڈاڑھی انہوں نے کبھی نہ رکھی۔ جوانی میں بڑی بڑی مولہیں رکھتے تھے، پھر ہلکی کرتے گئے۔ بال سفید ہونے کے بعد لاہور میں کچھ عرصہ سر پر مہندی لکواتے رہے لیکن جلد ہی یہ ترک کر دی۔ ساتھ ہی ہٹلری انداز کی مولہیں رکھ لیں۔ دماغی کام کی زیادتی کی وجہ سے سر پر بال بہت ہلکے ہو گئے تھے چنچھ وہ بوش سے پھیلا لیتے تھے۔ قد اور جسم متوسط اور رنگ تیز گندمی تھا۔ آخر عمر میں زیادہ چم کر بیٹھے رہنے کی وجہ سے جسم کچھ بھاری ہو گیا تھا۔

سے حد وضع دار اور متین انسان تھے لیکن خشک مزاج ہرگز نہ تھے۔ دوستوں اور شاگردوں کی ہر مشکل میں شریک رہتے لیکن اپنے نجی معاملات کے ذکر سے کبھی انہیں پریشان نہ کرتے۔ ان کی بردباری اور وضع داری کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ باوجود بیس برس لاہور میں رہنے کے ان کے قریب ترین دوستوں کو بھی یہ علم نہ ہوسکا کہ ان کی دو بیویاں ہیں۔

ولاہت سے ایک سنہری جوبی گھڑی لائے تھے۔ اس کے ساتھ ہی

سوئے کی زنجیر تھی۔ دونوں ہر ان کا مونو گرام بنا ہوا تھا۔ وہ گھڑی تو استمال نہ کرتے تھے، البتہ ویسٹ اینڈ کی گھڑی میں زنجیر ڈال کر قریب ہی دیوار سے آویزان کر رکھیں تھیں۔ ایک شاگرد ان کی غیر حاضری میں آیا اور زنجیر اڑا لے گیا اور کسی صراف کے پاس جا کر فروخت کر دی۔ بھائی شکی نے ڈھونڈ نکالی اور صراف سے دوبارہ خریدی گئی۔ حافظ صاحب نے اس شاگرد کا نام معلوم ہو جانے کے باوجود اس سے کوئی باز پرس نہ کی۔

اپنے اعزہ و اقربا کی ہر ممکن مدد کیا کرتے تھے۔ اس سے انہیں طہائیت حاصل ہوتی تھی۔ لاہور میں بدیک وقت کئی کئی عزیز تعلیم یا ملازمت کے سلسلے میں ان کے ہاں مقیم رہتے تھے۔ جانوروں سے بڑا اتنی تھا اور انہیں تکلیف میں نہ دیکھ سکتے تھے۔ لاہور میں جو خوش نصیب بیل مع بھوں کے مارے ہاں آجاتی، وہ تازیت جانے کا نام نہ لیتی۔ جاتی بھی کبوں، صبح ڈھیر سارے چھچھڑے، دن بھر بھوں کے لیے دودھ اور سردیوں میں روٹی کے بستر اور کہاں نصیب ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ گھر میں آدمی کم اور بلیاں زیادہ نظر آتی۔ بعض اوقات بلیاں چھوٹے بھوں کو دودھ پلاتا چھوڑ دیتی تھیں۔ ایسے موقعوں پر گھر والوں کی شامت آجاتی اور ذراہر کے ذریعے دن میں تین تین بار سب بھوں کو دودھ پلاتا پڑتا۔ مکان دوسری منزل پر ہونے کی وجہ سے کتوں سے البتہ نجات رہتی تھی، تاہم اوپر سے آنے والے جانوروں کے لیے گھر کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے۔ برتنوں کے واسطے پانی کی کونٹھی اور دانہ ہر دم موجود رہتا۔ ایک بار تو کہاں ہی ہو گیا، جب ایک بندر کا بچہ نہ معلوم کہاں سے مارا مارا پھرتا آ گیا۔ تر نوالے جو ملے یہیں کا ہو رہا۔ سال بھر میں کھا کھا کر خوب ساٹھ ہو گیا۔ اسے اپنے ہاتھ سے پھل وغیرہ کھلایا کرتے تھے۔

۱۔ یہ صاحب پرانی کتابوں اور دیگر آثار عتیقہ کا کلروہار کرتے تھے اور اس سلسلے میں حافظ صاحب کے پاس اکثر آئے۔ اسل نام غالباً مشتاق حسین تھا۔

انہیں دوبارہ چہلیاں ہونے پر ہی کھر سے نکلنے کا موقع ملتا ۔ وہ بھی رات کو کیوں کہ وہ رات کی گڑی پر رواۃ ہوا کرتے تھے ۔ وہ قنہائی پسند تھے اور شہرت سے دور بھاگتے تھے ۔ لونو نک سے برہیز کرتے تھے اور ماسوائے انتہائی بھبھوری کے کبھی شامل نہ ہوتے ۔ اگر کسی جلسے وغیرہ کی صدارت کی دعوت آتی تو ہمیشہ ہج نکلنے ۔

طرز تہاک اہل دنیا کے رد عمل کے طور پر وہ کچھ جذباتی اور زود رنج ہو گئے تھے ۔ جس شخص کی کسی حرکت سے ایک بار انہیں نفرت ہو جاتی ، عمر بھر اس کی صورت دیکھنے کے روا دار نہ ہوتے ۔ ایسے معاملات میں ان کو راضی کرنا دھان زخم پیدا کرنے کے مترادف تھا ۔ مسعود خان نے ان کی آخری عمر میں انتہائی کوشش کی کہ انہیں سامنے آنے کی اجازت دے دیں لیکن انکار کر دیا ۔ وہ چہپ چہپ کر بھائی کو دیکھنے اور آنسو بہاتے ۔ اپنے بیٹوں نیاز محمد خان صاحب و گول سے ۱۹۰۶ء میں شکر رنجی ہوئی تھی ۔ بین سے بہت محبت تھی اور قیام ٹونک کے زمانے میں اکثر ہلوائے لیکن وکیل صاحب سے نہ کبھی بات کی ، نہ روبرو ہوتے ۔ انتقال سے چند روز پہلے انہوں نے کہلواوا کہ میں حاضر ہو کر کچھ مشورہ دینا چاہتا ہوں ۔ جواب میں کہلواوا دیا کہ ”میں قریب مرگ ہوں ، ٹیوڑا سا انتظار اور کر لیجئے“ ۔ انتہا یہ ہے کہ اختر صاحب تک کو بستر مرگ کے نزدیک نہ آنے دیا ۔

ان ہانوں کے باوجود وہ تنک مزاج ہرگز نہ تھے ۔ دوستوں کے ساتھ مذاق اور چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری رہتا ، لیکن اس معاملے میں ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے ۔ خطوں میں ان کی ظرافت طبع اور ادبی مزاح کے نمونے ملتے ہیں ۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اپنے بمبئی کے قیام کے زمانے میں مختلف انجمنوں کے جلسوں میں مقالے پڑھنے میں مصروف رہے ۔ ایسے ہی ایک اجلاس کی صدارت گورنر بمبئی نے کی جس کی اطلاع اخبارات میں شائع ہوئی ۔ چنانچہ انہی دنوں ان کو خط لکھنے ہوئے کہتے ہیں :

”ہاں جناب ڈاکٹر صاحب! سنتا ہوں کہ مہاراجہ بڑودہ آپ کے استقبال کے لیے دہلی تک آئے اور پھر آپ کو سر آنکھوں پر بٹھا کر بڑودے لے گئے اور وہاں جا کر آپ کو خوب... کیا۔ کیا یہ سچ ہے یا آپ کے دشمنوں نے آپ کو ستانے کے لیے یوں ہی مشہور کر دیا؟ ایک خبر یہ بھی سنی ہے کہ آپ کے لکچروں میں کوئی شخص نہیں آیا۔ صرف آپ اور آپ کے پوزیشننگ گورنر بمبئی المظاہر کر کے واپس گھر آ گئے اور ہیلک کی غفلت پر دیر تک افسوس کرتے رہے۔“

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں :

”مولوی عبدالحق صاحب نے آپ کے متعلق کچھ لکھا تھا لیکن میرا قلم اس کے نقل کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اسے پیہرا سجدہ پایا کہ نقل کفر کفر نبیادہ مگر وہ نہیں مانتا۔“

اپنی کتاب ”نوردوسی پر چار مقالے“ انہوں نے پروفیسر اقبال صاحب کے نام پر معنون کی تھی۔ اس کے پروف بڑھنے کے لیے یہی انہی کو روانہ کیے۔ انہوں نے چپکے سے انتصاب کا ورق کھینچ لیا۔ جب کتاب شائع ہوئی تو بغیر انتصاب کے تھی۔ چنانچہ ان کے لڑکے کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

”ابا جی سے دریافت کرنا کہ ”نوردوسی پر چار مقالے“ مجھے ہاد بڑتا ہے میں نے ایک صاحب کے نام پر معنون کی تھی۔ تعجب ہے کہ یہ انتسابی پرچہ اس تالیف میں سے غائب ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ انجمن ترقی اردو کا قصور نہیں ہے بلکہ ان مثالوں کے پروف خوان کا۔ اس کے متعلق آپ کا (ڈاکٹر صاحب کا) کیا ارشاد ہے۔“

بے نواسنامی پر اپنا مضمون اورینٹل کالج میگزین کے لیے پروفیسر اقبال کو روانہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”خدا جانے آج کل کے ایڈیٹر کیسے ہیں کہ لوگوں سے مضمون مانگنا اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ بے چارے مضمون نگار مضمون

لیجے اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی کہیں سے مضمون مانگے
تو بھیجیں۔ مثلاً میں ہی ہوں، اب تک منتظر رہا کہ جناب
ایڈیٹر صاحب اور ہتھال کالج میگزین مضمون طلب کریں مگر ان
کو ہوا بھی نہیں۔ مجبوراً خود ہی ذریعہ خدا بھیج رہا ہوں۔
خدا کرے پسند خاطر خاطر ہو۔“

لاہور میں ان کے دوست پروفیسر فضل الدین قریشی صاحب ایک
بار طویل عرصے تک ملنے نہ آئے، انہیں لکھا :
”قریشی صاحب!

شعر ذیل میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں سنتا ہوں کہ آپ
شعر فہمی میں طاق ہلکہ شہرۂ آفاق ہیں :
تو ہنرمای کہ در فہم نداری ناں
لہذا عرض ہے :

ہراں حید سکبے چہ یداد رفت
کہ در دام از یداد حیداد رفت

والسلام، محمود شہرانی“

ان کے پسندیدہ موضوعات اودو زبان و ادب، تاریخ ادب فارسی،
اسلامی تاریخ و تہذیب، عروض، رسم الخط اور مسکوکات اور دیگر
آثار قدیمہ کا مطالعہ تھے۔ ان موضوعات پر ان کے بحر علمی کے متعلق
کچھ لکھنا نہ میرا منصب ہے اور نہ اس کا جہاں موقع ہے لیکن ایک
بات عرض کرنا ضروری ہے۔ وہ ان چیزوں میں نہ صرف دل چسپی
رکھتے تھے بلکہ اپنے ملنے والوں کو بھی ان علوم کا فریضہ بنا لیتے
تھے۔ گویا یہ بیابانی متعدی تھی اور انہوں نے اس میں کئی دوستوں
اور شاگردوں کو مبتلا کیا۔ اس لحاظ سے وہ اپنی ذات میں ایک
انجمن تھے۔

یوں تو وہ ہرانی کتابوں اور سکون کی تلاش اور تحقیق کے سلسلے
میں دور و نزدیک کے سفر کرتے ہی رہتے تھے، لیکن ۱۹۳۵ء میں گوجرہ

زبان پر تحقیق کے سلسلے میں انہوں نے گجرات کالہیاواڑ کا سفر کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کے لیے انہوں نے یونیورسٹی سے کچھ اخراجات برداشت کرنے کی درخواست کی جس کے جواب میں دو سو روپے کی منظوری مل گئی۔ چونکہ موسم گرما کی تعطیلات میں گجرات میں زبردست بارشیں ہوتی ہیں اس لیے انہوں نے ۱۶ ستمبر سے ۳۰ ستمبر تک دو ہفتے کی چھٹی لی اور گجرات روانہ ہو گئے۔ اس سفر میں انہوں نے احمد آباد، بڑودہ، بمبئی اور جے پور کے بعض کتب خانے دیکھے۔ احمد آباد میں پیر ہد شاہ کی درگاہ کا کتب خانہ، سید بڑے صاحب کا کتب خانہ، سید جلال الدین مشہدی کا کتب خانہ اور حسینی پیر کا کتب خانہ دیکھا۔ بعض لوگوں مثلاً قاضی احمد آباد کے پاس عہدہ مجموعے تھے لیکن انہوں نے دکھانے سے انکار کر دیا۔ بمبئی میں ہد شاہ اسکول کی لائبریری اور پروفیسر نجیب اشرف صاحب کا کتب خانہ نظر سے گزرا۔ بڑودہ میں جامع مسجد لائبریری دیکھی لیکن اس میں صرف مطبوعہ کتابیں تھیں۔ جے پور میں خوش فہمی سے انہیں دائرے کے مہدویوں کے ایک کتب خانے کا کچھ حصہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ کتب خانہ کسی مقدمے کے سلسلے میں دائرہ سے ریاست کے صدر مقام میں لایا گیا تھا۔ اس میں انہوں نے خاص طور پر مہدوی فرقے کے لوگوں کی گوجری اور راجستھانی اردو میں لکھی ہوئی کتابیں دیکھیں۔ اس سے انہیں اپنے مضمون ”دائرہ کے مہدویوں کا اردو ادب کی تعبیر میں حصہ“ کے لیے کافی مواد میسر آیا۔

مارچ ۱۹۳۸ء میں یونیورسٹی سٹڈنٹ کیٹ نے انہیں ۱۵- اکتوبر کو ملازمت سے سبک دوش کر دینے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے سے ان کے دوستوں اور مداحوں میں بے چینی پھیل گئی۔ وہ خود بھی انہیں لاہور چھوڑنا نہیں چاہتے تھے کیوں کہ ان کے بعض کام اذھورے بڑے تھے۔ چنانچہ ان کے دوستوں نے ان کی ملازمت میں توسیع کی کوششیں شروع کر دیں۔ سر اقبال نے وائس چانسلر کے نام ایک خط میں ان کی علمیت اور خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا کہ جس عمر میں انہیں ریٹائر کیا جا رہا ہے دراصل میں عمر ان سے فائدہ

انہاں کی ہے اور اس مرحلے پر ان کی سبک دوشی کا فیصلہ ہماری بدقسمتی کی دلیل ہے ۔

ادارہ معارف اسلامیہ نے ۱۸ ، ۱۹ ، ۲۰ مئی کو ان کے آثار و عتیقہ کے مجموعوں کی نمائش منعقد کی اور اس سلسلے میں اپنی جانب سے ایک خط بڑی تعداد میں شائع کروا کر برصغیر کے علم و ادب سے دل چسپی رکھنے والے لوگوں کو بھیجا ۔ اس کا مضمون یہ تھا :

محرمی و مکرمی ! سلام علیکم ۔ پروفیسر حافظ محمود خان صاحب شیرانی لیکچرار شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی کی علمی خدمات ، فنی تنقیدات اور ادبی موشگافیوں سے جناب بہ خوبی واقف ہیں ۔ یونیورسٹی کی خدمات سے وہ عنقریب سبک دوش ہونے والے ہیں اس لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے ادبی حلقوں ، علمی اداروں اور عوام کو ان کے کتب خانے کے نادر مخطوطات ، نایاب تصاویر اور کم باب سکون اور دیگر آثار عتیقہ سے روشناس کیا جائے جس کے لیے ۱۸ ، ۱۹ اور ۲۰ ماہ حال کو لاہور میں ایک نمائش منعقد کی جا رہی ہے ۔ جناب کی علم دوستی ، معارف بروہی اور ادب نوازی کی بنا پر درخواست ہے کہ پروفیسر صاحب مدوح کی علمی خدمات کے اعتراف میں جناب حتی الاسکان جلد اپنی رائے عالی سے ہمیں مستفید فرمائیں ۔

بعض حلقوں میں اس بات کی یہی تحریک کی جا رہی ہے کہ ان کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات کو یونیورسٹی میں کچھ اور عرصے کے لیے ازسرنو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے ۔ اس ضمن میں جناب کا براہ راست جناب وائس چانسلر صاحب بہادر پنجاب یونیورسٹی کی خدمت میں اپنے قیمتی خیالات کا اظہار بہ شکل مراسلہ اس مقصد کے پورا کرنے میں موثر و موثر ثابت ہوگا ۔

اگر وقت کی تنگی کی وجہ سے جناب اس تقریب سعید پر تشریف نہ لاسکیں تو کم از کم اپنے گرامی نامہ سے ہمیں ضرور سرفراز

فرماویں اور اس علمی و ادبی خدمت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں ۔
ادارہ چناب کی اس ادب نوازی کو یہ نظر تحسین و تشکر
دیکھتے گا ۔

والسلام

نیاز کشیش
سیکرٹری ادارہ

یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی خدمات اس وقت کے فائنل کمشنر
مسٹر ڈاہن انجام دے رہے تھے ۔ شرقیے لاہور کا ایک وفد اس سلسلے
میں ان سے ملا ۔ اس وفد میں نواب سعادت علی خان ، مہاں امیر الدین
اور پروفسر فضل الدین قریشی بھی شامل تھے ۔ غرض ان تمام
سرگرمیوں کے نتیجے میں ان کی ملازمت میں دو سال کی توسیع منظور
ہو گئی ۔ اس دو سالہ مدت میں انہوں نے وہ مضامین جن کا خاکہ تیار
تھا ، مکمل کیے ۔ تنقید آب حیات اور مہدویان دائرہ سے متعلق مضامین
اسی عرصے میں تکمیل کو پہنچے ۔ آخر یہ دو سالہ توسیع بھی ختم ہوئی
اور ۱۵ نومبر ۱۹۴۰ء سے وہ ساڑھے آٹھ ماہ کی رخصت پر چلے گئے ۔
یہ چوٹی انہوں نے لاہور ہی میں کاٹی ۔

حافظ صاحب کو عتیقات کے جمع کرنے کا پسکا لوزک اینڈ کمپنی
کی ملازمت کے زمانے سے پڑا ۔ قیام ٹولنگ کے دوران میں وہ کچھ
چیزیں جمع کر چکے تھے ۔ پھر لاہور پہنچنے پر وہ یہ چیزیں ، خصوصاً برائے
کتابیں اور سکے فراہم کرنے لگے ۔ چند سال کے اندر اندر یعنی ۱۹۴۷ء
کی ابتدا تک وہ فارسی اور عربی کے ایک ہزار سے زائد قلمی نسخے مہیا
کر چکے تھے ۔ ان میں سے بعض نادر نسخوں کی ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا
ویٹکولڈ کمیشن کے لاہور کے اجلاس کے موقع پر نمائش کی گئی ۔ بعد
ازاں دہلی اور لاہور کی متعدد نمائشوں میں ان کی چیزیں خصوصیت
کے ساتھ پیش کی گئیں ۔ خطوطات کے علاوہ مطبوعہ کتابوں کی ایک بڑی
تعداد اور بہت سے برائے سکے بھی انہوں نے اکٹھے کیے ۔ ان کی آمدنی
کا معتد بہ حصہ اسی کام کی نذر ہوتا تھا ۔ کتابوں اور سکوں کے بعد
برائے ہتھیار ، برتن ، سورتیاں ، وسیلیاں ، کتبے ، فراہیں اور سکاٹپ

بھی وہ جمع کرتے تھے۔ اور تو اور ملاتی کہیوں کے وہ بڑے شائق تھے۔ جتنی کسی کہیوں کی ہندسی اشکال زیادہ پیچیدہ ہوتی اتنا ہی وہ اسے پسند کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ ہت کے اندر مختلف ہندسی نمونے ڈالنے کے فن کو مسلمانوں نے شرح کی حدود میں دھتے ہوئے اپنے ذوق لطیف کی تسکین کی خاطر ترقی دی ہے۔ اس فن کی عمدہ مثالیں کو قالینوں میں ماتی ہیں لیکن کہیوں بھی اس زمرے میں شامل ہیں۔

کتابوں اور سکوں کو وہ بہت احتیاط سے دیکھتے تھے۔ کتابیں الہادیوں میں ترتیب سے دیکھی رھتی تھیں۔ سکوں کے لیے خاص قسم کے صندوقچے بنوائے گئے تھے۔ ان صندوقچوں میں پتلی پتلی دروازے ہوتے تھے جو بارہ بارہ خانوں میں تقسیم ہوتے۔ ان خانوں میں سرخ، سبز یا نیلی غمل چسپاں ہوتے جس پر منبری روپلی سکے عجیب چار دکھاتے۔ تانبے کے سکے تھیلیوں میں بند ہوتے تھے۔ ایک تھیلی میں ایک بادشاہ کے سکے ہوتے اور اوپر اس کا نام لکھا ہوتا۔ بعض اہم نکمالوں کے لیے الگ الگ تھیلیاں ہوتیں۔ مسکوکات کے معاملے میں انہیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ اس فن پر انہوں نے چند مضامین بھی لکھے لیکن در حقیقت دوسری مصروفیتوں کے بیش نظر انہیں اس طرف توجہ کا کاحتہ موقع میسر نہ آسکا۔ مشہور ماہر مسکوکات ایچ۔ نلسن رائٹ کے نام انہوں نے ۱۰۔ جولائی ۱۹۳۷ء کو ایک طویل خط لکھا جس میں اس کی کتاب ”سلاطین دھلی کے مسکوکات اور نظام وزن و بیانی“ پر تنقید کرتے ہوئے ان مقامات کی نشان دہی کی جہاں مولف نے ٹھوکرہں کھائی ہیں اور اس کی غلطیوں کو درست کیا۔ نلسن اس بارے میں ان کی علمیت سے بہت متاثر ہوا اور اپنی بعض کتابیں انہیں تحفے کے طور پر بھیجیں۔

انہیں اس چیز کا ہمیشہ افسوس رہا کہ ابتدا میں ان کی بھوری کی وجہ سے کئی نایاب چیزیں یورپ جا پہنچیں۔ اس معاملے میں وہ ہم وطنوں کی نادانی اور قدر ناشناسی کے بھی شائق تھے۔ یہی وجہ تھی

کہ وہ اپنے عہدیت کے مجموعوں کو ہر قیمت پر ہندوستان میں اور خاص طور پر لاہور میں رکھنا چاہتے تھے۔ ممکن تھا کہ انہیں باہر سے یہاں کے مقابلے میں کئی گنا قیمت مل جاتی لیکن یہ انہیں مرکز منظور نہ تھا۔ اسی بنا پر انہوں نے اپنا مجموعہ کتب معمولی قیمت [سترہ ہزار] پر یونیورسٹی کے حوالے کر دیا۔ اس میں ۲۱۰۰ قلمی اور ۱۷۰۰ مطبوعہ کتابیں شامل تھیں۔ اگرچہ ان سے جلد انہیں بڑی شاق گزری لیکن ان کی صحت دگرگون ہو چکی تھی اور اختر صاحب پر انہیں اعتماد نہ تھا۔ اس مجموعے کا تعارف کرائے ہوئے مولوی شفیق صاحب کو ۲۹ - مارچ ۱۹۳۱ء کے خط میں لکھتے ہیں :

”اکثر کتابیں فارسی کی ہیں اور فارسی کی ورکنگ لائبریری کا مقصد ادا کرتی ہیں۔ ان میں ناقص اور مکمل دونوں طرح کی کتابیں ہیں۔ اکثر کی جلد بندی کی ضرورت ہے۔ میں نے یہ کتابیں ایک ہندوستانی علم پرست کے نقطہ نظر سے جمع کی ہیں جن میں ہندوستانی تالیفات اور ہندوستانی خط قدیم پر ایک خاص نگاہ رکھی ہے۔ بعد خرابی بسیار میں نے اس خط کا ہٹا لگایا ہے اور میری آرزو ہے کہ میں اس خط کی جو مغلوں کی آمد سے قبل تمام ہندوستان میں رائج تھا، رام کہانی سناؤں مدت سے میرا ارادہ ہے کہ میں ہندوستان میں اس خط کے ارتقا کی داستان دنیا کے سامنے پیش کروں، مگر ضروری کمونوں کے فقدان کی بنا پر میرا ارادہ عملی جامہ نہ پہن سکا اس وقت تک میں نے یہ دقت تمام سالہ متر کے قریب اس خط کے سمونے جمع کر لیے ہیں۔ [انشا ۱] کے فن پر میں نے خاص کوشش کر کے ایک بڑا ذخیرہ جمع کیا جس کی تعداد قلمی اور مطبوعہ یقیناً ایک سو سے زیادہ ہوگی۔ یہی حالت مجھ کے تعلیمی نصابوں کی ہے۔ ان تینوں گذشتہ امور میں کوئی لائبریری میرے حلیر مجموعے کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لغات، ادب، تاریخ، تذکروں، انشا اور بیاضوں میں میرا مجموعہ دوسری لائبریریوں سے کسی حال میں کم نہیں۔“

وہ چاہتے تھے کہ وطن روانہ ہونے سے پہلے لاہور میوزیم ان کا مجموعہ مسکوکات حاصل کر لے تاکہ ان کی عمر بھر کی کتابیں اس شہر میں رہے۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی نے بھی کوشش کی لیکن یہ قسمی سے پنجاب گورنمنٹ آمادہ نہ ہوئی اور اگست ۱۹۴۱ء میں لاہور چھوڑنے وقت وہ یہ مجموعہ ساتھ لے گئے۔

لاہور سے وہ سیدھے ٹونک پہنچے اور اپنے آبائی مکان میں اترے۔ عرصے سے مکان کی مرمت نہیں ہوئی تھی۔ پہلے اس سے فراغت حاصل کی۔ ٹونک میں بارشوں کی امراط کی وجہ سے برسات کا موسم بڑا سہانا ہوتا ہے۔ اس سے ان کی طبیعت بشاش ہو گئی۔ مولوی عبدالحق صاحب دہر سے مصر تھے کہ ملازمت سے فارغ ہونے ہی وہ دہلی آئیں اور اپنے مضامین کے بعض سلسلوں کو نظر ثانی کے بعد کتابی شکل میں لائیں تاکہ انجمن انہوں شائع کرا سکے۔ علاوہ ازیں وہ اختر صاحب کو بھی ترجمے کے کام کے سلسلے میں بلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو انہوں نے مولوی صاحب کے نام خط میں لکھا :

”میں عید کے بعد مع داؤد حاضر خدمت ہو جاؤں گا۔ یہاں آکر میں اور کلموں میں مصروف ہو گیا تھا جن میں مکان کی مرمت زیادہ اہم تھی۔ موسم یہاں خوش گوار ہو گیا ہے۔ خدا نے یہاں آکر لاہور کی گرمی سے نجات دی۔“

عیدالطر ۲۲ - اکتوبر ۱۹۴۱ء کو تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ اس کے بعد گئے ہوں گے۔ وہ کوئی دو ماہ دہلی میں مقیم رہنے کے بعد ۱۷ دسمبر کی آخری تاریخوں میں عید الاضحیٰ سے قبل وہاں سے لوٹ آئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ طعت سردی کے سبب ان کے سانس کا مرض شدت اختیار کر گیا تھا۔ سردیوں میں شام کے وقت بڑے شہروں پر معلق ہونے والا دھواں ان کے لیے زہر قاتل کا حکم رکھتا تھا۔ جاڑوں کا موسم ٹونک میں گزارنے کے بعد وہ ۱۹۴۲ء کے موسم بہار میں دہر دہلی چلے گئے اور وہاں کئی ماہ مقیم رہنے کے علاوہ کچھ دن لاہور میں گزار کر واپس آئے۔

لونگ میں انہوں نے مکان کی دوسری منزل پر ڈیرہ جا رکھا تھا۔ ایک بڑے کمرے میں ان کے سگے ، ہتھیار اور دوسرے آثارِ حقیقہ عجائب گھر کا نظارہ پیش کرتے تھے۔ دوسرے کمرے میں ایک جانب ان کا ہلنگ بیٹھا ہوتا جس پر بیٹھے اپنے کام میں مشغول رہتے۔ اگر کوئی مانیے والا آ جاتا تو اسی ہلنگ کے قریب چند کرسیاں ڈال دی جاتیں۔ بستر پر ان کے ارد گرد کتابیں بکھری ہوتی تھیں اور کاغذ قلم دوات رکھے رہتے۔ وہ ہمیشہ ریف کی سب سے لکھا کرتے اور اکثر سوانہ انک استعمال کرتے تھے۔ فلاؤٹن پین سے لکھتے انہیں کبھی نہ دیکھا۔ ممکن ہے کہ کالج میں اس سے بھی کام لیتے ہوں۔ قریب ہی ایک کونے میں سیز پر مختلف دوائیں چنی ہوئیں۔ ان میں ضیق النفس کے مستقل علاج کی دوائیں، دورہ بڑنے کی صورت میں ہنگامی تسکین کی دوائیں اور مفویات ہوا کرتی تھیں۔ انگریزی اور یونانی دونوں قسم کی ادویات موجود ہوئیں۔ ویمبول کی فاسفولیسیٹن ہمیشہ استعمال کرتے تھے۔ خمیرہ کٹو زبان عبری جواہر والا اور حکیم ارشد والا کے علاوہ کشتہ فولاد بھی موجود رہتا۔ ان کے دوست اور مداح بھی نسخے روانہ کرتے رہتے تھے۔

فارسی کی ابتدائی کتابوں کے بعد انہوں نے مجھے گلستان سعدی شروع کروادی تھی، لیکن اسے مکمل کرنے کی سعادت مجھے حاصل نہ ہو سکی، کیوں کہ بعد میں طبیعت زیادہ خراب رہنے کی وجہ سے وہ مجھے سبق لینے کے لیے اختر صاحب کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔ جب تک ان کی طبیعت ٹھیک رہی وہ مغرب کے بعد ہم بین بھائیوں کو ساتھ لے کر سیر کو نکل کھڑے ہوتے۔ ہم دونوں اپنی تین بیویوں کی ساتھیوں پر سوار ہوتے اور وہ ایک ہاتھ میں چھڑی دوسرے میں تاراج پکڑے ہندل چلتے۔ شہر سے باہر پرسکون سڑکوں پر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بھرے کے بعد واپس ہوتے۔ راستے میں دو ایک جگہ چند منٹ دم لینے کو ٹھہر بھی جاتے۔

مکان کی نچلے منزل میں اختر صاحب اور دھگر افراد خانہ رہتے تھے۔ اختر صاحب ان کا بے انتہا ادب کرتے اور بے حد ڈرتے تھے۔

نہ کبھی انہوں نے سامنے ہلایا نہ انہوں نے جانے کی جرات کی ۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ ان کو کسی ادبی معاملے میں بیٹھے سے مشورہ لینے کی ضرورت پڑ جاتی ۔ ایسے موقعوں پر وہ ایک راتیں پر ہلا مخاطب زیر بحث مسئلہ لکھ دیا کرتے اور میرے یا گھر کے کسی اور فرد کے ہاتھ نیچے بھیج دیتے ۔ اختر صاحب فوراً اس کے متعلق جہان بین اور غور و غوض کر کے اپنی رائے تحریر کر دیتے لیکن مارے خوف کے کاغذ پر بھی مخاطب کرنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے ۔

کتابیں خریدنے کا سلسلہ ٹونک میں بھی جاری رہا ۔ آئے دن کوئی نہ کوئی شخص کتابیں دکھانے آتا رہتا ۔ کوئی کام کی کتاب ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے ۔ کبھی کبھی اپنے سگھے لے کر بیٹھ جاتے اور گھنٹوں مطالعہ کرتے رہتے ۔ یہ سلسلہ کئی دن جاری رہتا ۔ اس میں ایسے متہمک ہونے کہ کھانا تک یاد نہ رہتا ۔

موسم سرما کی آمد پر مرض کی شدت پھر بڑھ گئی ۔ مولوی عبدالحق صاحب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

”آج چار دن سے میں اپنی حالت میں بڑی تبدیلی دیکھ رہا ہوں ۔ پچھلے سال بھی تقریباً یہی حالت ہو گئی تھی ۔ میں نے تین چار دن متواتر کوشش کی کہ اگر رات کو نہیں چل سکتا تو دن کو تین بجے کے قریب پھر لیا کروں ۔ لیکن اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ نہیں چل سکتا ۔ پسینہ آ جاتا ہے اور جسم جواب دے دیتا ہے ، دل پھٹنے لگتا ہے ، تنفس میں تکلیف بڑھ جاتی ہے ۔ سردی چاہ بھی بڑھ گئی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں بہت زیادہ ہے ۔“

سردیاں نکلنے پر ان کی طبیعت سنبھل گئی لیکن اس موذی مرض کی وجہ سے ان کی صحت گھڑی ماشہ گھڑی تولہ ہو گئی تھی ۔ ایسی حالت میں وہ اپنا شکار کا مشغلہ بھی جاری نہ رکھ سکتے تھے ۔ شغل کے طور پر جمعہ کے موسم بہار میں دریائے بناس کے کنکراج گھاٹ پر بندہ جانپاز کے قریب انہوں نے خربوزوں کی باڑی خریدی ۔ یہ چمک

شہر سے کوئی تین میل دور تھی۔ چاڑی راستہ نہایت حسین اور دریا کا نظارہ بڑا دل کش تھا۔ دریا کی دفنی ہر فالیز کے قریب انہوں نے سرکنڈوں کا ایک کمرہ بنا جھولہا تیار کروایا۔ روزمرہ کی ضروریات اور ان کا بڑھنے لکھنے کا سامان وہاں پہنچ گیا۔ آمد و رفت کی آسانی کے لیے جوڑی تالکا خریدا۔ کسی ضروری کام کے سوا شہر نہ آئے تھے۔ دستور یہ ہوتا کہ ہم چن بھائی دن بھر بڑھائی سے فارغ ہونے کے بعد عصر کے وقت چھوٹی دادی جان کے ہمراہ کھانا وغیرہ لے کر تانگے میں ندی روانہ ہو جاتے۔ ناگوری پیل ہوا سے ہاتھ کرتے۔ ندی پر غروب آفتاب کا نظارہ ہلاکا خوب صورت ہوتا۔ رات وہاں کے ہر سکون ماحول میں بسر کرتے، صبح ڈھیروں غریبوں سے بھرا ہم لوگ شہر روانہ ہو جاتے۔ یہ غریبے اپنے گھر کے علاوہ عزیزوں دوستوں کے ہاں بھجوائے جاتے۔ چھٹی کے دن ہماری عید ہوتی کیوں کہ دن کو بھی ندی پر رہنے کا موقع ملتا تھا۔ جس کسی کو ان سے ملنا ہوتا ندی پہنچ جاتا۔ ٹونک میں ان کے جاننے والے گھر سے پتا کیے بغیر اپنے تانگوں میں سیدھے وہیں آتے۔ کوئی دن ایسا جاتا تھا کہ ان کے پاس کوئی عزیز یا مہمان نہ ہو۔ شہر میں ہیشیے کی ویابیلی تو پٹ سے عزیزوں کو وہیں بلوا لیا۔ کھانا بھی ندی پر تیار ہونے لگا۔ گویا شہر سے تعلق اور بھی کم ہو گیا۔

اس سال انہوں نے مولوی عبد الحق صاحب کو غریبوں کے کھانے کے لیے ٹونک آنے کی دعوت دی۔ ۶۹ء۔ اپریل کو انہیں ایک خط میں لکھتے ہیں :

”آپ جے پور ٹک تو آتے رہتے ہیں، ٹونک نے کیا تصور کیا ہے۔ اس مرتبہ اگر آپ کی بوڑھی ہڈیاں سفر کی صعوبت برداشت کر سکیں تو اس دارالاسلام کی زیارت کریں۔ مجھے ابھی جلدی نہیں ہے۔ غریبوں سے چل گئے ہیں لیکن اگلے مہینے سے کام کے ہوں گے۔ اس وقت قشرف لائیے تاکہ آپ یہ بھشتی میوہ جس

قدر کھا سکیں قالیز پر کھائیں اور اس امید میں نہ رہیں کہ آپ کا حصہ گھر بیٹھے آپ کو پہنچ جائے گا۔“

مولوی صاحب نے آنے کا وعدہ کیا لیکن جب ان کے آنے میں دیر ہوئی تو انہوں نے ہارسل کے ذریعے خربوزے دہلی روانہ کئے۔ اس کی رسید کے طور پر مولوی صاحب نے لکھا :

”خربوزوں کا ہارسل پہنچا۔ کن الفانا میں شکریہ ادا کروں۔ آپ نے گھر بیٹھے یہ نعمت پہنچا دی۔ میرا خط پہنچا ہوگا۔ ہم تو غرور و عاں آکر خربوزے کھانا چاہتے تھے۔ انشاء اللہ ضرور آئیں گے۔“

غرض مولانا اسی موسم میں مع سید عاشمی صاحب مرحوم تشریف لائے اور تین دن قیام کیا۔ اس موقع پر خصوصی انتظامات کیے گئے۔ ندی پر پلٹ سا لڑکچر پہنچایا گیا، ارد گرد ریت پر دریاں بپھائی گئیں، رات کو کھڑی کی گئی۔ مولوی صاحب کا بے اختیار ہو کر یہ کہنا مجھے آج تک یاد ہے : ”خاتم تو نے جنگل میں تنگل کر دیا“۔ مولانا صبح شہر چلے جاتے اور وہاں مجلسوں اور تقریروں میں شرکت کرنے کے بعد عصر سے پہلے ندی پہنچ جاتے۔ یہ دن بڑے ہر لطف گزرتے۔ جاتے وقت انجمن کے لیے چند قلمی کتابیں اور کچھ روپیہ مولانا کی نذر کیا۔ لاہور کے بعض دوستوں کو بھی خربوزے بھیجے لیکن سفر لمبا ہونے کی وجہ سے وہ اچھی حالت میں نہ پہنچ سکے۔

خربوزوں کا موسم ختم ہونے کے بعد جون میں وہ دہلی گئے۔ وہاں سے رام پور کا چکر بھی لگایا، لیکن اس سال وہ زیادہ دیر دہلی نہ ٹھہر سکے اور صحت کے ہاتھوں مجبور ہو کر انجمن سے استعفا دے کر چلے آئے۔

سیلاب کا موسم آنے سے پیشتر جھونپڑے کو ندی کے درمیان سے اٹھوا کر کنارے پر رکھوا لیا تھا۔ وہ اب بھی وہاں جاتے تھے لیکن دن بھر ٹھہر کر شام سے پہلے گھر چلے آتے۔ ۲۹۔ اگست کو یورپ و اقبال صاحب کو لکھتے ہیں :

”آپ فرماتے ہیں کہ لاہور آج کل جہم کا ٹونہ بن رہا ہے ، تو آپ وہاں کیوں بڑے ہیں ، یہاں تشریف لے آئیے ۔ یہاں حالت یہ ہے کہ گرمیاں اس سال میں نے ندی میں گزاریں ، بڑے لطف سے گزریں ۔ راتوں کو نہایت ہر لطف موسم ہوتا تھا اور چاند اور دلائی اوڑھنی ہوتی تھیں ۔ گرمی کے چند دن میں نے وہی دیکھے جب میں دہلی اور رام پور میں تھا ۔ ٹونک میں ایک رات بھی گرم بچھے یاد نہیں ۔ دہلی سے واپسی کے بعد میں مستقر کیا رہ بارہ بجے دن کے ندی آ جاتا ہوں ۔ یہاں دریا کے کنارے کے قریب بھوس کا ایک جھونپڑا ڈالوا لیا ہے ۔ اس پاس کھیت ہیں اور بیج میں مایدولت کا جھونپڑا ، ہم جس میں فرعون بے ساراں بنے بیٹھے ہیں ۔ دل میں آتی سو گئی ورنہ کتاب دیکھتے رہے یا اپنا کام کرتے رہے ۔ ابرسات کی وجہ سے منظر نہایت ہر لطف ہے ۔ ایک طرف پہاڑوں کا سلسلہ ہے جو سرتا سبز ہے ، دوسری طرف ندی ہے جو جنوبی سمت سے آ کر موڑ کھاتی ہوئی شاہی رخ سے ہوتی ہوئی مشرق میں نکل گئی ہے ۔ تازہ ہوائیں ہر وقت چل رہی ہیں ۔ عصر سے غنکی ہو جاتی ہے ۔ رات کو معلوم نہیں کیا حالت رہتی ہے ۔ میں تو مغرب کے وقت یہاں سے رخصت ہو جاتا ہوں اور گھر پہنچ جاتا ہوں ۔ پچھلے چار پانچ روز سے پھر بارش شروع ہو گئی ہے ۔ سورج مہاراج کاکے ماٹھے گھٹنے دو گھٹنے کے واسطے ، وہ بھی حاضری دینے کی غرض سے آ جاتے ہیں ۔ میرا خیال ہے کہ ندی کے پانی اور اس کی ہوا نے میری صحت میں بڑا فرق پیدا کر دیا ہے ۔“

ندی کی آب و ہوا کو اپنی صحت کے لیے ملید یا کر انہوں نے وہاں مستقل قیام کا ارادہ کر لیا ۔ اس غرض سے اس کے کنارے اپنی جھونپڑی سے کچھ دور زرعی اراضی کے چند قطعات خرید لیے ۔ ارد گرد کے ہندو کسانوں سے وہ ان ٹکڑوں میں بھی کاشت کروا لیتے اور انہیں اچھا معاوضہ دیتے ۔ علاوہ ازیں وہ ان لوگوں کو ضرورت کے وقت قرض محنتہ کے طور پر چھوٹی چھوٹی رقمیں دے دیتے ۔ اس سے وہ

ساموکاروں کے ظلم سے نجات پا گئے ۔ ان باتوں سے وہ لوگ ان کی عزت پرستی کی حد تک کرنے لگے ۔ وہ سب انہیں باہو جی کہتے تھے ۔ زمین کے ٹکڑوں سے انہیں کوئی مالی فائدہ مقصود نہ تھا ۔ چنانچہ وہ اس میں اکثر بھوں کی دل چسپی کی چیزیں لگواہا کرتے ، مثلاً سونگ پھلی ، شکر قندی وغیرہ ۔ اس سے حاصل کردہ فصل وہ مزاحمت کے ساتھ فراخ دل سے تقسیم کرنے کے بعد اگرا میں بانٹ دیتے ۔ البتہ تانگے کے بیلوں کا چارہ انہیں زمین سے حاصل ہو جاتا تھا ۔ اس زمین کے نزدیک انہوں نے ایک نئی جھونپڑی تیار کرائی اور اس کے ساتھ جتنی چادریں کھڑی کر کے باورچی خانہ بنوایا ۔

انجمن ترقی اردو سے معاہدے کے تحت انہوں نے اپنے بعض مسلسل مقالات پر نظر ثانی کی جو انجمن نے کتابی صورت میں شائع کروائے ۔ ان میں ”تغیہ شعر العجم“ ، ”برتھی راج راسا“ اور ”فردوس بر چار مقالے“ شامل ہیں ۔ ۱۹۴۷ء کی ابتدا میں انہوں نے ”خالق ہاری“ کی ترتیب مکمل کی اور اس کا مسودہ مارج میں مولوی صاحب کی خدمت میں روانہ کیا ۔ علاوہ ازیں مولانا محمد حسین آزاد اور دیوان ذوق سے متعلق ایک مضمون سپرد قلم کیا جو انہوں نے ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کو روانہ کیا ۔ یہ مضمون رسالہ ”ہندوستانی“ میں متعدد سطروں میں شائع ہوا ۔

دسمبر ۱۹۴۴ء میں انہیں خبیث النفس کے شدید دورے پڑنا شروع ہوئے ۔ کچھ دن کے وقفے سے یہ دورے بڑے ۔ سانس ان کے سینے میں نہیں ساتا تھا اور دھونکنی کی طرح اس کے چلنے کی آواز آتی ۔ ساتھ ہی ہسمے جھونکنے لگتے اور کبھی طاری ہو جاتی ۔ دورے کی حالت میں وہ ہلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتے اور بری طرح ہانپتے لگتے ۔ یہ دورے بڑے خوف ناک تھے اور وہ ان سے بڑا گھبراتے ۔ ان کے علاج کی خاطر وہ جنوری ۱۹۴۴ء میں جے پور گئے ۔ جس دن وہاں پہنچے بڑا سخت دورہ پڑا جس سے خلاف معمول کئی کھٹے بے ہوش رہے ۔ وہاں کے ہسپتال میں دو ہفتے سے زیادہ ان کا علاج ہوا ، اس سے انہیں کافی

افاقہ ہوا اور عارضی طور پر دورے رک گئے۔ فروری کے دوسرے
ہفتے میں وہاں سے گھر لوٹ آئے۔ چند ہی دن بعد پھر دورہ پڑا۔ اس
کا ذکر کرتے ہوئے ۱۳۔ فروری کو ایک خط میں تحریر کرتے ہیں :

”یہ قسمی سے کل ساڑھے بارہ بجے رات کے پھر دورہ پڑ گیا۔ ڈیڑھ
دو گھنٹے سخت تکلیف رہی۔ ڈاکٹر نے یس منٹ کے فاصلے سے
دو مرتبہ الیکشن کیا تب کہیں تکلیف میں تخفیف ہوئی۔ سارا
جسم پسینے میں شرابور تھا اور لرزہ جسم پر الگ چھا گیا۔
چنانچہ آج بھی ایک دن گزر جانے کے بعد لرزہ جسم پر موجود
ہے۔ میں یہ خط آپ کو بڑی تکلیف میں لکھ رہا ہوں۔“

سردیاں گزر جانے پر حسب معمول ان کی بیماری میں کمی آگئی۔
دورے گو مئی تک جاری رہے لیکن ان کی وہ شدت باقی نہ تھی :
علاوہ ازیں ان کا درمیانی وقفہ بھی بڑھ گیا تھا۔ اس سال انہوں نے
بڑی تیاریوں سے خبرپوزوں کی کاشت کروائی۔ دور دورے بیج منگوائے !
چنانچہ لکھنؤ سے سفیدوں کے بیج آئے۔ کنارے والی جھونپڑی
چونکہ مستقل کر دی گئی تھی اس لیے فالیز کے ساتھ ایک چھوٹی
سی عارضی جھونپڑی کھڑی کروالی۔ اسی موسم بہار میں اپنی زمین
کے دو ٹکڑوں میں جو ندی کے عین کنارے پر واقع تھے، انہوں نے
سرود اور افار کے پودے لگوائے۔ الہ آباد کے سرود مشہور ہیں،
چنانچہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کے توسط سے وہاں سے سرودوں
کی اعلیٰ اقسام کے بیج منگوائے۔ پودوں کو ہائی کی ہر وقت ہم رسانی
کی غرض سے ندی کے کنارے چھلار لگوائی۔

اکتوبر، نومبر ۱۹۴۹ء میں وہ تین بار ملیریا میں مبتلا ہوئے جس سے
نقاہت بہت بڑھ گئی۔ ان کے دوست انہیں نسخے روانہ کرنے کے علاوہ
دسے کے کام باب معالجوں کا پتا لگاتے رہتے تھے۔ چنانچہ انہی دنوں
ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے ہونے سے بیجا پور کے کسی مرہطہ ڈاکٹر کے
متعلق لکھا جو دسے کے علاج کا ماہر بتایا جاتا تھا۔ ۳۱۔ نومبر کو ان
کے خط کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

’دوسے کے ماسٹر سول سرجن بیجا پور کے متعلق قرا اور تحقیق کرلو ،
اگر فریب ہے تو جا کر دریافت کرو ۔ مجھ کو اب یعنی دسمبر
سے دورے اٹھنے لگتے ہیں ۔ اس سال مئی تک دورے اٹھنے
رہے ۔ اس کے بعد غالباً برسات کے اثر میں بند ہو گئے ۔ اب دسمبر
سر ہر کھڑا ہے اور میں کائب رہا ہوں ۔

ایک بات یہ معلوم کیجئے کہ چون کہ ان علاقوں میں سردی
زیادہ ہوتی ہے اس لیے مجھے دورے اٹھنے ہیں ۔ اگر ایسے علاقے
میں مثلاً بمبئی ، کراچی ، یا دکن ، یونا وغیرہ جہاں سردی
نہیں ہوتی ، چلا جاؤں تو کیا یہ دورے بند ہو جائیں گے یا ان کی
شدت بند ہو سکے گی ؟ ایک بات اور رہ گئی کہ اگر
یہ امر ثابت ہو کہ علاج ہو سکتا ہے اور بیجا پور کے سول سرجن
انے کام میں ہے نظر ہیں تو چنانچہ ڈاکٹر صاحب آپ کو مجھے
لے جانا پڑے گا کیوں کہ میری ایسی حالت نہیں رہی کہ تنہا
سفر کر سکوں ، بالخصوص ایسا لمبا سفر ۔ یہ بھی یاد رہے کہ
صرف نومبر ہی ایسا مہینہ ہے جس میں میں سفر کر سکتا ہوں ۔
اگلے مہینے میں سردی کی شدت ہو جائے گی اور میں دس قدم بھی
نہیں چل سکوں گا ۔“

لیکن اس سال وہ باوجود کم زوری کے کافی مدت تک دوروں سے
محفوظ رہے ۔ انہی دنوں انہوں نے بے نواسنامی والا مضمون
قبال صاحب کو بھیجوا یا ۔ بلکہ یہ شرط صحت اور مضمون روانہ کرنے
کا وعدہ بھی کیا ۔ ڈاکٹر عبدالستار صاحب مدینی نے ہندوستانی اکیڈمی
کی جانب سے انہیں ایک ماحصلہ خطبات دینے پر رضا مند کرنا چاہا ۔
ن کو جواب میں لکھتے ہیں :

”سالانہ لیکچروں کے سلسلے میں اکیڈمی میں میرا نام تجویز کرنے
کا آپ کا ارادہ میری عین عزت افزائی ہے جس کا میں حقیقت میں
مستحق نہیں ۔ پہلا میں ایسے خدا ساز امر سے کہوں انکار کرنے
لگا ، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کی یہ دعوت میرے حق میں :

اب تک میں نے انکڑ کیا اور ابھی تک اس خیال کا حاسی ہوں
یعنی اس سے جدا ہونے پر تیار نہیں ۔

اب آپ کا عظمت نامہ آتا ہے ۔ میں حیران ہوں کہ کیا جواب
دوں ۔ گورم مشکل و گر نہ گورم مشکل ۔ لیکن میں اپنے مجموعے
کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے پر تیار نہیں ہوں ۔ اگرچہ میں جانتا
ہوں کہ میں اسے زیادہ عرصے تک محفوظ رکھنے پر قادر نہیں
رہوں گا ، تاہم آپ کو مشورہ دوں گا کہ اگر آپ ارادہ کرتے
ہیں تو پورے مجموعے کے واسطے تیار ہوں ۔ سکھ شناسی کے
فن میں تینوں قسم کے سکوں کا موجود ہونا ضروری ہے ۔
غالی تانبا یا خالی چاندی یا دونوں سے کام نہیں چلے گا ۔ یہاں تو
خانہ در خود بول ہونا چاہیے ۔ ساتھ ہی مجھے اس قدر موقع دینا
چاہیے کہ میں ان سے جدا ہونے پر تیار ہو جاؤں ۔ آپ اشرافیوں
سے کہہ رہے ہیں ۔ میرے پاس اشرافیوں کے گاہک زیادہ
آتے ہیں ۔“

آخر انہیں مولوی صاحب موصوف کی خواہش کے آگے سر تسلیم
خم کرنا پڑا جنہیں وہ عزت سے پیر جی کہا کرتے تھے ، یعنی وہ
مجموعے کے ٹکڑے کرنے پر راضی ہو گئے لیکن مقطع میں سخن گسترانہ
بات آ پڑی ، یہ قصہ انہی کے الفاظ میں سنئے ۔ پروفیسر اقبال صاحب
کو لکھتے ہیں :

”پیر جی کا تلمذ نامہ آپ کے ملاحظے کے واسطے ملفوف ہے ،
دیکھ کر واپس کر دیجیے ۔ میں نے پانچ ہزار چاندی کے سکوں
اور تین ہزار تانبے کے سکوں کے دس ہزار مانگے تھے اور یہ
موجودہ بازار کو دیکھتے ہوئے سستی قیمت ہے ۔ لیکن انہوں نے
اس رقم کا نصف دینا منظور کیا ہے ۔ ایک ادنیٰ امر یہ ہے کہ
ٹونک کا روپیہ جسے ریاست ٹونک نے تین سال ہونے بند کر دیا ہے
اور جو انگریزی سکے کے مقابلے میں ہمیشہ پانچ آنے کا بٹہ
کہاتا تھا ، آج کل بازار میں صرف چاندی کے لحاظ سے اس کی قیمت

ذیرہ رویہ انگریزی ہے۔ مغلوں اور قبل مغل سکون کی قیمت تو اس سے بہت زیادہ ہے۔ میں اس بارے میں پھر جی سے بحث کرتی خلاف ادب سمجھتا تھا۔ دل کٹا کر کے اور ڈھٹ بن کے انکار تو کر دیا ہے مگر بے حد شرمندہ ہوں۔ اور میں ابھی کیا کروں۔ میری یہ رویہ مزاجی پر بنائے احتیاج ہے۔ چند یوم میں صرف انہی سکون پر میرے اخراجات کا دار و مدار ہوگا۔ براؤیلنٹ فنڈ تو نصف سے زیادہ لاہور ہی میں ختم ہو چکا تھا، باقی کتابوں کی قیمت سے یہ چار سال گزارے۔ اب خرچ بڑھ رہا ہے، صحت تباہ ہو رہی ہے۔ اب جب ناداری بالکل قریب آ رہی ہے مجبوراً بھیل بن رہا ہوں۔ اس کا مجھ کو افسوس ہے اور شرم بھی۔“

آخر کار پٹنہ کے ایک مارواڑی سیٹھ رادھا کرشنا جالان ان کا مجموعہ مسکوکات حاصل کرنے کے لیے ٹونک آئے اور تیس ہزار روپے کے عوض انہوں نے بڑی حسرت کے ساتھ اس مجموعے کو الوداع کہا۔ اس کے ساتھ ہی دو تین علمی کتابیں بھی تھیں جو سکون کے مطالعے میں اہمیت رکھتی تھیں۔ رقم کی وصولی کے لیے وہ جے پور تک جالان کے ہمراہ گئے۔ مسٹر جالان اس مختصر ملاقات میں ان سے بہت متاثر ہوئے اور پشہ پہنچ کر انگریزی میں ایک عقیدت مندانہ خط لکھا جس میں انہیں پٹنہ آ کر اپنا کتب خانہ دیکھنے کی دعوت دی۔ اس کا انگریزی میں جواب دیتے ہوئے انہوں نے جون ۱۹۵۵ء میں لکھا :

”میرے سکے میرے بہترین ساتھی تھے جن کی صحبت میں کئی کئی گھنٹے بلکہ دن صرف کیا کرتا تھا۔ وہ مجھے بہت یاد آتے ہیں۔ آپ کا کتب خانہ دیکھنے کا میں بہت مشتاق ہوں لیکن اتنے لمبے سفر کا مسئلہ کیوں کر حل ہوگا۔“

اب ان کی علمی دل چسپی کے مراکز ایک ایک کر کے ساتھ چھوڑ چکے تھے اور بے دلی اور تھکن ان پر غلبہ پا رہی تھی۔ ۱۹۵۶ء کو ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب کو لکھتے ہیں :

نمبری صحت پہلے سے بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ رات کو بارہ بجے سے ہانپنی لگ جاتی تھی۔ صبح تک لگی رہتی تھی، بیٹھ کر کھانا کھانا پڑتا تھا، نیند نہیں آتی۔ ایک آدمہ دفعہ دورہ بھی پڑ گیا۔ برسوں پڑا تھا۔ میں عنقریب اگر زندہ رہا تو صاحب لراش ہو جاؤں گا، چلنا پھرنا تو ویسے ہی بند ہے۔ آپ کے کام کی کوئی کتاب اگر آتی تو میں خرید رکھوں گا۔ آج کل غریبوں کا موسم ہے، آئے ہو تو آجاؤ۔ ابھی میں زندہ ہوں، بعد میں تمہیں چاہن کون پوچھے گا۔“

اسی طرح پروفیسر فضل الدین صاحب قریشی کو جو جون کے مہینے میں ٹونک آنے کا ارادہ کر رہے تھے، اپنا پروگرام اگلے سال تک ملتوی کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس خط میں زندگی سے نا اہدی کی کیفیت کا اظہار ہے :

”میں نے آپ کو مئی میں بلایا تھا، اس وقت موسم ٹھیک تھا۔ غریبوں سے موجود تھے، فالیز میرے ہاں بھی تیار تھی۔ اب غریبوں سے بالکل غائب ہیں، فالیزیں جل کر آندھیوں کے حوالے ہوئیں۔ لاہور سے ٹونک تک آنے کی تکالیف کے بعد کچھ تو نعم البدل ملنا چاہیے، اس لیے مہربانی کر کے اپنی آمد کا ارادہ آئندہ مئی ۱۹۴۶ء تک ملتوی رکھیے۔ آپ مئی کے پہلے بندھو ہواڑے میں آئیں، یعنی ۱۵۔ مئی کو آ جائیے یہ شرطیکہ یہ معلوم ہو جائے کہ میں جیتا ہوں۔“

اس سال وہ زیادہ تر ندی میں پر رہے۔ چھوٹی دادی جان ان کے پاس رہتی تھیں اور ہم لوگ آنے جاتے رہتے تھے۔ وہ قدرتی مناظر سے نطف اندوز ہوتے اور چارہائی پر پیشے مختصر سا کام کرنے یا دوستوں اور شاگردوں کے خطوں کے جواب دیتے۔ ان کے احباب کے حلقوں میں ان کی مخلوش حالت کی بنا پر بڑی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ پروفیسر حبیب اشرف صاحب ندوی انہیں ایک خط میں لکھتے ہیں :

”والا نامہ ابھی ابھی موصول ہوا۔ اس حالت میں بھی اپنے

نہاڑ مندوں کو نہ بھولنا معراج محبت اور دہریے لیے باعث صد نازش و افتخار ہے۔ اللہ پاک آپ کو صحت عاجل اور حیات غمخیزی عطا فرمائے ورنہ یقین جانیے کہ آپ کے بعد خاکم بدھن سٹانا ہی سٹانا ہے۔ اللہ پاک ادب و تاریخ ہی کے لیے آپ کو صحیح و سلامت رکھے۔ آمین۔“

ان ہی دنوں انہوں نے ندی کے ڈھاوے پر ایک مختصر سا مکان بنوانا چاہا تاکہ چھوٹیڑی کی بار بار مرمت سے بچات ہو۔ اس غرض سے تھیں مکمرکز سرکاری زمین پر رائے نام قیمت پر حاصل کی۔ یہ زمین ان کے لکوائے ہوئے باغ کے قریب ہی تھی۔ مکان کی دیواریں کھندوائی گئیں لیکن تعمیر کی نوبت نہ آسکی۔

۱۹۷۷ء کے وسط میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب نے انہیں علم عروض پر مارچ ۱۹۷۷ء تک ایک کتاب لکھنے پر آمادہ کیا۔ اس سلسلے میں جواب دہنے ہوئے لکھتے ہیں :

”یہ برلش میوزیم کی لائبریری تو ہے نہیں کہ انسان تمام دنیا سے بے نیاز ہو کر صبح کے آٹھ بجے سے رات کے آٹھ بجے تک بیٹھا کام کرتا رہا اور جس کتاب کی ضرورت ہوئی دو منٹ میں حاضر کردی گئی۔ یہ هندوستان ہے جہاں کوئی جامع کتب خانہ موجود نہیں بلکہ اس کا تخیل تک مفلود ہے۔ کتابوں کی تلاش میں انسان کو در در خاک بسر ہونا پڑتا ہے۔“

اس کے بعد مجوزہ کتاب کا ایک مختصر خاکہ بیان کیا ہے پھر کہتے ہیں :

”اس کے لیے آئندہ مارچ تک تیار ہو جانا نہایت دشوار ہے۔ آپ مارچ ۱۹۷۷ء تک مجھے وقت دیجیے۔ بہر حال کام ہو تو اچھا ہو، جلد بازی سے کیا حاصل۔ میں اپنی بیماری کا بھی تو خیال کر رہا ہوں۔ آج کل برسات میں شاید طبیعت درست رہے لیکن سردی بھی تو آ رہی ہے۔“

اس منصوبے پر ان کی وفات کی وجہ سے عمل نہ ہو سکا۔

کاشت کاری میں وہ تفریح کے طور پر لٹے لٹے تجربے کرتے تھے ۔
برسات کے موسم میں پروفیسر اقبال صاحب کو لکھ کر سردے کے
بیج منگوائے اور ان کو طریقہ کاشت معلوم کر کے لکھنے کے لیے کہا ۔
اسی خط میں اپنی صحت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

”میری صحت جلد جلد گرتی جا رہی ہے ۔ خدا جانے کانوں پر
کیا مصیبت آئی ہے ۔ پچھلے دو ہفتوں سے جوا ہو گیا ہوں ۔ کھانے
کے واسطے صرف دو ڈاڑھیں رہ گئی تھیں ، اب دونوں نے ایک دم
سے جواب دے دیا ہے ۔“

۱۹۴۷ء کے آخری مہینوں میں ان پر عجب حسرت و یاس کا عالم
طاری تھا ۔ طبیعت کے اس اندوہ کا اظہار انہوں نے چند اشعار میں کیا ۔
ان اشعار کا اندواج یہاں بے محل نہ ہوگا ۔

اُنی نسیم باغ میں صرخ سحر چلے
اے ہا فکرِ اُلہ کہ قرے ہم سفر چلے
ظاہر ہوا اس آند و شد کا نہ مدعا
آئے تھے بے خبر وہی ہم بے خبر چلے
بیٹا کیسے نصیب کا لکھا تمام عمر
جس کام کو ہم آئے تھے وہ کام کر چلے
جائے ہیں خالی ہاتھ گلستانِ دہر سے
اک سنگ آرزو ہے جو سینے پہ دہر چلے
اے رہروانِ منزل ہستی ہٹاؤ تو
آئے ہو تم کہاں سے یہاں اور کدھر چلے
ستہ بوجہ بزمِ بار کا احوال ہم صغیر
ہستے ہوئے ہم آئے تھے با چشمِ تر چلے
ہم ایسے ٹھہرے منزلِ ذاتی میں جس طرح
آئے سرا میں شب کو مسافرِ سحر چلے

فرست لہجہ کی نہ ملی باغ دھرم میں
 مثل نسیم ہم ادھر آنے ادھر چلے
 اللہ خیر کیجیو رخصت ہیں گہات میں
 آنے میں لوگ قافلے کے بے خبر چلے
 محنوں و کوششوں کے اور ہم بھی جائیں گے
 یعنی وہ ہم سے چند قدم پیشتر چلے
 ہر قدم پہ بے پناہ کھٹکا لگا ہوا
 دھرو نہ راستے میں کبھی بے خطر چلے

ان کے علاوہ تین شعر اور تھے :

ماتا کہ تصرف میں ہے وہ ساء ہے لے نسا ماسی
 بے چین بیت رہتا ہے جس سر پہ ہے تاج شاہی
 لے توشہ رہ ساتھ اپنے اور کسوج کی کسر تیاری
 تنہا بچھے جانا ہوگا، ہوگا نہ کسوں ہمراہی
 ہر شے ہے فنا آمادہ ادنیٰ ہو وہ یا ہو اعلیٰ
 درویشوں کی کیا درویشی، کیا شاہوں کی شاہنشاہی

شعر کہنا وہ کبھی کا چھوڑ چکے تھے لیکن جذبات کے ہاتھوں
 مجبور ہو کر انہوں نے یہ اشعار سوزوں کہے۔ ان سے صاف نظر آتا ہے
 کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ سب سے عجیب بات یہ
 ہے کہ وہ ان اشعار کو بلا نالغہ دن میں کئی کئی بار پڑھتے اور ترمیم
 سے پڑھتے۔ وہ منظر اب بھی میری آنکھوں میں بھر رہا ہے ! ندی
 پر وہ اپنی چارپائی کے اوپر تکیوں کے سہارے نیم دواز ہوتے، دونوں
 ہاتھ سر کے پیچھے باندھے خلا میں نہ معلوم کیا کیا کرتے اور اسی
 حالت میں بڑی غم ناک آواز سے مندرجہ بالا اشعار گنگاتے۔ انگریزی
 محاورے کے مطابق در اصل یہ ان کا ”فلس کا نغمہ“ تھا۔

سردہاں خدا خدا کسر کے گزر رہی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی
 دورہ پڑ جاتا۔ اس خیال سے کہ نہ معلوم کس وقت ڈاکٹر کی ضرورت

پڑ جائے ، انہوں نے ندی پر رہنا ترک کر دیا تھا ۔ نیا سال شروع ہو گیا ۔ جنوری ۱۹۹۶ء کے وسط میں انہیں ایک اور تشویش لاحق ہوئی ۔ حکومت نے ہزار روپے کے نوٹوں پر باہمی عائد کر دی ۔ سکوں کی قیمت کے طور پر وصول شدہ رقم انہی نوٹوں کی شکل میں تھی اور ٹونک میں ان کی تبدیلی کا کوئی انتظام نہ تھا ۔ چنانچہ انہیں یہ نوٹ لیے کر جے پور جانا پڑا ۔ اتفاق سے وہاں بھی کاپیائی نہ ہوئی ۔ ان کے دوست صاحب زادہ ولی احمد خاں دہلی گئے ہوئے تھے ۔ ان کے صاحب زادے خلیل احمد خاں کو ساتھ لے کر انہوں نے بھی دہلی جانے کا ارادہ کیا ۔ ۱۷ء ۔ جنوری کو باغ جنوری والا ، جے پور سے میرے نام ایک مختصر سا خط لکھا :

”میں رات کے دو بجے یہاں پہنچا ۔ یہاں مجھے کوئی کاپیائی نہیں ہوئی ، سوائے اس کے کہ فارم ٹائپ کرائی ۔ آج رات کو خلیل میاں کے ساتھ دہلی جا رہا ہوں ۔ صاحب زادہ ولی احمد خاں وہیں ہیں ۔ شاید ان سے کلو پر آوی ہو سکے ۔ باقی خبریں یہ ہیں۔“

لیکن وہ دہلی نہ جا سکے ۔ جے پور کے اسٹیشن پر تھے کہ دورہ پڑا ، بہت گھبرائے ۔ رقم خلیل میاں کے حوالے کر کے فوراً گھر لوٹ آئے ۔ اس کے بعد ان کی گری ہوئی طبیعت نہ سنبھلی ۔ دو چار دن گھر ٹھہر کر ایک دن دل گھبرائے لگا ۔ مجھے ، دادی جان کو اور اپنی عیشیہ کو ساتھ لے کر ٹانگے میں ندی پہنچ گئے ۔ چار باغ روز وہاں رہے ۔ سردی غضب کی پڑ رہی تھی اس لیے واپس آنا پڑا ۔ انہی دنوں دھن سے رویہ آیا ۔ ٹونک میں جدید طرز کا کوئی بینک نہ تھا ۔ دو ہندو سیٹھ ساموکارے کا کام کرتے تھے ۔ یہ اجسیر والے اور وتلام والے کر کے مشہور تھے ۔ باوجود کمزوری کے خود سوار ہو کر وتلام والوں کے ہاں گئے اور ہم جن بھائیوں کے نام رویہ جمع کروا کے آئے ۔

چند روز بعد ایک دن پھر ندی پر چانے کو کہا ۔ دادی جان کے ایما پر میں نے عرض کی کہ باہر نادل ہو رہا ہے اور بارش کے آثار

ہیں۔ خاموش ہو گئے لیکن دوسرے دن پھر اصرار کیا۔ سہارا دے کر تانکے میں سوار کرایا گیا۔ فرمائے لگے ”ایسی زندگی ہے تو موت بہتر ہے کہ انسان دوسروں کا محتاج ہو جائے۔“ اب ان پر غصہ دگنی طاری رہنے لگی تھی۔ اگلے دن پوچھنے لگے ”ہم کہاں ہیں“ بتایا گیا۔ پھر دریافت کیا ”میں یہاں کیسے پہنچا“ عرض کیا ”ہم آپ کو تانکے میں لے کر آئے تھے۔“ بولے ”اچھا!“ اس سے پہلے متعدد بار اپنا مزار ندی پر بنوانے کا خیال ظاہر کر چکے تھے۔ اس دن پھر تاکید کی، کہنے لگے شہر کے قبرستان میں میرا دل گھبرائے گا۔ دوسرے دن بولے ”مجھے شہر لے جاؤ، شفاخانے میں داخل کروا کے تم لوگ گھر چلے جانا۔“ شہر لے کر آئے لیکن ہسپتال میں داخل نہیں کروایا۔ گھر کی نچلی منزل میں ٹھہرنے سے انکار کر دیا، جہاں چہ ایک عزیز نے گود میں لے کر اوپر پہنچایا۔ یہ ۱۴۔ فروری کا واقعہ ہے۔ ان کے متوفی دوست ڈاکٹر ڈیسائی کا چھوٹا بھائی بھی ڈاکٹر تھا۔ ہمیشہ اسی سے علاج کراتے تھے۔ اسے بلوایا گیا۔ اس نے مارلیا کا لپکا لگا دیا۔ اس کا اثر دو دن تک رہا۔ بے ہوشی کے عالم میں بار بار چونکتے۔ آخر ہندوہ فروری کو سول سرجن آیا۔ اس نے معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ انہیں دوا کی نہیں آرام کی ضرورت ہے۔ یہ جمعے کا دن تھا اور ربیع الاول ۱۳۶۶ھ کی بارہ تاریخ تھی۔ اسی رات سوا دس بجے ان کی روح نفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ ”کل من علیہا فان و یبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام“ دوسرے دن ان کی وصیت کے مطابق ندی کے کنارے مکان کے لیے کھدی ہوئی بنیادوں کے درمیان ان کا جسدِ خساک سپردِ خاک کر دیا گیا۔

پہر بہار گل از زیر گل برآرد سر

گلے ہرقت کہ ناید بہ صد بہار دگر

ان کے بعض مداحوں اور دوستوں نے وفات کی تاریخیں کہیں۔

سید ہاشمی صاحب فرید آبادی کی کہی ہوئی تاریخ جو رسالہ ”ہاوی زبان“

میں شائع ہوئی تھی، درج ذیل ہے :

برہمچاری تھا ، دنیا سے گیا ، دنیا نے اس کو جانا کم
 روئے گا اے اب کون جہاں ، ہاں عالم علم کرے مام
 ہو اصل یہ قاتل جہاں فانی ، اور وہم حقیقت پر غالب
 اس ملک ملیم پرور میں کم ہو زر خالص تو کیا غم
 بت جعل و رہا کئے توڑ کیا ہاں نام وہ اپنا چھوڑ گیا
 محمود کئے کرز سے کیا کم تھی شہزادی کی شمشیر قام
 اس رحلت غم انگیز پہ میں تاریخ وفات کی فکر میں تھا
 برجستہ کہا ہاتف نے کہ ”قل موت العالم موت العالم“

۱۳۶۶ھ

میں اپنی جانب سے حافظ صاحب مرحوم کی سہرت اور علمیت پر
 رائے زن کرنا سوئے ادب خیال کرنا ہوں اس لیے ان کی وفات پر ہلور
 تعزیت آئے ہوئے بہت سے خطوط میں سے چند اقتباس سپرد قلم کیے
 دیتا ہوں ۔

مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا :

”الفسوس حد ہزار الفسوس! ایک ایسا شخص ہم میں سے الہ کیا
 جو اپنے اخلاق و سہرت اور علمی ذوق اور تبحر میں اپنی آپ
 نظیر تھا ۔ ان کی موت ایک تومی سانحہ ہے ۔“

علامہ سیاب اکبر آبادی :

”علامہ مرحوم دنیائے علم و ادب کے محسن اور فیض رسانی بزرگ
 تھے مولانا کے علمی کارنامے زندہ ہیں تو گویا وہ
 خود زندہ ہیں ۔ موت تو جاہلوں کو آتی ہے ، ارباب علم و خبر
 کی موت زندگی سے کم نہیں ہوتی ۔“

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی :

”اصل صدمہ یہ ہے کہ ایسا شخص ہم سے الہ گیا جس کا مثل
 لاکھوں میں ایک نہیں ملتا ۔ مرحوم کھائے میں نہیں رہے ۔ ہم

جو زندہ ہیں ان کو ایسا بڑا نقصان اٹھانا پڑا کہ ایسی ذات ہے
مرحوم ہو گئے جس کا ہر لمحہ علم کے نذر تھا اور جس کی زندگی
کا ہر دن ہمارے لیے علم کا ایک تحفہ پیش کرتا تھا۔“

سر شیخ عبدالقادر :

”بھئی اس خبر سے بہت صدمہ ہوا۔ نہ صرف اس لیے کہ مرحوم
میرے گہرے دوست تھے بلکہ علمی اور ادبی دنیا کے لیے ایک
منبع فیض تھے۔ ان کی جگہ آسانی سے پر نہ ہو سکے گی.....
انہوں نے جس اثاثہ کے ساتھ علم کی خدمت کی انہی کا حصہ تھا۔“

سید حاشمی فرید آبادی :

”تعلقات ذاتی کے علاوہ میرے دل میں مرحوم کے علم و فضل
کی ایسی وقعت تھی کہ بیان کرنا مشکل ہے۔ افسوس ہے ہمارے
جہالت پسند ملک نے ان کی جیسی چاہیے قدر نہ کی۔ مگر مجھے
یقین ہے کہ ایک زمانہ آنے کا جب ان کے فضائل علمی کا لوگ
حیرت کے ساتھ اعتراف کریں گے۔“

پروفیسر سید طلحہ :

”وہ ان اصحاب میں سے تھے کہ رفیق و آدمیت را بخاک بردند۔
اہل علم و فضل کو حق ہے کہ ماتم کریں اور غلص احباب
کی جماعت کو حق ہے کہ خوب آنسو بہائیں.....معاشرت سے
آدمی کی قدر نہیں معلوم ہوتی۔ کون شخص ہے جو کسی نہ
کسی طرح ہمارے باپ کا بیٹوں نہ ہوگا۔ اگر کوئی ادب سے تو
اس کو علم و فضل کی دولت سے فائدہ پہنچا ہوگا، کسی کو
اقتصادی نفع پہنچا ہوگا، کسی کو اور طرح سے۔ اس قدر
عمیم الاحسان، کثیر الافادہ آدمی اس دور میں کہاں۔ ہمارے
خاندان کے لیے فخر خاندان، وطن کے لیے فخر وطن۔ احباب کو
ان پر جس قدر فخر و تاز تھا وہ اس سے زیادہ کے مستحق تھے۔“

پروفیسر سید عبدالقادر اسلامیہ کالج لاہور :

”مہجوم میرے دیرینہ کرم فرما اور دوست تھے۔ نہایت

خوش اخلاق اور ہم درد انسان تھے۔ ان کی وفات سے ایک بے نظیر اور مہربان مریخ انسان دنیا سے اٹھ گیا ہے۔

علم و فضل کے اعتبار سے شیرانی صاحب کو پھر العلوم کہا جائے تو بجا ہے..... ان کے تحقیقی مضامین ان کی وسعت معلومات کا زندہ ثبوت ہیں۔ بڑے بڑے فاضل ان کے سامنے خم کھاتے تھے اور علم دوست حضرات ان کے سامنے زانوئے ادب نہ کرنا اپنے لیے باعثِ عدا افتخار سمجھتے تھے۔“

پروفیسر شریف علی ، وکٹوریہ کالج ، گوالیار :

”جو جو احساناتِ استاد مرحوم کے مجھ پر ہیں ، ان کا بیان میری طاقت سے باہر ہے۔ ان کا فیض عام تھا ، ہر شخص کو ان کی ذات گرامی سے فائدہ پہنچا۔ استاد مرحوم میرے حال پر خاص طور پر مہربانی فرماتے تھے۔ اکثر میں اس سرچشمہ مہر و محبت و علم و فضل سے سیراب ہوا۔“

پروفیسر نجیب اشرف ندوی ، اماعیل کالج ، بمبئی :

”وہ ہم سب کے باپ تھے اور اگرچہ میں نے ان سے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن میں ان کو ہمیشہ اپنا استاد سمجھتا تھا اور آپ نے از راہِ شفقت بزرگوارہ مجھے یہ عزت دے رکھی تھی کہ میں اپنے کو ان کا شاگرد سمجھوں۔ اس غم میں ہم کیا ساری علمی دنیا آپ کی شریک ہے۔“

پروفیسر ابراہیم ڈار ، احمد آباد

”شیرانی صاحب کی موت کا الم انگیز سانحہ علم و تحقیق کی موت ہے..... حیران ہوں کہ ان کی کس کس خوبی کو یاد کر کے روؤں۔ وہ محض ایک فاضل متبحر ، نام و و محقق اور وسیع النظر ناقد ہی نہ تھے بلکہ ایک شفیق استاد ، مہربان دوست اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک نہایت ہی اچھے انسان بھی تھے۔ مرحوم کے تمام احباب و تلامذہ کے دلوں پر ان کے مکارم اخلاق کا نقش ثبت ہے۔ مدتوں اہل علم کی نگاہیں اس شیرِ پیشہ تحقیق

کو ڈھونڈھا کریں گی۔ نقد و تحقیق کی محفل کے اس صدر نشین کے اٹھ جانے کے بعد ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پر ہونا محال ہے۔“

ڈاکٹر سید عبداللہ :

”حادثہ اتنا سخت اور غم اتنا گہرا ہے کہ قلم تفصیل کا مشعل نہیں ہو سکتا۔ بابا کا ماتم کیسے کروں۔“ ”مقتور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ کر کو میں“ ”خدا کی قسم دل شق ہو رہا ہے۔“

جناب ایس۔ اے رحمان :

”ان کے اٹھ جانے سے ادبی دنیا میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ کم لوگ ان کے تبحر علمی تک پہنچ سکیں گے۔“

عاشق حسین بٹالوی :

”آج یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ ایک عالم کی موت واقعی ایک عالم کی موت ہے..... یہ نقصان تنہا آپ کا نقصان نہیں بلکہ اس میں سارا ہندوستان شریک ہے۔ علمی دنیا میں مرحوم کا جانشین یا لائی پیدا ہونا محال ہے۔ ان کی خویاں ان کے ساتھ ہی رخصت ہو گئیں۔“

حافظ صاحب مرحوم نے لاہور سے ٹونک آجائے کے بعد اپنے شوق کے ہاتھوں بھبور ہو کر پھر کوئی ایک ہزار کے لگ بھگ کڑ آمد کتابیں جمع کر لی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد ہماری خواہش تھی کہ یہ بھی یونیورسٹی لائبریری میں ان کے مجموعہ کتب کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ چنانچہ پروفیسر اقبال صاحب کے توسط سے یہ معاملہ انجام پایا۔ سکون کا البتہ انسوس رہا اور رہے گا۔ علاوہ ازیں بعض دیگر آثار قدیمہ جن میں کئی ہزار تاپنے کے سکے بھی شامل تھے، تسلیم ملک کے بعد قتل مکانی کی بیہوش چڑھ گئے۔ لیکن سب سے بڑا نقصان

۱۔ قتل مکانی کے وقت مکان میں جو سامان چھوڑا گیا اس میں تانبے کے سکون کے کئی ٹوڑے اور ایک بوری برات تھی۔ وہ ایک کمرے میں دوسرے سامان کے ساتھ مغلل کیے گئے۔ یہ سامان اور سکے لٹ گئے۔

مردم کے تحریر کردہ ان کاغذات اور غیر مطبوعہ صفحات کا ہوا جو اس المراقبہ میں برہاد گئے ۔

میں یہ مقالہ استاذی ڈاکٹر سید عبدالقہ کے مضمون ”کتاب خانہ شیرانی کے نواذر“ (مطبوعہ رسالہ اردو باہت جولائی ۱۹۴۶ء) کے اس اقتباس کے ساتھ ختم کرتا ہوں :

”پروفیسر شیرانی ہمارے دور کے بہت بڑے نقاد مورخ تھے ۔ وہ واقعات کی صحت و صداقت پر جان دیتے تھے اور اس معاملے میں کسی غلطی اور غلط بیانی کو معاف نہ کر سکتے تھے ۔ سچائی کی تلاش ان کا ایمان تھا جس کی خاطر انہوں نے بڑی بڑی شخصیتوں کی بھی پروا نہ کی ۔ انہوں نے تاریخ و ادب کی بڑی بڑی غلطیوں کی اصلاح کی اور ایسے ایسے پختہ نظریوں کے طاسم کو توڑا جن کی جڑیں علمی دنیا میں بہ طور ایک حقیقت ثابتہ کے راسخ اور پکی ہو چکی تھیں..... بعض روایت پر وہ اعتقاد نہ کرتے تھے بلکہ دریافت کو بھی کام میں لانے تھے..... اگرچہ شیرانی صاحب کے تعمیری کاموں کی کچھ کمی نہیں ، پھر بھی ادب اور تاریخ کے بہت سے غلط نظریوں اور عقیدوں کو انہوں نے جس شدت اور قوت کے ساتھ توڑا اس کی بنا پر اگر انہیں..... بہت شکن کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔“

مقالات

ریختہ

(از "اورینٹل کالج میگزین" بابت مئی ۱۹۲۶ء)

اردو زبان کو ریختہ کہنے کی وجہ تسمیہ میں ہمارے تذکرہ نگاروں نے عجیب عجیب قیاس دوڑائے ہیں۔ منشی درگا پرشاد صاحب نادر خزینۃ العلوم میں کہتے ہیں :

"ریختہ بمعنی گرمے ہوئے کے ہیں ؛ پس جو زبان اپنی اصلیت سے گر جائے اس کو زبان ریختہ بولتے ہیں۔ چنانچہ جیسے فارسی زبان میں عربی کے لغت شامل ہوئے اسے زبان ریختہ فارسی کہتے ہیں۔ اسی طرح حسب تقریر بالا زبان ریختہ ہندی کو زبان اردو^۱ سمجھتے ہیں۔" (خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم ، صفحہ ۶۱ مطبع مفید عام ، لاہور ۱۸۷۹ء)۔

حضرت آزادؒ آپ حیاتؒ میں فرماتے ہیں :

"اس زبان کو ریختہ بھی کہتے ہیں ، کیوں کہ مختلف زبانوں

۱۔ اس عقیدے کے برخلاف مولوی فضل حق غیر آبادی اپنے رسالے 'تحقیق الفتویٰ' میں اسی زبان اردو کو 'ریختہ اردو' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں :

"سوال - جہ می فرمایند علماے دین متین و مفتیان مخلصین از اہل صدق والیقین در حق کسی کہ یک رسالہ بزبان ریختہ اردو در بیان بعض مسائل اعتقاد بہ برائے تلقین عوام کہ سواد فارسیست ہم ندارند تالیف دادہ . . . الخ"

اس طرح دیکھا جاتا ہے کہ ریختہ ہندی اور ریختہ اردو میں کوئی فرق نہیں رہا اور حضرت نادر کا نظریہ غلط ہم گیا۔

نے اسے ریختہ کیا ہے؛ جیسے دیوار کو اینٹ، مٹی، چونا اور
سلیدی وغیرہ سے ریختہ کرتے ہیں۔ یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہیں
گری بڑی پریشان چیز؛ چونکہ اس میں الفاظ پریشان جمع ہیں
اس لیے اسے ریختہ کہتے ہیں۔“

ساحب جلوۂ خضر بیان کرتے ہیں :
”اس زبان کا نام ریختہ شاہجہان کے وقت میں رکھا گیا۔ چونکہ
ریختہ کچ کو کہتے ہیں، پختگی کے لحاظ سے اس کو ریختہ
کہنے لگے۔“

ہمارے مخدوم حضرت سرخوش ’اعجاز سخن‘ میں رقم طراز ہیں :
”اگرچہ لفظ ریختہ کے فارسی میں کئی معنی ہیں مگر زبان
کے تعلق سے فطرتاً اس سے ٹوٹا بھوٹا یا شکستہ ہی مراد لی
جا سکتی ہے۔“

فارسی زبان میں ریختن متعدد معنوں میں آتا ہے۔ اور معنوں سے
تعلق نظر وہ ایجاد کرنے، کسی چیز کو قالب میں ڈھالنے، نئی
چیز پیدا کرنے اور موزوں کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے۔
مثلاً ریختن بنا و ریختن توب۔ نظیری نوشاہوری :

ہر طرف رنگے بہ کلی بسرشتہ شد
قالب گہر و مسلای ریختہ

البرالدین :

سبحان اللہ ز فرق سر تا پایت
در قالب آرزوی من ریختہ اند

مثال دیگر :

بر بھی خیزد چو من افتادۂ از روئے خاک
می توان صد بید مجنون ریختن از سایہ ام

مثال دیکھو :

و آنکہ از آہاس ہر جان ما
نیخ ابرو رنج مرگن ریختہ

مثال موزوں شد :

مصرع زلف بتاں چوں بر زبان شادہ ریخت
موشگالان را کلید گفتگو دندانہ ریخت

جہاں ریخت مصرع اول میں یہ معنی موزوں شد ہے ۔ یہی حالت مصرعہ ریختہ و معنی ریختہ کی ہے ۔ اس کا اطلاق ایسے مصرع یا معنی پر ہوتا ہے جو بے تکلف و نامل ذہن میں آ جائے ۔ طعنا :

دارم جوشاند حیرتا رونے دہد
چوں مصرعہ زلف مصرعہ ریختہ

لیکن ہندوستان میں ریختہ نے ساتویں قرن ہجری میں نئے معنی پیدا کر لیے ۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب امیر خسرو دہلوی نے ایرانی اور ہندوستانی موسیقی کے امتزاج سے ایک نئی چیز پیدا کی اور اس کے لیے نئی اصطلاحات مثلاً قول ، ترانہ ، معروف ، صوب ، بسیط ، دو بحر ، چہار اصول ، نقش ، فارسی ، غزل وغیرہ وضع کیں وہاں ریختہ کی اصطلاح بھی ایجاد کی ۔ اس اصطلاح سے موسیقی میں یہ مقصد قرار پایا کہ جو فارسی خیال ہندوی کے مطابق ہو اور جس میں دونوں زبانوں کے سرود ایک راگ اور ایک تال میں بندھے ہوں اس کو ریختہ کہتے ہیں ۔ ریختہ کے لیے کسی پردے کی قید نہیں ہے ، وہ ہر پردے میں باندھی جا سکتی ہے ۔ میں اپنی سند کے اصل الفاظ ذیل میں نقل کرتا ہوں :

”و اصطلاح دیکر آن کہ ہر ’فارسی‘ کہ یا مضمون خیال ہندوی مطابق باشد و الفاظ ہر دو زبان را دو یک تال و یک راگ پر بست نموده باشند و انضمام و اتصال دادہ سرایند آن را ریختہ گویند و این ریختہ را در ہر پردہ می بندند و ذوق و لذت افزوں می دهند ۔“

اس عبارت میں 'خیال' اور 'فارسی' قابل تشریح ہیں۔ خیال کسی شرح کا محتاج نہیں کیوں کہ اب بھی موسیقی میں اس کا رواج ہے۔
وہی فارسی اس کے لیے میری سند کے یہ الفاظ ہیں :

”فارسی اصطلاحی آن وا نام نہند کہ یک بیت را با تافاتی مقرون
ساختم بر ہست کنند۔“

گویا ریختہ کا اطلاق ایسے سرود پر ہوتا تھا جس میں ہندی اور
فارسی کے اشعار یا مصرعے یا فقرے جو مضمون ، راگ اور تال کے
اعتبار سے متحد ہوتے تھے ، ترکیب دے دے جاتے تھے۔ مثال میں
امیر خسرو کی وہ غزل بتائی جا سکتی ہے جس کا مطلع ہے :

ز حال مسکین مکن تغافل در آئے نیناں بنائے بیتاں
جو تاب ہجران ندازد اے جاں نلیو گاہے نکلتے چہنیاں

مولانا بہاؤ الدین بن حاجی معزالدین شیخ رحمت اللہ گجراتی کے ، جو
محمود بیگڑہ (۵۸۶۳ و ۵۹۱۹) کے پیر ہیں ، مرید تھے ؛ باجن تخلص
کرتے تھے اور فارسی و ہندی میں نظم لکھتے تھے ؛ اپنی ایک تالیف
میں جو مریدوں کی ہدایت اور اپنے مرشد کے حالات میں تصنیف
کی ہے ذیل کا ریختہ دیتے ہیں :

یہ صوفی سرالہی ایں مرتبہ داود شاہی

یہ مظہر عین خدائی

در آن مجلس کہ مظہر عین خدا باشد آن جا عین شین خدا باشد
آجاں بارود رحمۃ اللہ

آن جا ساق رسول اللہ آن جا روئے نوشین اللہ

آن جا ہمہ اللہ باشد نہ غیر اللہ

اب شیخ باجن جن کا زمانہ منتصف آخر قرن نہم ہجری ہے ،
اس سرود کو ریختہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ میں انہی کے کلام
سے ایک اور مثال دیتا ہوں :

ہا جن یہ وہ روپ نہ ہوئے جو کوئی بکھائے
بکھائے آپ کو جیوں سپہ کوئی جانے

آن تروست کہ من وصف جالش دائم
ایں حدیث از دگراں برس کہ من حیرانم
باش تا جان پرود درو آن ہار لطیف
کہ بکڑے بہ ازیں کلر نہادہ جام

شیخ سعدی^۱ دور اکبری کے ایک بزرگ ہیں جن کو غلطی سے
عوام شیخ سعدی شیرازی مانتے ہیں۔ ان کا ایک رختہ مشہور ہے
جس کو اکثر تذکرہ نویسوں نے نقل کیا ہے۔ میں صرف مقطع پر
تقاعد کرتا ہوں :

سعدی کہ گفتہ رختہ ، در رختہ دو رختہ
شیر و شکر آمیختہ ، ہم رختہ ہم گیت ہے

معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصے بعد رختہ نے موسیقی سے نکل کر
عسویت حاصل کر لی اور اس کا اطلاق ایسے کلام منظم پر
ہوئے لگا جس میں دو زبانوں^۲ کا اتحاد ہو۔ چنانچہ شیخ ہاجن اور
شیخ سعدی کے ہاں رختے کا یہی مفہوم ہے ، بلکہ شیخ سعدی نے تو
اس کو واضح کر دیا ہے کہ رختہ اور گیت ایک ہی چیز ہے۔
دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ رختہ ایسی نظم ہوتی تھی
جس میں ہندی فارسی کے اشعار یا فقرے متحد ہوتے تھے۔ یہاں
ایک اور مثال بارہویں قرن ہجری کے رختے کی دی جاتی ہے جو
خواجہ حافظ کی مشہور غزل کی تضمین ہے :

رختہ

سو کہ چین کی مثال سوں سپہ جا کرو ہکرا
دل میرود ز دست صاحب دلاں خدا را

-
- ۱۔ بدایونی نے اپنی تاریخ میں ان کا ذکر کیا ہے۔
 - ۲۔ ہمارے عجم میں کلام مخلوط یہ دو زبان کو رختہ کہا ہے۔

اکھیاں نہیں چھڑ لگایا رسوا کریں گی آخر
دردا کہ راز بھائی خواجہ شد آفکارا

اے مرگ تک امن دے دل کی مراد یوں ہے
باشد کہ باز بینم آن یار آشنا را
دو دن کی زندگی مت کر جفا کسی پر
نیکی بچانے ہماراں فرصت شمار ہمارا

نن من کیا ہے لوهو، لوهو کیا ہے ہانی
دلیر کہ در کف او موسست سنگ خارا

اکثر گناہ کر کے اب ہو رہے ہیں تائب
اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا

اندو سرانے گلشن ہلہل بھکاری ہے
صفت الصبح ہوا یا ایہا السکارا

محتاج یک نظر کا دربار پر کھڑا ہوں
روزے لفظ سے کن درویش بے نوا را

دنیا کی فکر مت کر کہتا ہے خواجہ حافظ
کہیں کیعبائے ہستی قارون کند گدا را

لیکن گیارھویں صدی ہجری میں ریختہ کا اطلاق بالعموم اردو نظم پر
ہونے لگا۔ ذیل کی غزل ریختہ ہے :

جاناں رحم نرساواناں ، یا مجھ بلا یا آواناں
ایتا بھی کیا نرساواناں ، یا مجھ بلا یا آواناں

تیری فراقوں دن این ، لبو سیں ہیں ولجھوین
کب لکھ یہ نہ نرساواناں ، یا مجھ بلا یا آواناں

ہے کئی مجھ ذات کون، آ خواب ہیں تک رات کون
مینہ لگا بٹھلاواناں ، یا مجھ بلا یا آواناں

۱۔ دور قدیم میں ”ٹ“ کی ”ط“ کی جگہ چار نقطے لگانے کا
دستور تھا (مرتب)

کہتا کہوں اے نائرس، یک یک کھڑی گزری برس
یہی ۱ خبر کہلاؤناں، یا مجھ ہلا یا آوناں

ہمارے شنای کر دوا، خون غریباں نہیں روا
مجھ جیو کون بھاؤناں، یا مجھ ہلا یا آوناں

تجھ راہ اوپر ہے نظر، تک اس طرف فرما گزر
یک بار آہیں جاؤناں، یا مجھ ہلا یا آوناں

ہے دل منہی یہ آرزو، یک روز اپنے روپرو
اے جان من پھلاؤناں، یا مجھ ہلا یا آوناں

یہ ممکن ہے دن چارکا، جوں بھول ہے گلزار [کذا] کا
آخر کون ہے کہلاؤناں، یا مجھ ہلا یا آوناں

ساجن کروں کہتا گلا، اب وصل کا شہرت ہلا
لوتہ جگر پہنچاؤناں، یا مجھ ہلا یا آوناں

ایتا نہ ہوے پاک توں، آخر ہے مشت خاک توں
کچھ حق سنی شرمائوناں، یا مجھ ہلا یا آوناں

یہ دل جلے کا قول ہے، ہر یہ سخن بے مول ہے
مطلب حقیقی پاؤناں، یا مجھ ہلا یا آوناں

یہ یاد رہے کہ رخصتہ اس عہد میں نظم کے ساتھ مخصوص ہے۔
اس کو نثر کے ساتھ یا زبان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ
استاد ولی کے ہاں اس مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ ذیل میں بعض
امثال حوالہ قلم ہیں :

(۱) ولی تجھ حسن کی تعریف میں جب رخصتہ بولے :

سنے تو اس کوں جان و دل سوں حسان عجم آکر

۱۔ بیگی یعنی جلد۔ راجستھانی زبان میں آج بھی مستعمل ہے
(مرتب)۔

۲۔ رخصتہ بولنا ترجمہ ہے رخصتہ گفتن کا اور مرادف ہے سخن گفتن
و شعر گفتن کا۔

- (۱) اسید مجھ کوں یو ہے ولی کیا عجب اگر
اس ریختہ کو سن کے ہوں معنے نگار بند
(۲) یو ریختہ ولی کا جا کر اسے سنایو
رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کی مانند

ان اشعار میں ریختہ کا اطلاق زبان پر خارج از بحث ہے۔ یہاں اس کے معنے نظم یا شعر یا کلام منقولہ کے لیے کئے ہیں۔ اسی طرح شعر کا استعمال بھی ملاحظہ ہو :

- (۱) تیرا یو شعر جگ میں مؤثر ہے اے ولی
تو دل منے ہر ایک کے جا کر اثر کیا
(۲) ولی شعر میرا سراہا ہے درد
خط و خال کی بات ہے خال خال
(۳) یوں شعر تیرا اے ولی مشہور ہے آفاق میں
مشہور جیوں کو ہے سخن اس بابل شیراز کا
(۴) ولی مجھ شعر کے متھے ہوئے ہیں مست اہل دل
اثر ہے شعر میں تیرے شراب پرنگالی کا

ریختہ بہ معنی زبان اردو بارہویں صدی کے آخر میں استعمال ہونے لگا ہے۔ سودا لکھتے ہیں :

مظہر کا شعر ، فارسی اور ریختہ کے بیچ

سودا یقین جان کہ روڑا ہے ہاٹ کا

آگہ فارسی تو کہیں اس کو ریختہ

والف جو ریختہ کے ذرا ہووے ٹھاٹ کا

سن کر وہ یہ کہے کہ نہیں ریختہ ہے یہ

اور ریختہ بھی ہے تو فروزش کی لاٹ کا

شاہ عبدالقادر اپنے ترجمہ قرآن (۱۲۰۵ھ) میں ریختہ اور ہندی زبان میں کچھ فرق مانتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

”اول یہ کہ اس جگہ ترجمہ لفظ بہ لفظ ضرور نہیں کیوں کہ ترکیب ہندی ترکیب عربی سے بہت بعید ہے۔ اگر وہی ترکیب رہے تو معنی مفہوم نہ ہوں۔ دوسرے یہ کہ اس میں زبان ریختہ نہیں بولی بلکہ ہندی متعارف [کہ] عوام کو بے تکلف دریافت ہو۔“

شاہ صاحب کس چیز کو ریختہ کہتے ہیں کس چیز کو ہندی، اس سے ہم قطعاً تاریکی میں ہیں۔ اس زبان کے آغاز کے متعلق صاحب ’ظہیر الانشا‘ کہتے ہیں :

”ہر کہ سرپر سلطنت از جہانگیر مشجاوز شد نوبت شاہجہاں رسید۔ این جا کہ بہ سبب مصاحبت و معاشرت علایہ دین فی الجملہ خودداری و تشرع غالب بود این زبان ریختہ معجون مرکب بسبب آمد و رفت تاجران ہر دیار در بازارها بہ ضرورت خرید و فروخت و معاملات داد و ستد ضروری الاستعمال شد تا زبان یکے بفہم دیگرے در آمد۔ چون بازار را در ترکی و فارسی اردو گویند ضرورت استعمال این زبان مرکب در بازارها ضرورت شد، خصوصاً در بازار خاص بادشاہی کہ بہ تعظیم نام بازار خاص اودوے معالی بود؛ لہذا نام زبان تازہ مرکب نیز اودوے معالی قرار یافت تا اینکہ باغراض ازمندہ آن تخصیص آداب شاہی ’ہالی‘ ہاند۔ آن التزام لفظ معالی ہم ’ہاند‘ فقط اردو باقی ماند۔ پس وجہ تسمیہ اردو ہمین است و اسم بااسمی ریختہ است یعنی زبان عربی و فارسی دریں ریختہ ہند۔“

اردو کے آغاز پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہ وجہ قلت فرصت ’ظہیر الانشا‘ کے بیانات پر تنقید کے بغیر میں اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ آئندہ فرصت کے وقت تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے گی۔ یہ چند سطور محض حضرت چیف ایڈیٹر کے ارشاد کی تعمیل میں عجلتاً لکھ دی گئی ہیں۔

اردو زبان اور اس کے مختلف نام

(از "اورینٹل کالج میگزین" ماہیت مئی ۱۹۲۹ء)

لفظ اردو قرن سابع ہجری کے خونیں واقعات کی یاد ہمارے دل میں تازہ کر دیتا ہے۔ جب ۵۶۱ء میں چنگیزی لشکروں نے قراقرم سے خروج کر کے اور مختلف دستوں میں تقسیم ہو کر دنیا کی فتح کا بیڑا اٹھایا تھا، ان میں سے ایک دستے نے یہ سرکردگی چنگیزخان ترکستان، خراسان اور افغانستان کو تسخیر کر لیا۔ دوسرا دستہ مغرب کی طرف بڑھا اور آذر بائیجان، ارمن و گرجستان فتح کرتا ہوا جنوبی روس میں جا کر تھا۔ تیسرے دستے نے مشرق کا رخ کیا؛ ممالک چین ان کی تاخت و تاراج کی جولان گاہ تھے اور عن قریب بعد سلطنت لغغوری ان کے زیر نگین آ گئی۔

ان وحشیوں نے اپنے خروج اور سلسلہ فتوحات کے دوران میں انسانی خون ریزی اور ہلاک و امصار کی تباہی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ آباد شہروں کو ویران کیا اور ان کے باشندوں کو تاوار کے گھاٹ اٹارا۔ اور ممالک کے مقابلے میں ایران خصوصیت کے ساتھ ان کے بے پناہ غیظ و غضب کا شکار بنا۔ اس کے عظیم الشان اور آباد شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ ان کی عمارات کو زمین کے برابر ہست کر دیا گیا اور ان کی آبادی سپرد تیغ ہوئی۔ سمرقند، بخارا،

بلخ ، طوس ، ہرات ، تیشا پور اور خوارزم وغیرہ صرف چند مقامیں ہیں جہاں یہ خونیں واقعات انتہائی شدت کے ساتھ ظہور پزیر ہوئے ہیں ۔

یہ اس قیامت عظمیٰ کی بنا پر ہے جو نسل انسانی کی تاریخ کا سب سے زیادہ خونیں واقعہ ہے کہ لفظ 'اردو' ایشیا اور یورپ کی مختلف زبانوں میں داخل ہو جاتا ہے ۔

یہ لفظ اصل ترکی میں مختلف شکلوں میں ملتا ہے ، یعنی اوردا ، اوردہ ، اردہ ، اوردو اور اردو جس کے معنی فروگاہ لشکر اور بڑاؤ نیز لشکر و حصہ لشکر ہیں ۔ اس کے علاوہ اس کا استعمال خیمہ ، بازار لشکر ، حرم گاہ ، محل و محل سرانے شاہی^۱ و قلعے^۲ پر بھی ہوتا ہے ۔ اقوام مغول کسی شہری اور مدنی زندگی کی پابند نہیں تھیں ۔ ان کو ہر اوقات جدید سیزہ زاروں اور چشمہ ساروں کی تلاش میں یا بہ ضرورت جنگ و پیکار یا بہ غرض تاخت و غنیمت ایک مقام سے دوسرے مقام پر نقل مکانی کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی ۔ وہ اپنے گلوں اور سوبشیوں کے ساتھ گاڑیوں میں سفر کرتے اور ان کے سفر کی محرک صحرائی جانوروں اور طور کی آوازیں ہوتی تھیں جن سے شگونوں کی روشنی میں وہ اپنے خیمے بربہا کرتے اور ایک مقام پر آباد ہو جاتے یا وہاں سے ترک سکونت کرتے ۔ ہر خاندان کا خیمہ جداگانہ ہوتا تھا جس کو ان کی اصطلاح میں 'پورت' کہا جاتا تھا ۔ یہ پورت اون کے بنے ہوئے تھے ۔ متعدد پورت کا مجموعہ دراصل 'اردو' یا 'اول' کہلاتا تھا ۔ یہی اردو یا اول ان کی غیر مستند زندگی کے مرجع و مرکز تھے ۔ یہی ان کے قلعے تھے اور یہی ان کے شہر ۔ سردار کا خیمہ بہ غرض امتیاز ، سروردہ یعنی اردو سے مطابقت کے نام سے منسوب ہوتا تھا^۳ ۔

اردو کا لفظ غالباً سب سے پہلے یہ شکل 'اردا' مقدسی (تقریباً ۱۳۷۵ھ)

۱ ۔ نورالایضار قلمی نوشتہ عہد محمد شاہی ملوکہ پروفیسر محمد شفیع ۔

۲ ۔ ہابسن جابسن صفحہ ۶۳۰ ۔

۳ ۔ تاریخ مغول انگریزی از ہاورتھ ، صفحہ ۱۰۶ ، جلد اول ، ۱۸۷۸ء

کے غاں ملتا ہے جو ترکستان کے کسی شہر کا نام ہے^۱۔ اردو کے نام پر ایک ترکی قبیلہ بھی ہے جو سولہویں صدی عیسوی میں اس نام سے مشہور ہوا۔ اس قبیلے کے اجداد چنگیز خان اور اس کے جانشین سلطانین کے مقابر کی تولیت سے ممتاز تھے۔ یہ مقبرے چوں کہ چنگیز خان کے زمستانی اردو میں واقع تھے اس لیے ان مغلوں کی اولاد اردو کے نام سے مشہور ہو گئی۔ ترکیبی حالت میں 'اردو قند' اور 'اردو بالغ' دو شہروں کے نام ملتے ہیں۔ ان میں 'اردو قند' کاشغر کا مغولی نام ہے۔ 'اردو بالغ' اس شہر کی بنیاد اوگتائی خان نے رکھی تھی۔ بعد میں قراقرم کے نام سے مشہور ہوا^۲۔ لیکن 'گندس اوردو' ان سے زیادہ قدیم نام ہے جو ہماری تاریخوں میں ہلاساغوں کے نام سے مذکور ہے^۳۔

چنگیزی طوفان کے تم ہونے پر جب ایران میں مغولی حکومت قائم ہو گئی، ایرانی مورخین و مصنفین لفظ اردو فارسی زبان میں اختیار کر لیتے ہیں۔ ان میں غالباً سب سے سابق علاؤالدین عطاء ملک جوہنی ہیں۔ ان کی تصنیف 'جہاں کشا' میں یہ لفظ عام طور پر مستعمل ہے۔ میں یہاں ایک مثال عرض کرنا ہوں :

”و خان هر وقت که عزیمت شکو بزرگ کند و وقت آن دخول زمستان باشد فرمان رساند تا لشکرها که بر مدار صحر و حال و جوار اردوها باشند مستعد شکو گردند۔“ (جلد اول صفحہ ۱۹)۔

اس کے بعد یہ لفظ عام ہو جاتا ہے اور 'جامع التواریخ'، 'بہار کتب'، 'وصاف'، 'روضۃ الصفا' و 'حبیب السیر' وغیرہ میں عام طور پر ملتا ہے۔ یورپ میں اس لفظ کا داخلہ ہاتو خان بن جوچی بن چنگیز خان کے حملہ مغرب سے تعلق رکھتا ہے جس کی فتوحات

۱۔ بیلیوتھیکا جوگرافیوزم عراقی کورم، جلد سوم، صفحہ ۵۷۴۔

۲۔ جہاں کشا نے جوہنی صفحہ ۴۰، جلد اول سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو بالغ ہی قدیم نام تھا۔

۳۔ برتھانڈ، صفحہ ۱۲۲۔

مغرب الصلی تک پہنچ گئی تھیں۔ اس کا صدر مقام سرانے دریا کے کنارے واقع تھا اور اس کی فرودگاہ 'اردوے مٹلا' کے نام سے معروف تھی۔ اردوے مٹلا کے زیر عنوان جوبی کے تمام فرزند اور مطیع قبائل شامل ہیں جن کا رسمی سردار جوبی کا خلف اکبر اوردا تھا۔ وہ اردوے مٹلا کے دست چپ کا حکم ران تھا جس کو آئی اوردا، یا اردوے بیضا کہتے تھے۔ اس سے دست راست کو میز کرنے کے لیے جس کا انسر بانو خان تھا، قاق اوردا یا اردوے ازرق کہتے تھے۔ لیکن بانو خان حقیقت میں اس تمام اردو کا حاکم اعلیٰ تھا۔

مالک مغرب میں یہ لفظ پولینڈ کے راستے سے پہنچتا ہے۔ اس ملک میں 'اوردا' کے ابتدائی 'الف' کو 'ھ' کے ساتھ تبدیل کر دیا گیا اور 'ھوردا' بنا لیا۔ اس شکل میں یہ لفظ یورپ کے مختلف ملکوں میں پہنچا۔ چنانچہ جرمنی میں 'ھوردے'، سویڈن میں 'ھورد'، اطالیہ میں 'اوردا'، اندلس و پرتگال میں 'ھوردا'، فرانس میں 'ھوردے'، اور انگلستان میں 'ھورڈ' بولا جاتا ہے۔

شویٹزر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ روسی قوم نے زمانہ اس لفظ کا استعمال یہ حیثیت کلمہ تحقیر ایشیائی اقوام کے لیے کرتی ہے !۔

انگریزی زبان میں سب سے پہلا استعمال ۱۵۵۵ء میں ایٹن کی تصنیف 'ڈیکٹوز' میں ہونا ہے۔ بعد کی مثال جینکس کے سفر نامہ مطبوعہ ۱۵۹۰ء میں موجود ہے۔

سرزمین ہندوستان میں اس کا رواج ظہیر الدین بابر (۹۳۲ھ و ۹۳۷ھ) کے زمانے سے متصور ہونا چاہیے۔ اس عہد کی قلعیج خود اس بادشاہ کی ترقی نو رک میں ملتی ہے، اور جلال الدین اکبر کے عہد (۹۶۳ھ و ۱۰۱۳ھ) سے تو ہمارے مصنفین عام طور پر اس کا استعمال کر رہے ہیں۔

لیکن 'طبقات ناصری' مصنفہ قاضی منہاج سراج نوشتہ ۵۶۵ھ میں ایک مقام پر اور تاریخ فیروز شاہی من شمس سراج عقیف میں جو تیموری حملے کے سن قریب بعد یعنی ۵۸۰ھ کے گرد پیش میں لکھی گئی ہے ، ایک ہی صفحے میں دو مقام پر یہ لفظ نظر آتا ہے ۔ طبقات کی عبارت حسب ذیل ہے :

”ملک شیر خان از آن جا عزیمت ترکستان کرد و بطرف اردوی مغل رفت ۔“ (صفحہ ۷۷ ، طبع ایشیاٹک سوسائٹی ، بنگال)

لیکن طبقات کے فاضل مترجم میجر رانورٹی نے اسی جملے کے متعلق ایک حاشیہ دیا ہے جس کا مطلب ذیل میں درج ہے :

”یہ سارا جملہ تمام نسخوں میں ناقص ہے ۔ مشکل ہے دو نسخوں میں بھی یکساں نہیں ملتا ۔ ایک نسخے میں لفظ 'ترکستان' کے بعد کسی قدر مزید عبارت بھی ہے یعنی ”وہ لاہور کی طرف بڑھا اور جس نے اسے دیکھا مرعوب ہو کر اس کے سامنے سجدے میں جھکا“ (در سجدہ افتاد) ۔ (انگریزی ترجمہ طبقات صفحہ ۷۷-۷۸)

میرے پاس طبقات کا جو نسخہ ہے اس میں یہی عبارت یوں ہے :

”ملک شیر خان از آنجا عزیمت ترکستان کرد و بطرف لوہور و این حوالی رسید با ملک جلال الدین مسعود شاہ بن السلطان پیوست“ (ورق ۳۷۵)

اس شہادت کی رو سے عبارت بالا میں اردو کا استعمال بہت کچھ مشتبہ ہو جاتا ہے ؛ اور کوئی تعجب نہیں اگر عہد اکبری میں جب کہ قدیم تاریخوں میں دل چسپی کا اظہار کیا گیا ہے ، ایک ناقص جملے کو معنی پہانے کے لیے کسی قدر ترمیم کر دی گئی ہو ۔ تاریخ فیروز شاہی میں ایک جملہ یوں ہے :

”ہاوازه بدل و عطا از ہو چہار جانب خلق متوجہ اردوی او گردید“ (صفحہ ۵۳ ، تاریخ فیروز شاہی ، طبع ایشیاٹک سوسائٹی)

لیکن الہیئر نے اس کا اختلافی نسخہ بھی لکھا ہے جو اسی جملے

میں خلق کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی :

”م ن۔ خانی تازیہ چاکر می شد“ (صفحہ ۵۳)

میرا خیال ہے کہ یہ نسطہ متن کی عبارت کے مقابلے میں زیادہ چسپان اور موزوں ہے۔

اسی تاریخ میں اسی صفحے پر ذیل کا جملہ بھی ملتا ہے :

”در ہردو لشکر اخبار مختلف مذکور می شد کہ خواجہ جہان برآن فراودادہ کہ چون لشکر سلطانی بدہلی رسد امراء کہ در اودوی ظفر قرین اند اتباع آتھا را دینہ در ہلہ منجیق نہادہ خواہد انداخت۔“ (صفحہ ۵۳-۵۴)

ہندوستان میں ان ایام میں اردو کے لفظ سے شناسائی ہونے کے متعلق کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ اس ملک پر مغلوں کے بار بار حملوں سے ان کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا اشتیاق ضرور رہا ہوگا۔ چنانچہ طبقات نامہ صبری میں مغلوں اور ان کے مراسم و اوضاع کے مفصل حالات درج ہیں۔ لیکن جو امر لفظ اردو کے استعمال کے متعلق ہمارے شبہ کو زیادہ تقویت دیتا ہے یہ ہے کہ ان تاریخوں کے سوا باقی تاریخوں میں یہ لفظ کبھی نظر نہیں آتا۔ مثلاً امیر خسرو اور ضیا برفی کے ہاں نہیں ملتا۔ اگر راجہ تھا تو ہر تاریخ میں ملتا یا جن تاریخوں میں موجود ہے ان میں عام طور پر ملتا۔ اس لفظ کا تدرت کے ساتھ استعمال بہت کچھ اس کے خلاف ہے۔ ’اردوے ظفر قرین‘ کی ترکیب تو ایسی ہے جس کا نویں صدی کی ابتدا میں راجہ ہونا قرین قیاس نہیں، البتہ اکبر کے عہد میں وہ اصطلاح کا حکم رکھتی ہے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

عہد اکبری میں بلا شک و شبہ یہ لفظ ہندوستان میں عام طور پر رواج پا چکا ہے اور اس عہد کے تمام مورخ بالعموم اس کا استعمال کرتے ہیں۔ اکثر اوقات ترکیبی حالت میں ملتا ہے، مثلاً ’اردوے علی‘، ’اردوے معلی‘، ’اردوے لشکر‘، ’اردوے حضرت‘، ’اردوے ظفر قرین‘، ’اردوے عالی‘، ’اردوے بزرگی‘، وغیرہ جس سے ان کا مقصد شاہی

لشکر اور شاہی فرودگاہ ہے۔ کئیلا بعض جملے یہاں نقل کیے جاتے ہیں جو صرف منتخب التواریخ ہدایونی و طبقات اکبری سے ماخوذ ہیں۔

(۱) "و ہر شب جمعے از لشکر او جدا شدہ نزد حضرت پادشاہ می رفتند و اردوی علیا کوچ کردہ در نیم کروے لشکر میرزا کامران نزول فرمودند و درین شب اکثر لشکریان میرزا کامران گریختہ باردوی حضرت آمدند۔" (ص ۲۱۲۔ طبقات اکبری۔ طبع نول کشور)

(۲) کابل را بہ میرزا حبیب و اردو را گذاشتہ باہلقار بجلال آباد کہ 'اردوی بزرگ' خدمت شاہزادۂ بزرگ درانجا بود معاودت می نمایند۔" (ص ۲۳۹۔ منتخب التواریخ ہدایونی طبع نول کشور)۔

(۳) شنبہ ام کہ دران اہام کہ شاہ یک از 'اردوی عالی' بہ جون پور رفت۔" (ص ۱۳۷۔ منتخب)

(۴) "جون حوالی موضع ہالی کپکرا مقام نزول 'اردوی عالی' گردید۔" (ص ۱۸۰۔ طبقات)

(۵) "فرمان شد کہ دولت خان و ذریات او را امان دادہ اموالش بقلم آورده ہمساہیان، 'اردوی ظفرقرین' قسمت نمایند۔" (ص ۱۸۸۔ طبقات)

(۶) "برادران مشفق و یاران موافق خواہی نخواہی اورا گاہے بہ نصیحت و گاہے بجزر و تہدید و ملامت و سرزنش نگاہ میداشتند تا آنکہ 'اردوی ظفرقرین' بمستقر سلطنت رسید۔" (ص ۱۷۱۔ منتخب)

(۷) "و بعد از فتح کسی 'باردوی لشکر' کہ در قندھار بود رفت۔" (ص ۲۱۳۔ طبقات)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردوے ظفر قرین کا ایک مختصر بیان جس سے ہاوی مراد اکبر کا لشکر بہ وقت کوچ و مقام ہے، یہاں دے دیا جائے۔ یہ بیان آئین اکبری سے ماخوذ ہے۔

در فرود آمدن اردو

ایک ہموارہ قطعہ زمین جس کا طول ۱۵۳۰ گز ہوتا تھا مقام شاہی و حرم سرانے شاہی کے لیے منتخب کیا جاتا تھا۔ سب سے مقدم

’گلاب پاؤ‘ ایک قلعہ نما صمد در صمد گز احاطہ یا چوبیس سراپردہ ہے جو دیوار خرگہ کے مشابہ ہے۔ وہ سرخ پارچے کا بنا ہے، نواڑ کی گوث لگی ہے؛ مضبوطی کی غرض سے جبکہ جبکہ تسمے لگے ہیں، آسانی کے ساتھ تہ ہو سکتا ہے، اس کے دروازے مضبوط اور قالیے کنجی سے لیس ہیں۔ اس کے بیروں میں ایک دو سرخہ بازگاہ ہے جس کے ۵۵ حصے ہیں۔ ہر حصہ ۲۵×۱۵ گز طول و عرض میں ہے۔ وسط میں ایک بڑی چوبیس راوی^۲ ہے جس کے دس ستون ہیں اور چاروں طرف سراپردے لگے ہیں۔ اس سے ملحق ایک دو آشیانہ چوبیس محل^۳ ہے جس میں بادشاہ سلامت صبح کے وقت عبادت کرتے نظر آتے ہیں۔ محل کی عورتیں بغیر اجازت اس میں داخل نہیں ہو سکتیں۔ زان بعد چوبیس چوبیس راویاں ۱۰×۶ گز کے طول و عرض میں کھڑی ہیں جو قناتوں کے ذریعے ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں۔ ان میں حرم شاہی کی عذرات رہتی ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد خیمے اور تنبو اور ہیں جو خاص خاص بیگمات کے لیے معین ہیں۔ زردوزی محفل کے ان کے سائبان ہیں۔ ان سے متصل ساٹھ گز طول و عرض کا ایک کیم سراپردہ ملتا ہے جس میں مختلف خیمے لگے ہیں۔ یہاں اردو بیگیاں (اردا بیگیاں) اور دیگر ملازم عورتیں رہتی رہتی ہیں۔ یہاں سے لیے کر دولت خانہ خاص تک ڈیڑھ سو گز کے طول اور سو گز کے عرض میں ایک فراخ میدان ہے جس کا نام سہنابی ہے۔ اس کے دونوں طرف

۱۔ دوسرخہ یعنی دو چوبہ جس کے صرف دو ستون ہیں۔

۲۔ اس میں چوکیوں کا فرش ہوتا تھا، دس ستون اور دو دروازے ہوتے تھے۔

۳۔ اس کی دو منزلیں ہوتی تھیں؛ پہلی منزل کے چہ چہ گز لمبے اٹھارہ ستون ہوتے تھے۔ اس کی ہیئت مجموعی بارہ دری^۴ سے ملتی جلتی ہے۔ بالائی منزل کے ستون صرف چار چار گز لمبے تھے۔ اس کی شکل چوبیس راوی سے ملتی ہے۔ دوسری منزل پر جانے کے لیے سیڑھی لگی ہوتی تھی۔

برسے تن رہے ہیں جن کے ساتھ دو دو گز کے فاصلے پر چہ چہ گز
 لہجے بانس جو گز گز پھر زمین میں گلے ہیں ، بیوست ہیں ۔ بانسوں
 کے سرے پر بری لٹو یا قیسے لکے ہیں ۔ بانس باہر اور اندر سے ڈوریوں
 سے بندھے ہیں اور پہرے والے متعین ہیں ۔ مہتاب کے وسط میں ایک
 بڑا چبوترہ ہے جس پر چار چوہہ بٹکیرے^۱ کا ساٹیان ہے ۔ بادشاہ سلامت
 شام کے وقت یہاں تشریف لاتے ہیں اور خاص خاص لوگوں کو سلام
 کی اجازت ہوتی ہے ۔ کلال ہاڑ سے ملحق ایک اور احاطہ ہے جو بارہ
 حصوں میں منقسم ہے اور ہر حصہ تیس گز طول میں ہے ۔ مزید براں
 دہ گزی چوبیس راوٹی اور چالیس زمین^۲ دوز کمرے ہیں جن پر دوازدہ گزی
 بارہ شامیانے سایہ کیے ہیں اور فنانوں کے ذریعے سے جدا جدا ہیں ۔
 اس احاطے کا نام ایچی ہے ۔ ہر کمرے سے ملحق 'صحت خانہ' ہے ۔
 بادشاہ سلامت نے طہارت خانے کے لیے یہ نام تجویز کیا ہے ۔
 ایچی کے ساتھ ایک سراپردہ ہے جو ایک سو پچاس گز عرض و طول میں
 ہے اور حسب معمول چوب اور قیوں سے مزین ہے ۔ اس کے وسط میں
 بارگہ بزرگہ استنادہ ہے جس کو ایک ہزار فراش کپڑا کرتے ہیں ۔
 اس کے بہتر در ہیں اور اس میں دس ہزار آدمیوں کی نشست کی
 گنجائش ہے ۔ بارگہ کی چوب پندرہ گز بلند ہے ۔ اس کے گرد و پیش میں
 ایک خیمہ بجا قلندری محیط ہے جو موسمِ جامے کی بنی ہے تاکہ بارش اور
 دھوپ سے بارگہ کا کپڑا خراب نہ ہو ۔ بارگہ کے گرداگرد دوازدہ گزی
 پچاس شامیانے سایہ انداز ہیں ۔ اس بارگہ کا نام دولت خانہ خاص ہے ۔
 اس کے بھی دروازے اور پٹے موجود ہیں ۔ یہاں جلیل القدر
 اسراء اور افسرانِ سپاہ حسب الحکم سلام کو حاضر ہوتے ہیں ۔ ہر ماہ
 اس کے متعلق تجدیدی احکام جاری ہوتے رہتے ہیں ۔ یہ بارگہ
 اندر باہر سے خوب صورت اور رنگین فرش و فرش سے آراستہ ہے
 اور بالغ سدا پہار کا حکم دکھتی ہے ۔ بارگہ سے علیحدہ ۳۵۰ گز کے
 طول میں ایک اور احاطہ ہے جس کے گرد ڈوریاں کھچی ہیں اور

۱۔ بٹکیر، شامیانے کی طرح ہے اور 'چار چوب ہر قائم' ہے ؟
 ۲۔ دائیں اور بائیں طرف سے دو دو ڈوریوں سے چوبیس پندھیں ہیں ۔

تین تین گز کے فاصلے سے چوبیس کڑی ہیں۔ احاطے کے گرد سپاہی پورے ہر کھڑے ہیں۔ اس کا نام دیوان خانہ عام ہے۔ دیوان خانہ عام کے خاکے پر شہت گزی بارہ طناب کے فاصلے پر تقارخانہ ہے اور اس وسیع میدان کے وسط میں آکس دیا ایک بہت بڑے فانوس کی شکل میں۔ گز بلند ستون پر جل رہا ہے۔

محولہ بالا بیان بادشاہی دولت سرا اور حرم سرا سے تعلق رکھتا ہے جس کے ساتھ مہتابی و دیوان خاص و عام شامل ہیں۔ اس کیمپ کی تین طرف یعنی عقب، دست راست و دست چپ میں ۴۶ گز زمین خالی چھوڑ دی گئی ہے جس پر چوکیداروں کے سوا کوئی غیر شخص قدم نہیں رکھ سکتا۔ یہاں سو گز کے فاصلے پر جانب قول مردم مکانی گلبدن بیگم، دیگر شہزادیوں اور شہزادہ دانیال کے خیمے نظر آتے ہیں؛ دست راست پر شہزادہ سلطان سلیم اور دست چپ پر شہزادہ سلطان مراد کے خیمے لگے ہیں۔ شاہی فرودگاہ کے متوازی دونوں بازوؤں پر شہزادہ سلیم کے دست راست و شہزادہ مراد کے دست چپ پر بیوتات بھیلے ہوئے ہیں۔ حویج خانہ، نان باخانہ، میوہ خانہ، تنبول خانہ، شربت خانہ اور آب دار خانہ سلیم کی طرف ہیں اور آنتابی خانہ، خوشبو خانہ، نوشک خانہ، خیاط خانہ، کراکراق خانہ، چراغ خانہ اور مشعل خانہ مراد کی سمت میں ہیں۔ تقارخانے کے ایک طرف دفتر خانہ اور دوسری جانب زین خانہ ہیں۔ شاہی کیمپ کے چاروں گوشوں سے چار بازار شروع ہوتے ہیں۔ دست چپ کے گوشے والے بازار کے متوازی اندرونی جانب اصطبل، داروغہ اسپاں، مشرف اسپاں وغیرہ کے ڈیرے ہیں؛ دست راست کے گوشے والے بازار کے بالمقابل اندرونی سمت میں سکھ ہال، پھل خانہ، توپ خانہ اور چھتہ خانہ ہیں۔ سب سے آخر میں یہ جانب قول چوکیداران پنج شنبہ و جمعہ و شنبہ ہیں؛ دست راست پر چوکیداران یک شنبہ، دو شنبہ اور دست چپ پر چوکیداران سہ شنبہ و چہار شنبہ ہیں۔ ان سے بعد غلی قدر مراتب اسراء کے خیمے شروع ہوتے ہیں جو اپنے متبعین اور حشم کے ساتھ مقیم ہیں۔ یہ متحرک شہر جو درحقیقت کئی میلوں میں بسا ہوا ہے

شہنشاہ اکبر کا 'اردوے ظفر قرین' ہے ۔

اس امر کی دلیل کہ اکبر نے اپنے لشکر کا نام 'اردوے ظفر قرین' رکھا تھا ہمارے پاس یہ ہے کہ اس نے اپنے لشکر کی نکسال کا نام 'اردوے ظفر' قرین رکھا تھا۔ ذیل میں اس کا بیان دیا جاتا ہے ۔

اردو ظفر قرین

ہندوستان میں سفری نکسال سے سکھانے کی رسم ظہیر الدین بابر کے عہد سے وجود میں آئی ۔ بابر اپنی لشکری نکسال کو 'اردو' کے نام سے یاد کرتا ہے ۔ اس نکسال کا ایک نفرتی درم ضرب ۱۵۳۷ء لاہور میوزیم میں محفوظ ہے جس پر عبارت ذیل منقوش ہے :

"السلطان الاعظم والخاقان المکرم ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ بخاری خلد الله ملکہ و سلطانہ ضرب اردو ۱۔"

میں نے صرف دوسرے رخ کی عبارت نقل کی ہے ، پہلے رخ پر حسب معمول کلمہ ہے ۔

اکبر کی لشکری نکسال 'اردو ظفر قرین' یا 'اردوے ظفر قرین' جو خال خال موقعوں پر اردو بھی کہلاتی ہے سونے ، چاندی اور تانبے کے سکے ضرب کرتی رہی ہے ۔ ان میں سب سے قدیم ایک مدور طلائی سیر ہے جس کی تاریخ ۱۵۹۵ء ہے ۔ اشرافی هذا انڈین میوزیم کلکتہ کے قبضے میں ہے اور میوزیم کی فہرست^۲ مسکوکات جلد سوم صفحہ ۱۱ پر یہ ذیل ہے۔ ۱۰ مذکور ہے ۔ اس کی عبارت یہ خط نستعلیق^۳ حسب ذیل ہے :

۱۔ فہرست مسکوکات شاہان مغلیہ در خزائن ہینک میوزیم لاہور ۔ صفحہ ۳ ، جلد دوم ۔

۲۔ فہرست مسکوکات انڈین میوزیم کلکتہ جلد سوم (سلاطین مغل) از نکلسن رائٹ ۔

۳۔ ہندوستان میں مسکوکات پر خط نستعلیق کا رواج اسی عہد سے تصور کرنا چاہیے ۔ اس لحاظ سے بھی (باقی حاشیہ صفحہ ۲۱ پر)

رخ اول : لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ (وسط میں) بہ صدق ای ہکر،
 بہ عدل عمر، بہ عیاض عثمان، ۹۸۳ (ہر چہار جانب)
 بہ علم علی

رخ دوم : جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی

ضرب اردوئے ظفر قرین

اس ٹکسال کے اکثر مکے ایسے ہیں جن پر تاریخ 'الف' یعنی ایک
 ہزار مرقوم ہے۔ اس سے مراد سال ہجرت نہیں ہے بلکہ وہ ہزار سالہ
 مدت مراد ہے جو شیوع 'اسلام' سے لے کر سنہ ۸۹۹ء پر ختم ہوتی ہے۔
 گویا اس میں رسالت کی وہ مدت شامل کر لی گئی ہے جو
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے کی طرف ہجرت کرنے سے قبل مکہ
 میں گزاری ہے۔ اس رسالت کی مدت دس سال ہے، اس لیے اگر
 سنہ ۸۹۹ء کے ساتھ جو الفی سکوں کی ضرب کا سال ہے، رسالت مکہ
 کے دس سال جمع کر لیے جائیں تو کل مدت اشاعت اسلام اس
 وقت تک ایک ہزار سال ہو جاتی ہے اور لفظ 'الف' یہی مدت ظاہر
 کروا ہے۔ اس زمانے میں یہ قول ہدایونی شہنشاہ اکبر نے ان لوگوں کے
 اثرات میں جو اس کے عبادت خانے میں شامل ہوتے تھے اور جو اس کو
 ایک جدید مذہب کی ترویج پر مائل کر رہے تھے، مذہب اسلام سے
 بالکل قطع تعلق کر لیا تھا۔ یہ امر شہنشاہ کے ذہن نشین ہو گیا تھا
 کہ ایک ہزار سال کے اختتام پر دین اسلام کا غایمہ ہو جائے گا،
 اس لیے اکبر نے اپنے جلوس کے اٹھائیسویں سال کی ابتدا میں جو
 ۱۵ صفر ۸۹۹ء کے مطابق ہے، جشن نوروز و سال نو منانے کے بعد جو
 اٹھارہ روز تک رہا، سب سے پہلا حکم یہ دیا کہ سکوں پر تاریخ
 الف یہ محض اظہار غایمہ دین اسلام لکھی جانا کرے۔

میرا یہ بیان ہدایونی کے ذیل کے جاذبات پر مبنی ہے :

(صفحہ ۲۰ کا باقی حاشیہ) یہ اشرق غالباً قدیم ثابت ہوئی۔ اکبر
 کے الہی سکوں پر جو سنہ ۲۰ جلوس سے چلنے ہیں نستعلیق
 بالا التزام ملتا ہے۔ لیکن کامران مرزا والنی کاہل سب سے پہلا شخص ہے
 جس کے سکوں پر نستعلیق کو جگہ ملی ہے۔

”و چون در زعم خویش مقرر ساختند کہ ہزار سال از بعث پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کہ مدت بقائے این دین بود تمام شد و هیچ موانعی برائے الظہار دواعی غنہ کہ در دل داشتند نماند و بساط از مشایخ و علما کہ صلاحیت و مہابت داشتند و ملاحظہ تام از آنها بایستے نمود خالی ماند بفرار خاطر در حد و دواعی ابطال احکام و از کائن اسلام و برست ضوابط و قواعد نو مہمل و مختل و ترویج بازار افساد اعتقاد درآمدہ اول حکمی کہ فرمودند این بود در سکہ تاریخ الف نویسد۔“ (صفحہ ۳۸، منتخب التواریخ)

ہدایونی کا دوسرا بیان حسب ذیل ہے :

”و تاریخ ہجری عربی را تقیر دادہ ابتداء آن از سال جلوس گرفتند کہ نہد و شصت و سہ بود و ماہ ہا را بر رسم ملوک عجم کہ در کتاب نصاب مذکور است اعتبار کردند و عیدہا نیز موافق اعیاد زردشتیان در سالے چہارم قرار دادہ شد و عیدہائے مسلمانان و رونق آن بشکست مگر برای خاطر خطبہ جمعہ کہ پیران مفاوہک ناشناس رفتہ باشند و آنرا سال و ماہ النہی نامیدند و در ٹنگہا و مہرہا تاریخ الف نوشتند باین اعتبار کہ شعر باشد از اقتراض دین مہین ہدی صلی اللہ علیہ وسلم کہ بیش از ہزار سال نخواہد بود و عربی خواندن

۱۔ یہاں ہدایونی کو کسی قدر سہو ہو گیا ہے ؛ الفی سکوں کا اجرا اور سنہ النہی کی ترویج ایک ہی وقت کے واقعے نہیں ہیں بلکہ مقدم و مؤخر ہیں ۔ الفی سکوں کی اشاعت کے وقت اکبر دین اسلام سے برگشتہ نہیں ہوا تھا کیوں کہ اس کے تمام سکوں میں جن میں الفی سکے بھی شامل ہیں کلمہ شریف و اسمے اصحاب اربع بدستور درج ہیں ۔ البتہ النہی سکوں کی ضرب کے وقت جو غالباً سنہ ۳۲ جلوس میں جاری ہوئے ہیں یہ انقلاب پیش آتا ہے جب کہ سکوں کی عبارت بالکل بدل دی جاتی ہے ۔

الفی سکے اکبر کے سب سے آخری سکے ہیں جن میں کلمہ موجود ہے اور شاید عوام الناس میں یہ سکے (باقی حاشیہ صفحہ ۲۳ پر)

و دانستن آن عیب شد - (صفحہ ۲۴ ، منتخب التواریخ - نولکشور)

گویا اس ماحول میں انہی سکے رواج پاتے ہیں اور چوں کہ کثرت کے ساتھ دستیاب ہوتے ہیں ، اس لیے گمان گزرتا ہے کہ تاریخ الف کے سکے کئی سال تک برابر ضرب ہوتے رہے جو اردوئے ظفر قرین کی نکال کا نتیجہ ہیں ، کیوں کہ اکبر کی باقی نکالیں جو تعداد میں ساتھ سے بھی زیادہ ہیں ، بدستور سال ہجری اپنے اپنے سکوں پر دکھا رہی ہیں -

ملائی اور نقرئی انہی سکے بالعموم مربع ہوا کرتے ہیں اور عبارت ذیل ان پر منقوش ہوتی ہے :

رخ اول : ”لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ - بصدق ابوبکر ، بعدل عمر ، جبرائے عثمان ، بعلم علی -“

رخ دوم : ”جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی غلہ اللہ تعالیٰ ملکہ - ضرب اردو ظفر قرین -“

(صفحہ ۲۴ کا باقی حاشیہ) اسی بنا پر زیادہ مقبول ہیں - یہی وجہ ہے کہ وہ کثرت کے ساتھ ملتے ہیں - لوگ انہیں تبرک کے طور پر رکھتے ہیں اور ان کی قیمت عجیب و غریب خواص مانتے ہیں ، مثلاً مریضوں کو ان کا پانی پلایا جاتا ہے ، عورتوں کو درد زہ کی شمت کے وقت بھی پانی دیا جاتا ہے - ہندو اور مسلمان اس عقیدے میں شریک ہیں ، بلکہ ہندو زیادہ مانتے ہیں - عوام میں یہ سکے کلے کے روپیوں کے نام سے مشہور ہیں - یہ مقبولیت دیکھ کر بلوچوں نے اچھی خاصی تجارت قائم کر لی ہے - یہ لوگ ہر سال ہزاروں سکے بناتے ہیں اور ہندوستان کے شہروں اور قصبوں میں بیچ آتے ہیں - ناواٹ کلے کا روپیہ سجدہ کر خرید لیتے ہیں - کلے کے سکے اکبر کی اور نکالوں کے بھی موجود ہیں اور دیگر سلاطین کے بھی ، لیکن یہ احترام صرف انہی سکوں کو حاصل ہے - گویا یہ جواب ہے اکبر کی ذہریت کا جو اس کی رعیت نے دیا ہے ، کیوں کہ ان سکوں کی حرمت قدیم سے چلی آئی ہے -

دیکھو نمونہ نمبر ۱ طلال و نمبر ۲ ، نمبر ۳ ، نمبر ۴ تقری و نمبر ۵ ریح رویہ -

مسی سکون پر جو 'دام' کہلاتے تھے ، یہ الفاظ مکتوب تھے :

رخ اول : "فلوس الف ضرب -"

رخ دوم : "اردو ظفر قرین -"

سنہ انہی کی ترویج کے بعد یہ عبارت ہوتی تھی :

"دام ضرب ۳۸ انہی -"

رخ اول : "فلوس اردو -"

رخ دوم : "ظفر قرین ۳۶ انہی -" دیکھو نمونہ نمبر ۱۰ ، دام ضرب

۳۸ انہی -

رخ اول : "ضرب فلوس اردو -"

رخ دوم : "ظفر قرین ۳۸ انہی -" دیکھو نمونہ نمبر ۱۱ -

دام ضرب ۳۶ انہی -

رخ اول : "ضرب فلوس اردوی -"

رخ دوم : "ظفر قرین ۳۶ انہی -" دیکھو نمونہ نمبر ۱۲ -

اکبری دام ایک تولہ آٹھ ماشہ اور سات سرخ وزن میں ہوتا تھا ؛

اس کا مضاعف تنگہ کہلاتا تھا ؛ چنانچہ ٹکا اب بھی دو پیسوں

کے لیے بولا جاتا ہے - دام کی بھر مختلف تقسیمیں تھیں ؛ مثلاً ہون دام ،

نصف ، ریح اور ہشتم حصہ جس کو دمڑی بھی کہا جاتا تھا - دمڑی

دام کی سب سے چھوٹی تقسیم تھی ؛ اس پر عبارت ذیل ہوتی تھی :

رخ اول : "ضرب فلوس -"

رخ دوم : "ظفر قرین -" ملاحظہ ہو نمبر ۱۳ و نمبر ۱۴ -

اردو ظفر قرین کے ایسے طلالی اور تقری سکے بھی موجود ہیں

جن پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے - ان کی عبارت الفی سکون کے مطابق ہے -

صرف یہ فرق ہے کہ ان میں لفظ 'الف' داخل نہیں ہے (ملاحظہ ہوں

نمبر ۱۵ و نمبر ۱۶) - انہی میں ایک مندر نصف روپیہ قابل ذکر ہے

جس کے رخ اول پر حسب معمول کلمہ وغیرہ ہے اور رخ دوم پر یہ الفاظ ہیں :

”جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی - اردو ظفر قرین“

(ملاحظہ ہو نمبر ۱۷)

یہ یاد رہے کہ اردو ظفر قرین ایک سفری نکسال ہے اور اس کا کام اسی وقت جاری ہوتا ہے جب کہ بادشاہ سفر میں ہو ! جہاں سفر ختم ہوا اور بادشاہ سلامت دارالسلطنت پہنچ گئے اس نکسال کا کام بند ہو گیا ۔

اکبر کے جانشین نورالدین جہانگیر ۱۵۶۵ء و ۱۵۸۵ء کے عہد میں یہ نکسال موجود تھی اور خالی اردو کے نام سے یاد کی جاتی تھی ! لیکن یہ سکے بے حد نادر ہیں ! اب تک صرف دو سکے دریافت ہوئے ہیں ۔ جہانگیر کا شوق فنون لطیفہ و شعر کے ساتھ اس کے سکوں سے بھی نمایاں ہے ۔ اس کے اکثر مسکوکات پر اشعار درج ہیں ! چنانچہ ان دونوں سکوں پر بھی اشعار درج ہیں ۔

ان میں پہلا سکہ ایک روپیہ ہے جو تاریخ ۱۵۸۵ء مطابق سنہ ۱۱ جلوس کا ہے اور لکھنؤ میوزیم میں موجود ہے ۔ شعر ذیل اس پر نقش ہے :

بار دو سکہ در راہ دکن زد شاہ بھر و بر

شہنشاہ جہاں شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر^۱

دوسرا سکہ ایک اشرفی ہے جو بروج^۲ حمل کی تصویر کی حامل ہے اور سال ۱۵۳۹ء مطابق سال ہست و دوم جلوس کی عرب ہے ، مندر نلسن رائٹ کے قبضے میں ہے ۔ یہی اشرفی برلن میوزیم میں بھی ہے ۔ یہ شعر اس پر منقوش ہے :

۱۔ انگریزی فہرست مسکوکات پبلک میوزیم لکھنؤ جلد دوم (سکہ جہانگیری نمبر ۱۳۸۰) ۔

۲۔ جہانگیری سکوں کا یہ سلسلہ جس میں دوازدہ بروج کی تصویریں ہوا کرتی تھیں ، سکہ شناسان ہند (باقی حاشیہ صفحہ ۲۶ پر)

باد رواں تا کہ بود مہر و ماہ
سکہ اردوی جہانگیر شاہ

شاہ جہان (۱۰۳۷ھ و ۱۰۶۸ھ) کا صرف ایک نثار "اردوی ظفر قرین" معلوم ہے، جس کا ذکر فہرست پبلک میوزیم لاہور میں (صفحہ ۱۲) ملتا ہے۔

اورنگ زیب عالم گیر (۱۰۶۸ھ و ۱۱۱۸ھ) کا اکثر حصہ عمر اردو میں گزرا ہے، مگر اس کی اردو نکسال کا کوئی سکہ اب تک دریافت نہیں ہوا؛ اس لیے ہم خیال کرتے ہیں کہ اس عہد میں اردو نکسال کا رواج ترک ہو چکا تھا۔

لفظ اردو لشکر کا عام خطاب ہونے کی بنا پر یہ وجوہ کثرت استعمال کئی مرکب الفاظ کی ایجاد کا باعث بنتا ہے؛ مثلاً قاضی اردو، اردو پیگی، اردو کا مندر اور اردو بازار وغیرہ۔

(صفحہ ۲۵ کا باقی حاشیہ) کی رائے میں ہندوستانی مسکوئٹ میں سب سے بہتر اور خوب صورت مانا گیا ہے۔ یہ سلسلہ زیادہ تر آگرے اور احمد آباد کی نکسالوں کا مشہور ہے جس میں طلائی و ترقی سکے شامل ہیں؛ باقی نکسالوں کے نمونے کم ملتے ہیں۔

۱۔ نیو مسٹک پبلیشٹ حصہ اول صفحہ ۱۵۰، ۱۵۱۔

۲۔ نثار اگرچہ شکل میں سکے کی طرح ہوتا ہے، لیکن سکہ رائج کی فہرست میں داخل نہیں تھا۔ وہ سلاطین کی آمد کی تقریب پر مسکوئٹ ہوتا تھا اور شہر میں سواروں کے داخلے کے وقت نثار کر دیا جاتا تھا۔ قزاق و مساکین اس کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ نثار پر لفظ تار، نام بادشاہ و تاریخ و نام شہر نقش ہوتا تھا۔ بڑے تار روپے کے برابر ہوتے تھے، چھوٹے اس کے نصف یا ربع ہوتے تھے۔ جہانگیر، شاہ جہان، عالم گیر و فرخ سیر کے نثار مختلف عجائب گھروں میں موجود ہیں۔

قاضی اردو

برائے نام قاضی العسکر یا قاضی لشکر ہے۔ اسلام میں قضاء عسکر ایک قدیم منصب ہے۔ صلاح الدین اہلوی (۵۵۶۳ و ۵۵۸۹) کے عہد میں یہ منصب موجود تھا۔ اس کے قاضی عسکر کا نام بہاؤ الدین تھا۔ عہد اکبری میں یہ عہدہ دار قاضی اردو کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس قاضی کے فرائض میں اور امور کے علاوہ جنگ و محنت کے موقعوں پر لشکر کے طرز عمل کی نگہداشت بھی شامل تھی۔ خلاف شرع کارروائیوں پر وہ روکتا اور ٹوکتا تھا، حتیٰ کہ بشرط دیانت و تقویٰ خود بادشاہ کے مخالف شرع احکام پر بھی اعتراض کرتا تھا۔ عبارت ذیل میں قاضی اردو قاضی طوایسی کی موقوفی کا ذکر ہے۔ اس موقوفی کا باعث قاضی کا وہ احتجاج ہے جو اس نے بعض امیران جنگ کے بارے میں کیا تھا جن کے لیے شہنشاہ اکبر نے گردن مارنے کا حکم دیا تھا اور قاضی مذکور نے بادشاہ کے اس حکم کو غیر شرعی بیان کیا تھا۔

”و در واقعہ قتل امیران مردم خان زمان چوں قاضی طوایسی“
قاضی اردو کہ بہ صفت دیانت و حق گوئی و امانت اتصاف داشت بعض رسائلہ بود کہ گشتن این جماعہ بعد از جنگ و تصرف در اموال ایشان حسب شرع شریف جائز نیست، از وی رہبندند و قاضی معظوب ساکن کنڑا را کہ بہ علم فقہ و اصول فقہ مشہور و داماد قاضی فضیلت شیر شاہی کہ او را قاضی فضیلت میگفتند و یا اینہمہ خالی از مطابہ و ہزلے نبود انتخاب کردہ بجای قاضی طوایسی نصب کردند۔“
(منتخب التواریخ صفحہ ۱۶۶-۵، نولکشور)

اردو یگی یا 'اوردہ یگی'

ہمیں اردو یگی یا اوردہ یگی کے منصب کی اصل کیفیت سے

۱۔ طوایس من توابعات خراسان (منتخب التواریخ صفحہ ۱۶۶-۵، نولکشور ۱۸۶۸ء)۔

قرار واقعی اطلاع نہیں ہے۔ میرزا حیدر دوعلت اپنی تاریخ رشیدی میں لڑاہاشا میرزا ایک امیر کو خاندان اردو بیگی کا سرپرست بیان کرتا ہے^۱۔ آئین اکبری سے مفہوم ہوتا ہے کہ اردو بیگی شاہی محل سرا میں ایک اونچی قسم کی ملازمہ ہوتی تھی۔ چنانچہ قرۃ ذیل میں یہ نام ملتا ہے :

”و بیوست آن بطول و عرض شصت گز کلیم سرا پردہ ایستادہ کنند و خیمۂ چند در آن ترتیب یابد ؟ اردو بیگیان و دیگر زنان پارسا را آرامش جا باشد“^۲۔

فرہنگ نورالابصار میں مرقوم ہے :

”اوردہ بہ معنی خانہ و خانۂ بادشاہ آمدہ و ازان است اطلاق اوردہ بیگی بر زنانے کہ در خانۂ بادشاہ احتام دارند“^۳۔

گزشتہ صدی یعنی مغلوں کے آخری فرمان رواؤں کے دور میں دیکھا جاتا ہے کہ اوردہ بیگی مردانہ لباس میں ملبوس ہوتی تھی۔ سر پر پگڑی، کمر میں پٹکا یا سیلا باندھتی اور جریب ہاتھ میں رکھتی تھی ! محل سواؤں میں بادشاہ اور بیگموں کی چاکری بیا لاتی تھی۔ اردو زبان میں اوردہ بیگی کا اردا بیگی بنا لیا گیا تھا جس کی جمع اردا بیگیان ہے۔ جمع کی حالت میں اس لفظ کا زیادہ رواج ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس نام کا اطلاق ایک جماعت پر ہوتا تھا۔ یہاں ’یزم آخر‘ سے ایک مثال نقل ہے :

”کہاریان ہوادار لائیں، بادشاہ سواز ہوئے، اردا بیگیان مردانے کھڑے بنئے، سر پر پگڑی، کمر میں دوپٹے باندھے، جریب ہاتھ میں لیے اور حیثیاں، ترکیناں، قلاقیان جریب پکڑے تخت کے ساتھ ساتھ ہیں۔“

۱۔ انگریزی ترجمہ تاریخ رشیدی از ڈاکٹر ذہبی سن راس صفحہ ۷۰۔

۲۔ آئین اکبری مرتبہ سید احمد خان بہادر عارف جنگ صدر امین

ضلع جینور صفحہ ۳۲، مطبع السباعیل واقع دہلی ۱۶۲۷ء۔

۳۔ نسخۂ قلمی مملوکۂ پروغسر مجذ شعیب۔

فرہنگ آصفیہ میں اس کی تشریح میں لکھا ہے :
 ”مردانہ لباس کی ہتھیار بند عورت جو شاہی محلوں میں پہرا چوکی
 دیتی ہے۔“

اردو کا مندر

اس موقع پر جینی فرغے کے ایک مندر کا ذکر کرنا موزوں معلوم
 ہوتا ہے جس کا نام اردو کا مندر ہے اور قلعہ دہلی کے لاہوری دروازے
 کے قریب واقع ہے۔ اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ شاہجہان بادشاہ
 کے عہد میں تیار ہوا تھا اور دہلی میں جینیوں کے مندروں میں سب سے
 قدیم ہے۔ یہ روایت مشہور یہ مندر ان جینی سپاہیوں نے تعمیر کیا تھا
 جو شاہجہان کی فوج میں ملازم تھے۔ گویا خود مندر کا نام اس کے
 بانیوں کا تعلق اردوے شاہجہانی سے ظاہر کر رہا ہے۔ اس
 عبارت کی بابت یہ قصہ شہرت حاصل کر چکا ہے کہ ایک مرتبہ
 شہنشاہ عالمگیر نے اس مندر میں نوبت بجانے کی ممانعت کر دی؛ جینیوں
 نے شاہی حکم کی تعمیل میں نوبت موقوف کر دی؛ لیکن یہ ساز بغیر
 انسانی ہاتھ کے لگے ایک حیرت خیز طریقے سے خود بہ خود جتنا رہا۔
 اس عجیب و غریب واقعے کی اطلاع بادشاہ کے گوش گزار کر دی گئی؛
 عالمگیر کو یقین نہیں آیا اور اصل واقعے کی تحقیق کی غرض سے یہ ذات
 خود موقع پر آیا اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ نوبت بغیر کسی
 انسانی ہاتھ کی امداد کے آپ سے آپ ہیج رہی تھی۔ یہ فوق العادت معرکہ
 دیکھ کر بادشاہ نے اپنا امتناعی حکم واپس لے لیا اور پچاریوں کو نوبت
 بجانے کی اجازت دے دی۔“

اردو بازار

بازار ہر عہد میں مشرقی لشکروں کا ایک ضروری عنصر تھا۔

۱۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو بازار یا اس کے قریب میں واقع
 ہونے کی بنا پر اردو کا مندر کہلایا۔

۲۔ ”وائعات دارالحکومت دہلی“، از بشیر الدین احمد جلد دوم

ایک پرانا حوالہ لطائف الطوائف میں سلطان سنجر اور رشید وطواط کے قصے میں ملتا ہے جو حسب ذیل ہے :

”سلطان فرمود کہ رشید را پیدا کنند۔ بعد از تفحص بطبع او را در گوشه یافتند و خیر بہ سلطان آوردند ؛ حکم کرد او را بر سر اوردوی بازار برند و بیفت ہارہ کنند۔“

ایک مغربی حوالہ ۱۵۶ء کا ہایسن جابسن میں صفحہ ۶۴ پر تحریر و کی تصنیف سے منقول ہے جس کا ترجمہ یہ ہے :

”یہ لوگ اس مقام (یا ہزار) کو اردو بازار کہتے ہیں۔“
(طبع ۱۸۲۹ء باب عندہم صفحہ ۴۵)

ہندوستان میں یہ اصطلاح مغلوں کے عہد سے رائج ہے اگرچہ کوئی قدیم تحریری سند مجھ کو معلوم نہیں ہے۔ لورالہمار میں جو عہد بھد شاہی کی ایک فرہنگ ہے، ’’اردو‘‘ کی تشریح میں بیان ذیل ملتا ہے :

”بازار سے کہ نزدیک بہ خیمہ ہادشاہی همراه باشد ؛ بنا بر قرب خیمہ اطلاق کنند۔“

اس عہد کی ایک اور سند جو نادر شاہ ۱۱۳۸ھ و ۱۱۶۰ھ کے لشکر سے متعلق ہے اور اردو بازار اور الفس بازار کی بھدل کیفیت پر روشنی ڈالتی ہے، ایک انگریز تاجر سیاح ایران کی تالیف میں ملتی ہے۔ ذیل میں اس کا ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے :

”لشکر کا وہ حصہ جو ترکی زبان میں اردو بازار یا بازار لشکر کہلاتا ہے، چوکی خانے کے سامنے والے چوک سے شروع ہوتا ہے اور طول میں نصف میل تک بھبھلا ہوا ہے۔ یہ بازار ایک گلی کی طرح خیموں کی دو طرفہ قطار پر شامل ہے اور بہ خط مستقیم سبھا چلا گیا ہے۔ جہاں تک کہ زمین کی حالت اجازت دیتی ہے اس کی نگہ داشت ایک الفس کے سپرد ہے جو ’’اردو بازاری‘‘ کہلاتا ہے۔ بہ غرض اس دن میں کئی مرتبہ وہ بازار کی گشت لگاتا ہے ؛ جہاں کہیں

جھکڑا نساد ہوتا دیکھتا ہے فریقین کو داروغہ بازار کی خدمت میں بھیجا دیتا ہے۔“

اسی صدی کی ایک اور مثال ’ہیر وارث شاہ‘ میں یہ صورت ’ارد بازار‘ ملتی ہے :

ترا طور کچھ ہور دا ہور جاے عوار عجلاں دا چشم چار دانی
وارث شاہ کچھ رخت و حاج لہنے بوجا ہے کھلا ارد بازار دانی
’ارد بازار‘ اصل میں اردو بازار ہے جو اس تصنیف میں کئی
موقعوں پر مستعمل ہوا ہے ۔

۱۰۵۸ء میں شاہجہان بادشاہ نے نئی دہلی تعمیر کی : اس کی
تاریخ اس مصرع سے برآمد ہوتی ہے :

شد شاہ جہان آباد از شاہ جہان آباد

اس سے پندرہ سال گزشتہ میں قلعہ دہلی تیار ہو چکا تھا ۔ ائمہ دہلی
کا مغربی دروازہ جو چاندنی چوک کو جھانکتا ہے اور شہر پناہ
کا مغربی دروازہ (جو ایک دوسرے سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ہیں)
دہلی اور لاہور کی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے لاہوری دروازوں
کے نام سے یاد کیے جاتے تھے ۔ ان دروازوں کے مابین شہر کا بازار
خاص واقع تھا جو قلعے کے لاہوری دروازے سے شروع ہو کر سارے
شہر کو چیرتا ہوا شہر کے مغربی دروازہ لاہوری پر ختم ہوتا تھا ۔
زمانہ حال میں اس بازار کے مختلف حصے مختلف ناموں سے یاد کیے
جاتے ہیں : مثلاً کوتوالی ، گھنٹہ گھر ، چاندنی چوک ، طبع پوری اور
کنہاری پاؤلی ۔ اس بازار کا قلعے کی طرف والا حصہ گزشتہ صدی کے وسط
میں اردو بازار کے نام سے موسوم تھا ۔ اس کے متعلق سید احمد خان جادر
اپنی تصنیف ’آثار الصنادید‘ میں تحریر فرماتے ہیں :

”اور اس کے آگے بڑا بازار جس میں چاندنی چوک وغیرہ سب بازار

۱۔ ہیر وارث شاہ صفحہ ۱۸۲ طبع شیخ برکت علی شوکت علی

کشمیری بازار لاہور ۔ ۱۹۲۶ء

شامل ہیں۔ مگر اگلے زمانے میں یہ بازار لاہوری بازار یا اردو بازار کہلاتا تھا۔ یہ بازار قلعے کے لاہوری دروازے سے فتح پوری تک ہے۔ اس بازار کے پہلے حصے کو تو اردو بازار کہتے ہیں اور اس کے آگے جہان ترپولہ اور کوتوالی ہے وہ اسی نام سے مشہور ہے اور اس کے آگے چاندنی چوک کہلاتا ہے۔ اور اس کے آگے فتح پوری کا یہ بازار ہے۔ چالیس گز کے عرض سے بیس گز ادھر اور بیس گز آدھرا بیچ میں سرتا سر نہر جا رہی ہے! ارد گرد نہر کے دو دشتہ درخت لگے ہوئے ہیں۔“

لیکن اکبر شاہ ثانی (۱۵۵۳ء و ۱۵۵۶ء) کے عہد کی ایک تصنیف ہے جس کے ایک نسخے نوشتہ ۱۵۳۶ء کے چند اوراق میرے پاس ہیں اور جو شہر دہلی کی عبارات و کتبات و شوارح کے ذکر پر مشتمل ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اردو بازار سارے بازار کا نام تھا۔ اس کی عبارت ہے: ”بازار اردو کہ یہی دروازہ معروف قلعہ مبارک است از لاہوری دروازہ قلعہ نا لاہوری دروازہ شہر بناء۔“

یہ نامعلوم مصنف پورے بازار کی اکثر مگر چیدہ چیدہ عبارات کا ذکر کرتا ہے۔ پہلے بازار کے شمالی بازو کو تفصیلاً بیان کرتا ہے پھر جنوبی بازو کو لیتا ہے۔ اس بازار کا مفصل بیان جیسا کہ ۱۵۳۶ء میں وہ تھا یہاں ذکر کرتا اگرچہ دل چسپی سے خالی نہیں، لیکن میں یہ خوف طوالت اس سے دست کش ہوتا ہوں اور صرف دو ایک امور کا ذکر کرتا ہوں۔

مصنف کے بیان کے مطابق کوتوالی چوئیرے کے سامنے ایک اونچا لکڑا گڑا تھا جس کا نام ’’عل خان لکڑا‘‘ تھا۔ مجرموں کو اس کے ساتھ باندھ کر بیٹھا جاتا تھا۔ کچھ عرصہ قبل تک یہاں ایک چرخ یا شکنجہ بھی تھا جس کے ذریعے سے خونیوں کو سزا ملتی تھی۔ بازار کی جنوبی سمت میرزا اشرف بیگ کا شیش محل تھا جس کے قریب اسی میرزا کا گھڑیاں تھا۔ چاندنی چوک کے وسط میں حوض فیض نہر تھا جو اب گہشت گھر کا محل وقوع ہے۔

گزشتہ صدی کے پہلے ربع میں اگرچہ تمام بازار اردو بازار کے نام سے موسوم تھا لیکن شاہ جہان کے اواخر عہد کے ایک کتبے سے جو کٹڑہ میداگراں کے دروازے پر مزید بارچہ کے قریب کھاری باؤلی میں نصب تھا ، معلوم ہوتا ہے کہ اس نام کا سارے بازار پر اس وقت اطلاق نہیں ہوتا تھا ۔ یہ کتبہ جو خاصا دراز ہے ، درحقیقت ہمد معروف المخاطب بہ خواص خاں کا وصیت نامہ ہے جس کی رو سے خان موصوف نے اپنی تمام جائداد یعنی چند منزل کٹڑے ، حویلیاں ، دوکانیں ، حمام ، چند قطعات باغ اور زمین مع ہندوہ منزل دیگر دوکانات کے اپنی بہن کے نواسے ہمد اسماعیل کی تولیت میں برائے مصارف آثار شریف و تبرکات و عرس مولود نبی کریم و درس علوم دینی و مسجد جامع و خانقاہ مبارک وقف کر دی تھی ۔ اس کتبے میں کھاری باؤلی کو 'گنڈر لاہوری دروازہ' کے نام سے عبارت ذیل میں یاد کیا گیا ہے ۔

چنانچہ :

”واقع اندرون شہر پناہ گنڈر لاہوری دروازہ نزدیک مزید بارچہ مقرر کرد۔“

اس سے یہ امر تو صاف ظاہر ہے کہ اس عہد میں اس بازار کا کوئی خاص نام نہیں تھا ۔ علیٰ ہذا ہمد واوٹ جو عہد شاہ جہانی کا مورخ ہے اور اپنی تاریخ میں اس بازار اور اس کے دونوں چوکوں کا ذکر کر رہا ہے اور کسی قدر اس کی کیفیت بھی بیان کرتا ہے ، کسی خاص نام سے اس کو یاد نہیں کرتا ۔ اس لیے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو بازار کا استعمال خواہ تمام بازار کے لیے ، خواہ اس کے ایک حصے کے واسطے ، اس عہد سے بعد کا معاملہ ہے جو عالم گیر کے عہد میں کسی وقت ظہور میں آتا ہے ۔ اس زمانے کی ایک سند ہمیں تاریخ ’منتخب الباب‘ خاں خاں میں ملتی ہے جو ذیل میں ہدیۃ نالینین ہے :

”تا آنکہ روزے بادشاہ بہار جمعہ تشریف می آوردند از در قلعد مبارک تا مسجد جامع آتند ہنود فراہم آمدہ بقصد استفانہ سرواہ غلہ

مکان گرفتند و اژدھام نمودند کہ راہ تردد مردم مسدود گردید و صرافان و ہزاران و کل کا سیان اودو بازار و جمیع اہل حرفہ شہر ترک کسب و پیشہ نمودہ بہ مرتبہ ما بین راہ جمیع آمدند کہ بعد سوار شدن بادشاہ باوجود فرمودن اہتمام از روی زہر کہ سرو دست و پای جمعی شکست رسیدند ، سواری خاص تا مسجد متعذر گردید ۔“ (صفحہ ۲۲۵)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں اردو بازار پورے بازار کے لیے مستعمل تھا ، بعد میں یہ اس حصہ بازار کے لیے مخصوص ہو گیا جو قلعے کی جانب سے شروع ہو کر خونی دروازے پر ختم ہوتا ہے ۔ مسٹر کراسنفلن اپنی تالیف ’مونہومنٹل ریمینز آف دہلی‘ (یادگار اثریات دہلی) میں لکھتے ہیں جس کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے :

”بازار کا وہ حصہ جو قلعے کے لاہوری دروازے اور دریچے کے دروازے معروف بہ ’خونی دروازہ‘ کے مابین واقع ہے ، اردو بازار یا لشکر کا بازار کہلاتا ہے ؛ غالباً اس بنا پر کہ قلعے کی مقامی فوج کا ایک دستہ کسی وقت وہاں مقیم رہ چکا ہے ۔“

یہ بازار یا اس کا اکثر حصہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں تباہ ہو گیا ہے ۔ اس کے متعلق ایک تلمیح میرزا اسد اللہ خان غالب کے ایک خط میں جو میر سہدی کے نام ہے ، مذکور ہے اور تلمیحی فقرہ یہ ہے :

واہ رے حسن اعتقاد ! ارے بندۂ خدا اودو بازار نہ رہا ، اردو کہاں ! دلی کہاں ! واللہ اب شہر نہیں کتب ہے ، چھاؤنی ہے ۔“

میں نے اس بازار کے ذکر میں کسی قدر طوالت سے کام لیا ہے ، مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اکثر مصنفین اس بازار کے نام پر ہماری زبان کا نام اودو رکھ رہے ہیں جو بہ ظاہر ایک بے قرینہ اور ناموزوں بات معلوم ہوتی ہے ۔ اس کے مقابلے میں لشکر کی بناء پر

جس کو اردو بھی کہا جاتا تھا ، زبان کا نام اردو کہا جانا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے ، اور بعض بزرگوں کی رائے بھی یہی ہے ، لیکن اکثریت اس کے خلاف ہے ۔ ان کے نزدیک بازار کی بناء پر زبان کا نام اردو رکھا گیا ۔ اس بارے میں ہر مصنف کی رائے مختلف ہے ۔ کوئی کہتا ہے کہ اردو بازار دھلی کی وجہ سے یہ نام ملا ؛ بعض نے اس میں تعمیم کر دی ہے اور بازار لشکر پر نعت کی ہے ۔ بہر ایک گروہ ایسا ہے جو شاہ جہانی لشکر کے ساتھ زبان کی ایجاد منسوب کرتا ہے ۔ میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ ان مختلف راہوں کو ذیل میں درج کر دوں ۔

سب سے پیشتر صاحب ”ظہیر الانسا“ کی رائے نقل کرتا ہوں جس میں زبان اردو کی وجہ تسمیہ بتائی گئی ہے :

”چوں بازار را در ترکی و فارسی اردو گویند ضرورت استعمال این زبان مرکب دو بازارها ضرور تر شد ، خصوصاً دو بازار خاص بادشاہی کہ بہ تعلیم نام بازار خاص اردوئے معلیٰ بود ۔ لہذا نامزد تازہ مرکب نیز اردوئے معلیٰ قرار یافت تا این کہ باقرائیں ازمشہ آں تخصیص آداب شاہی باقی ماند ، آں التزام لفظ معلیٰ ہم ماند ، فقط اردو باقی ماند ۔ پس وجہ تسمیہ اردو ہمین است ۔“
(مقول ”از جلوۂ خضر“) ۔

اس بیان کی رو سے اردو بازار تعلیماً اردوئے معلیٰ کہلاتا تھا لیکن اردو بازار کے بیان میں ہمیں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملی ۔ لشکر کے لیے اردوئے معلیٰ کا خطاب اکبر کے عہد سے مستعمل رہا ہے ، لیکن میر امنؒ بھی اس بازار کو اردوئے معلیٰ کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ چنانچہ :

”جب حضرت شاہ جہان صاحب قرائن ثانی نے قلعة مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا اور شہر کو اپنا دارالاطلاعت بنایا تب شاہ جہان آباد مشہور ہوا ۔ اگرچہ دل جدی ہے ۔ وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے ۔ اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلیٰ خطاب دیا ۔“
(صفحہ ۴۰ ”باغ و بہار“)

سید احمد خان بہادر کتاب ”آثار المنادید“ میں لکھتے ہیں :

”اور جو کہ یہ زبان خاص بادشاہی بازاروں میں مروج تھی اس واسطے اس کو زبان اردو کہا کرتے تھے ، اور بادشاہی امیرالامرا اسی کو بولا کرتے تھے ۔ گویا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی یہی زبان تھی ۔ ہوتے ہوئے خود اس زبان کا نام اردو پڑ گیا۔“

مرزا قادر بخش صابر اپنے تذکرہ ”گلستان سخن“ میں کہتے ہیں :

”جو کہ یہ لوگ اردوے معلیٰ سلاطین کے متعلقین سے تھے ، اہل ہند ان الفاظ کو زبان اردو کہتے تھے ، یعنی یہ الفاظ جو ہماری زبان میں مل گئے ہیں سلاطین کے اردو کی بولی کے ہیں ۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ زبان تازہ کہ مجموعہ الفاظ ہندی و لغات السنہ مختلفہ سے جمع پہنچے تھے ، زبان اردو کے اسم سے مصطلی ہو گئی۔“

(صفحہ ۶۵ ، تذکرہ گلستان سخن ، طبع ۱۲۷۱ھ ، ۱۸۵۴ء)

عبدالغفور خان بہادر نساخ رسالہ در تحقیق زبان اردوے معلیٰ موسوم بنام تاریخی ”زبان ریختہ“ میں یوں رقم طراز ہیں :

”معلوم ہو کہ زبان اردو کو اردو کیوں کہتے ہیں ؟ اس کی وجہ تسمیہ کو بعضوں نے اس طرح پر لکھا ہے کہ زبان فارسی و ترکی میں اردو لشکر کو کہتے ہیں اور چون کہ یہ زبان لشکری و حضوری اہتمام گاہ پائے تخت شاہی کی زبان پر جاری ہوئی اس لیے اس زبان کا نام اردو پڑ گیا۔“

(صفحہ ۲ ، زبان ریختہ ، طبع نولکشور ۱۲۷۳ھ)

غزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم میں منشی درگا پرشاد گویا ہیں :

”حتیٰ کہ شاہجہان کے عہد دولت میں اردو بازار کی جو قلمی کے نیچے تھا ، اردو زبان مقرر ہوئی۔“

(غزینۃ العلوم ، صفحہ ۵۲ طبع منشی گلاب سنگھ ، ۱۸۷۹ء)

شمس العلام مولوی محمد حسینی آزاد کی رائے ”آب حیات“ میں یہ ہے :

”ترکی میں اردو بازار لشکر کو کہتے ہیں ۔ اردوے شاہی اور

دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے ، وہاں کی بولی کا نام اردو ہو گیا ۔ ایسے لفظ شاہجہان کا اقبال کہنا چاہیے کہ یہ زبان خاص و عام میں اس کے اردو کی طرف منسوب مشہور ہو گئی ۔“
(آب حیات ، صفحہ ۲۱-۲۰ ، ۱۸۸۱ء)

زبان اردو کی تاریخ میں منشی جرنی لال کا خیال ہے :
”چوں کہ لشکر کے بازار کو اردو کہتے تھے اس وجہ سے اس بازار کی بولی کا نام بھی اردو ہو گیا ۔“
(صفحہ ۶۶ مطبع رضوی - دہلی ستمبر ۱۸۸۳ء)

سید احمد مصنف ’فرہنگ آصفیہ‘ کا علیحدہ ذیل میں درج ہے :
”چوں کہ اول اول شاہ جہانی لشکر سے ابتدا ہوتی لہذا اس کا نام بھی اردو پڑ گیا ۔ قلعدہ معلیٰ کے لاہوری دروازے کے سامنے اردو بازار کے نام سے ایک بازار بھی آباد ہو گیا جو ہلاقی یکم کے کوچے اور چاندنی چوک کی سڑک کے جنوبی پہلو پر واقع تھا ۔“
(دیباچہ فرہنگ آصفیہ)

ایک اس قابل لحاظ ہے کہ بارہویں صدی ہجری میں یعنی ہد شاہ (۱۱۳۱ء و ۱۱۶۱ء) کے دور میں اردو سے معلیٰ خاص معنوں میں مستعمل ہو رہا ہے ۔ اس کے ذیل میں نہ صرف لشکر داخل ہے بلکہ درباری لوگ و دیگر اراکین و ملازمین شاہی بھی شامل ہیں ۔ دوسرے الفاظ میں اہل سیف و اہل قلم کی جماعتیں اس میں منسوب ہیں ۔ خان آرزو ’غرائب اللغات‘ میں جو اردو الفاظ پر ایک رسالہ ہے اور عبدالواسع ہانسوی کے رسالہ ہندی لغات کی ایک اضافہ شدہ و اصلاح یافتہ اشاعت ہے ، لفظ چھٹال کی تشریح میں کہتے ہیں :

”چھٹال در رسالہ زنی کہ سر از خانہ بیرون کند و چون کسی بند باز ہی شود ۔ لیکن چھٹال معلوم نیست کہ لغت کجاست ۔ ما مردم کہ از اہل ہندیم و در اردو سے معلیٰ می باشیم نشیدہ ایم و ظاہر چھٹال بہ معنی مطلق زن بدکارہ آئندہ ۔“

اردوے معلیٰ سے خان صاحب کی مراد غالباً شہر دہلی کی آبادی کا وہ حصہ ہے جو قلعہ معلیٰ کے قریب و جوار میں ہوچہ ملازمت شاہی زیادہ آباد ہے اور جس میں فوجی و منصب دار و درباری و دیگر ملازمین و شاگرد پیشہ شامل ہیں۔ یہ لوگ شہر کے دیگر محلوں اور آبادی سے منگالے میں زیادہ شستہ و سہلب توئے اور ظاہر ہے کہ اس طبقے کی زبان زیادہ صاف اور سنہری ہو گی۔

سید انتہاء اللہ خان اپنی تالیف ’دریائے لطافت‘ میں قریب قریب اسی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا بیان ہے :

”بعد تامل یہ قدر سلیقہ و فہم این ہیچ بدان چنین معلوم میشود و غالب کہ راست باشد کہ زبان شاہ جہان آباد زبان اشخاص قابل مصاحبت پیشہ دربار رس و گویائی زنان پری پیکر و کلام اہل حرفہ از مسلمانان و گفت گوی شہدہا و الفاظ خدم و تبع از قبل شاگرد پیشہ امراء است تا خاکروب ہم داخل ہمیں بیاعت باشد این مجمع ہر جا کہ برسد اولاد آنها دلی وال گفته شوند و محلہ ایشان محلہ اہل دہلی۔ و اگر تمام شہر را فراگیرند آن شہر را اردو نامند لیکن جمع شدن این حضرات در ہیچ شہرے سوائے لکھنؤ نزد فقیر ثابت نیست، گو باشندگان مرشد آباد و عظیم آباد بزعم خود خود را اردو دان و شہر خود را اردو دانند۔ زیرا کہ شاہ جہان آبادیان یہ قدر یک محلہ در عظیم آباد جمع پا شد و در وقت نواب صادق علی خان عرف میرن و نواب قاسم علی خان عالی جاہ ہمیں قدر در مرشد آباد یا زیادہ۔“

(صفحہ ۷۰-۷۱۔ دریائے لطافت، انجمن ترقی اردو)

یا اردوے معلیٰ سے مقصد محض لشکر ہے کیوں کہ زبان اردو سے مراد زبان لشکر ہے۔ وارستہ جو بہار اور خان آرزو کا معاصر ہے، اپنی کتاب ’مطلع السعدین‘ تصنیف ۱۹۸۱ء میں محمد الدین علی قوسی شوستری کے حوالے سے لکھتا ہے :

”لہذا مجدالدین قوسی شاستری در کتاب لغت^۱ خود کہ مسودۂ آن بہ خط خودش بہ نظر این ے سواد رسید ”پہلوی از عالم زبانے کہ در اردو ے معلیٰ بادشاہی ہداں متکلم باشند“ نوشتہ ہاں گروہے ہرین رفتہ اند کہ پہلوی و دری یکے است چہ دری زبان مردم درگاہ ملوک است و پہلوی زبان اردو۔“

بہر حال لشکر یا بازار یا خدم و حشم شاہی کی بنا پر یہ زبان ابتدا میں اردو ے معلیٰ کہلائی ؛ لیکن یہ خیال کہ شاہ جہان کے عہد ے اس زبان نے رواج پایا ، قرین قیاس نہیں ، کیوں کہ یہ زبان شاہ جہان کے عہد ے قبل موجود تھی اور اردو کا استعمال زبان کے تعلق میں شاہ جہان کے عہد ے بہت بعد کا واقعہ ہے اور سید مجد تقی میر ، شاعر مشہور پہلے شخص ہیں جو اس لفظ کا استعمال بہ معنی زبان ریختہ کرتے ہیں ۔ ”تذکرۂ نکات الشعراء“ میں جو بہ قول علامہ شروانی^۲ احمد شاہ (۱۱۶۱ھ و ۱۱۶۸ھ) کی تالیف ہے ، میر صاحب تحریر فرماتے ہیں :

”ہوشیدہ نمائند کہ در فن ریختہ کہ شعریت بہ طور شعر فارسی بزبان اردو ے معلیٰ شاہ جہان آباد دہلی کتابے کا حال تصنیف نشدہ۔“ (صفحہ ۱ ، ”نکات الشعراء سلسلۂ انجمن ترقی اردو)

میر صاحب کے بعد مجد حسین عطا خان قصیدین المطالب بہ مرصع رقم ہیں ؛ جب وہ فیض آباد آ کر نواب شجاع الدولہ کی ملازمت میں

۱ ۔ مجدالدین قوسی کی تصنیف ے مراد ’فرہنگ قوسی‘ ہے ۔ اس کتاب کی تاریخ تالیف ے ہم نا واقف ہیں لیکن اس کے حوالے کتاب عین عطا تالیف ۱۱۶۲ھ و سراج اللغة خان آرزو تالیف ۱۱۸۵ھ میں ملتے ہیں ۔ بلا حین اپنے مضمون فارسی لغات میں (رسالہ ابتدا تک سوساتی ہنگال بات ۱۸۶۸ء صفحہ ۲۶) اس کا ذکر کرتا ہے ۔

۲ ۔ ملاحظہ ہو مقدمہ نکات الشعراء از حبیب الرحمان خان شروانی

داخل ہوئے ہیں ، ایک روز انہوں نے امیر خسرو کی ، چار درویش ، فارسی کے مجوزہ ترجمے کا ایک حصہ نواب وزیر کو سنایا : اس نے بہت پسند کیا اور کتاب کی تکمیل کی فرمائش کی ۔ مؤلف نے حصہ تن مصروف ہو کر اس کام کو سر انجام دیا اور کتاب جس کا نام ’نوپرز مرصع‘ تھا نواب کی خدمت میں پیش ہوئے والی تھی کہ ۱۸۸۸ء میں شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا ۔ تحسین کچھ عرصے خاموش رہا ، بعد میں دیباچہ کتاب میں ایک قصیدہ بہ مدح نواب آصف الدولہ داخل کر کے کتاب مذکور نواب کی خدمت میں پیش کی ۔ یہ واقعہ ظاہر ہے کہ آصف الدولہ کی نوابی کے ابتدائی دور میں پیش آیا ہو گا ۔ ’نوپرز مرصع‘ کا فقرہ جس میں ’زبان اردوے معلیٰ‘ مذکور ہے ، حسب ذیل ہے :

”اور یہ کہ جو کوئی حوصلہ سیکھنے زبان اردوے معلیٰ کا رکھتا ہو ، مطالعہ اس گلدستہ بہارین کے سے عوش و شعور فحوائی کلام کا حاصل کرے ۔“

اس عہد کے اکثر مصنفین زیادہ تر اردوے معلیٰ لکھنے کے عادی ہیں ؛ یہاں چند اور حوالے ناظرین کی خدمت میں پیش ہیں :

”بعد از چندے با سعادت علی نام سیدے کہ از امر وہ بود برخوردارم ۔ آن عزیز مرا تکلیف موزون کردن ریختہ کہ شعریت بہ طور شعر فارسی زبان اردوی معلیٰ پادشاہ ہندوستان و در آن وقت وواج داشت ، کرد ۔ خودکشی کردم و مشق خود بہ مرتبہ رسانیدم کہ موزونان شہر را مستند شدم ۔“

(ذکر میر ، تالیف ۱۱۹۶ھ ، صلعہ ۷۷ ، طبع المبین ترقی اردو)

”کہ شا زبان دکتی را گذاشتہ ریختہ را موافق اردوے معلیٰ شاہ جہان آباد موزون بکنید ۔“

(قدرت)

۱ ۔ پروفیسر بلومہارڈ ، فہرست مخطوطات ہندوستانی ، انڈیا آفس لائبریری میں کتاب پیش کرنے کا سال ۱۷۸۰ء - ۱۱۹۳ء خیال کرتے ہیں ۔

”نہد قادری کے طوطی نامے کا ، جس کا ماخذ طوطی نامہ ضیاء الدین
نحشی ہے ، زبان ہندی میں موافق محاورہ اردو سے معلیٰ کے عبارت
سلیس و خوب ، الفاظ رنگین و مرغوب میں ترجمہ کیا اور نام اس کا
طوطی نامہ رکھا ۔“

(سید حیدر بخش حیدری از طوطا کہانی تالیف و طبع ۱۳۱۵ھ)

”اور اب اس عصر میں شاہ عالم بادشاہ کے مطابق سن بارہ سے پندرہ
اور اٹھارہ سو ایک عیسوی کے خلیل علی خان نے جو متخلص
بہ اشک ہے ، بموجب خواہی مسٹر کلکٹرائسٹ صاحب عالی شان والا
مناقب کے ، واسطے نو آموزوں زبان ہندی کے اس قصے کو زبان
میں اردو سے معلیٰ کے لکھا ، تاکہ صاحبان مبتدیوں کے بڑھنے کو
آسان ہووے۔“ (داستان امیر حمزہ از خلیل علی خان)

بعد کے اردو نگار لفظ معلیٰ ترک کر کے صرف ’زبان اردو‘
لکھتے ہیں۔ ان میں سب سے مقدم شیخ غلام ہمدانی مصحفی شاعر
مشہور ہیں۔ ذیل میں ان کے دو شعر درج کیے جاتے ہیں :

(۱) البتہ مصحفی کو ہے ریختہ میں دعویٰ

یعنی کہ ہے زبان دان اردو کی وہ زبان کا

(۲) خدا رکھے زبان ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی

کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

اس موقع پر ہمیں لاہور کے پیروں کے خاندان کے ایک فرد
پیر مراد شاہ کا تذکرہ کرنا چاہیے۔ یہ اپنے والد ماجد پیر کرم شاہ کی
معیت میں ۱۱۹۶ھ میں ہندوستان گئے اور لکھنؤ میں زیادہ قیام کیا۔
والد کی وفات کے بعد پیر مراد شاہ نے ایک منظوم خط ۱۲۰۳ھ میں
یاران وطن کے نام ارسال کیا ہے۔ اس خط سے دو شعر یہاں نقل
کرنا ہوں :

برائے تحفہ یاران آں سو

گہرھا آرم از بازار اردو

وہ اردو کیا ہے یہ ہندی زبان ہے
کہ جس کا قائل اب سارا جہاں ہے

باقی حوالے بہ قید تاریخ یہاں عرض کیے جاتے ہیں :
۵۱۲۱۵ : ”ایک دن صاحب موصوف نے مہربانی سے فرمایا کہ
گلستان سعدی شیرازی کا زبان اردو میں ترجمہ کرو۔“
(باغ اردو از میر شیر علی انیسویں ، ۱۲۱۵ء)
۵۱۲۱۷ : ”حقیقت اردو کی زبان کی بزرگوں کے منہ سے ہوں
سنی ہے۔“
(باغ و بہار ، میر امن صفحہ ۳)

۵۱۲۲۰ : ”ختم شد اردو ترجمہ تاریخ شیر شاہی یہ تاریخ
۵ جلدی الاول ۱۲۲۰ء“

۵۱۲۲۱ : ”انہی دہے میں گو ہر ایک زبان
حسن ترتیب سے رکھے ہے شان
ان میں سے ہر زبان اردو کی
ہے لطافت میں معدن خوبی“
(صرف اردو منظوم از مولوی اسات اللہ)
۵۱۲۳۱ : ”بالجملہ زبان اردو مشتعل است بر چند زبان یعنی
عربی و فارسی و ترکی و برہمی و غیر آن۔“
(دیوانے لطافت از انشا)

۵۱۲۳۵ : ”رسالہ اخوان الصفا کہ انسان و بہائم کے مناظرے میں
ہے ، تو اس کا زبان اردو میں ترجمہ کرو ، لیکن نہایت سلیس کہ
الفاظ مغلی اس میں نہ ہوویں۔“

مغربی مصنفین میں مسٹر گلکرائسٹ پہلے شخص ہیں جو اپنی
انگریزی تالیف ”قواعد زبان ہندوستانی“ طبع ۱۷۹۶ء مطابق ۱۲۱۰ء میں
اردو کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کے جملے کا ترجمہ یہ ہے :
”ریختہ وہ مخلوط زبان جس کو اوردو یا درہار کی شستہ زبان
بھی کہتے ہیں۔“
(صفحہ ۲۶۱)

اس کے بعد وقفہ وقفہ یہ لفظ عام رواج میں آ جاتا ہے اور زبان کے دوسرے پرانے نام مثلاً ہندی و رجنہ متروک الاستعمال ہونے لگتے ہیں ۔

قبل اس کے کہ یہ مضمون اختتام تک پہنچایا جائے ، میں ایک امر کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں ۔ وہ یہ ہے کہ جناب حکیم شمس اللہ قادری لفظ اردو (بہ معنی زبان) کے لیے رسالہ اردو سے قدیم میں ایک بڑی قدامت کے مدعی ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ مغلوں کی آمد سے قبل یہ لفظ بہ معنی لشکر و زبان ہندوستان میں استعمال ہو رہا ہے ۔ اپنے بیان کی تائید میں حکیم صاحب نے ’مؤیدالفضلا‘ کے ایک فقرے سے استناد کیا ہے ۔ میں انہی کے الفاظ یہاں نقل کرتا ہوں :

”مؤیدالفضلا سے (جو فارسی کی ایک مستند لغت ہے اور بابر کی آمد سے ایک عرصہ پہلے سلطان ابراہیم کے عہد میں لکھی گئی) ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان میں اسلامی لشکر کا یہی اردو کہلاتی تھیں اور زبان اردو کو اہل اردو کی زبان کہا کرتے تھے ۔ چنانچہ کتاب مذکور میں ایک مقام پر تحریر ہے :

”در زبان اہل اردو خون خراہا نامند“

بقول بلاخیمین کتاب مؤیدالفضلا ۱۹۲۹ء میں تالیف ہوئی ہے ۔ حکیم صاحب نے جو فقرہ نقل کیا ہے نولکشوری کی مطبوعہ مؤیدالفضلا ۱۸۹۹ء سے ماخوذ ہے لیکن نولکشوری نسخہ ایک ایسے نسخے پر مبنی معلوم ہوتا ہے جو جلال الدین اکبر (۱۵۶۵ء و ۱۵۷۰ء) کے عہد کے بعد بہ ظاہر تیار ہوا ہے ۔ اس میں سینکڑوں ایسے الفاظ موجود ہیں جو قلمی نسخوں میں نہیں ملتے ؛ اگرچہ نولکشوری نسخے کے مرتبوں کا دعویٰ ہے کہ ان کا نسخہ مصنف علیہ الرحمۃ کے مسودہ خاص سے تیار ہوا ہے :

”علی الخصوص از نسخه کہ خاص مسودہ مصنف مذکور بود“

(صفحہ ۵۶۶ ، جلد اول ، مؤیدالفضلا)

تاہم دیکھا جاتا ہے کہ مؤید کی جلد اول میں لفظ برسم کی تشریح کے سلسلے میں یہ عبارت مرقوم ہے :

”و لفظ گوید کہ اس لغت را از مجوسے کہ در دین خود بنایت قاضی بود و اردشیر نام داشت و در عہد پد اکبر شاہ از کرمان بہ ہندوستان آمدہ بود تحقیق نمودم۔“ (صفحہ ۱۵۹)

یہ بیان مصنف مؤید الفضل کا تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اکبر کے عہد کے بعد تک اس کا زندہ رہنا قرین قیاس نہیں ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ نولکشور نے ایک ایسا نسخہ طبع کیا ہے، جس میں کسی نامعلوم شخص نے عہد اکبری کے بعد بہت کچھ اضافے کیے ہیں۔

لیکن سب سے اہم یہ امر ہے کہ حکیم صاحب کا منقولہ فقرہ ”در زبان اہل اردو خون خراہا گویند“ بھلے فلسی نسخوں میں نہیں ملا اور کوئی تعجب نہیں اگر مطبع کے مصحح نے اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہو۔

اُردو ے قدیم کے متعلق چند تصریحات

(ایک جواب)

(از "اورینٹل کالج میگزین" تاہت مئی ۱۹۳۱ء)

اس عنوان سے ڈاکٹر محمد باقر ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی، پروفیسر اورینٹل کالج لاہور نے ماہ فروری کے رسالہ "اورینٹل کالج میگزین" میں ایک مضمون سپرد قلم کیا ہے جس میں صفحہ ۳۰ سے صفحہ ۳۴ تک انہوں نے میری بعض مزعومہ غلطیوں کو جو میری تالیف "پنجاب میں اردو" طبع ۱۹۲۸ء کی تحریر کے وقت مجھ سے سرزد ہوئی تھیں، بے نقاب کیا ہے۔ ان کی تنقید کا خلاصہ یہ ہے :

(۱) میں نے نامہ مراد کا سال تالیف ۱۱۹۳ مقرر کیا حالانکہ یہ خط اس وقت سے سات سال بعد یعنی ۱۲۰۳ء میں نظم کیا جاتا ہے۔

(۲) نامہ مراد کی تاریخ تصنیف معین کرنے میں غلطی کیا جانے کی وجہ سے میں نے یہ بھی لکھا کہ لفظ "اردو" کا استعمال مراد شاہ کے ہاں تحسین کی طرح قدیم ہے۔ گویا تحسین نثر میں اور یہ نظم میں سب سے پہلے لاتے ہیں۔

(۳) ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ مصحفی کا تذکرہ ہندی تحسین کی "نو طرز مرصع" سے چار سال قبل تالیف ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ تحسین نے سب سے پہلے نثر میں اردو کا لفظ زبان کے معنوں میں استعمال نہیں کیا بلکہ یہ مصحفی ہے۔

ان ممبروں کا جواب علیحدہ علیحدہ عرض کرتا ہوں ۔

(۱) مجھے الفوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے 'پنجاب میں اردو' سے میرے ایک قدیم بیان کو لے کر اس پر تنقید شروع کر دی اور میرے بعد کے بیان کو جو اس تالیف کے ایک سال بعد ہی 'اورینٹل کالج میگزین' ماہ مئی ۱۹۳۹ء کے نمبر میں شائع ہو چکا ہے ، نظر انداز کر دیا ۔ یہ مضمون سال مذکور کے ماہ جنوری میں مہرہء حال میں پڑھا گیا تھا ۔ اس کا عنوان ہے :

'اردو زبان اور اس کے مختلف نام'

میں اس مضمون سے ایک اقتباس ڈاکٹر صاحب کی اطلاع کے لئے یہاں درج کرتا ہوں :

"اس موقع پر ہمیں لاہور کے بیرون کے خاندان کے ایک فرد پر مراد شاہ کا تذکرہ کرنا چاہیے ۔ یہ اپنے والد پر کرم شاہ کی معیت میں ۱۱۹۶ھ میں ہندوستان گئے اور لکھنؤ میں زیادہ قیام کیا ۔ والد کی وفات کے بعد پر مراد شاہ نے ایک منظوم خط (نامہ مراد) ۱۲۰۳ھ میں ہارن وطن کے نام ارسال کیا ہے ۔ اس خط سے دو شعر یہاں نقل کرتا ہوں :

برائے تحفہ ہارن آن سو

کھرہا آرم از بازار اردو

وہ اردو کیا ہے یہ ہندی زبان ہے

کہ جس کا قائل اب سارا جہاں ہے

(صفحہ ۳۹ ، اورینٹل کالج میگزین ، اپریل ماہ مئی ۱۹۳۹ء)

(۲) اس نمبر کے متعلق ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :

"بہن سے نہیں کہا جاسکتا کہ مراد شاہ سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے نظم میں سب سے پہلے 'اردو' کا استعمال زبان کے معنوں میں کیا ہے ۔ غلام ہمدانی مصحفی ۱۱۹۶ھ سے لے کر ۱۲۳۰ھ تک یعنی مراد شاہ کے وقت میں بید حیات تھے ؟ مندرجہ بالا شعر ۱۲۰۳ھ

میں لکھا ہے اور مصحفی کا ایک شعر ہے :

خدا رکھے زبان ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

اس شعر میں بھی لفظ 'اردو' زبان کے معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔
ہو سکتا ہے کہ یہ شعر ۱۱۶۳ھ و ۱۲۳۰ھ کے بین بین مراد شاہ کے
پہلے ہی لکھا گیا ہو ۔ ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ مصحفی نے یہ
شعر لکھا ہے ، لیکن معین طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ شعر
مصحفی نے عمر کے کس حصے میں نظم کیا ہے ۔“
(صفحہ ۳۴ ، اورینٹل کالج میگزین ہائٹ فروری ۱۹۹۰ء)

ڈاکٹر صاحب اپنے بیان میں ڈھلعل اور مذہذب ہیں ، یعنی نہ
انہیں یہ معلوم ہے کہ مصحفی کا شعر مراد شاہ کے شعر سے پہلے لکھا
گیا تھا ، نہ انہیں یہ معلوم ہے کہ مصحفی نے کس حصے عمر میں
لکھا تھا ۔ اس لیے یقینی کی حالت میں بھی وہ میرے بیان کی تردید
کر رہے ہیں ۔ تردید بغرض تردید اسی کو کہتے ہیں ۔ ”ہو سکتا ہے“
تو کوئی وجہ نہیں لیکن مجھ سے سنیے ؛ جب شیخ مصحفی کا
یہ شعر میری نظر سے گزرا ، میں 'اردو' کے استعمال میں مصحفی کی
اولیت کا معاً قائل ہو گیا ۔ اس کی ایک دلیل میرے پاس یہ تھی
کہ شعر کی اندرونی شہادت سے واضح ہوتا ہے کہ اس کی تحریر کے وقت
میر تقی میر متوفی ۱۲۲۵ھ اور مرزا سودا متوفی ۱۱۹۵ھ زندہ تھے
جیسا کہ دعائیہ کلمے ”خدا رکھے“ سے ظاہر ہے ۔ اب ہم یقین کے ساتھ
کہہ سکتے ہیں کہ مصحفی کا یہ شعر ۱۱۹۵ھ سے قبل لکھا گیا ہو گا ۔
چوں کہ نامہ مراد ۱۲۰۳ھ میں لکھا گیا ہے اس لیے مصحفی کے شعر
کا تقدم مراد شاہ کے شعر پر ثابت ہے ۔ اسی بنا پر میں نے اپنے مضمون
”اردو زبان اور اس کے مختلف نام“ میں مصحفی کا ذکر پہلے کیا اور
مراد شاہ کا بعد میں کیا ۔ اس کا اقتباس حسب ذیل ہے :

”بعد کے اردو نگار لفظ معلول ترک کر کے صرف زبان اردو

لکھتے ہیں ۔ ان میں سب سے مقدم شیخ غلام ہمدانی مصحفی شاعر

مشہور ہیں۔ ذیل میں ان کے دو شعر درج کیے جاتے ہیں :

(۱) البتہ مصحفی کو ہے ریشہ میں دعویٰ

یعنی کہ ہے زبانِ دلِ اردو کی وہ زبان کا

(۲) خدا رکھے زبانِ ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی

کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے^۱

(صفحہ ۳۹ "اورینٹل کالج میگزین" ہایت مئی ۱۹۲۹ء)

ڈاکٹر صاحب جہاں مصحفی کا ایک شعر دے رہے ہیں ، میں

ان سے بارہ سال پیشتر دو شعر دے چکا ہوں ؟ آخر انہوں نے میری معلومات پر کون سا اضافہ کیا ۔

(۳) ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے : (الف) تحسین نے سب سے پہلے

نثر میں 'اردو' کا لفظ زبان کے معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ (ب) تحسین نے

اپنے بیان میں ایک تو 'اردو' کی بجائے زبانِ اردو معلیٰ کے نام سے زبان

کو یاد کیا ہے ، دوسرے ادبیات میں اس سے قبل مصحفی نے 'اردو'

کا لفظ زبان کے معنوں میں استعمال کیا ہے ۔ مصحفی تذکرۂ ہندی

میں نثار کے متعلق ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے :

"چون اصلی معیار است لہذا بتائے ریختہ ہم جنوی نہادہ اداے

زبانِ اردو چنان چہ باید از زبانِ نفرت بیانش میبود ۔"

مصحفی کا یہ تذکرہ جس میں اردو کا لفظ زبان کے معنوں میں

استعمال کیا گیا ہے ، تحسین کی تالیف 'نوطرزِ مرصع' سے کم از کم

چار سال پہلے لکھا گیا ہے ، جیسا کہ شہرانی صاحب نے بیان کیا ہے ۔

'نوطرزِ مرصع' کا سن تالیف ۱۲۱۳ھ ہے لیکن مصحفی کا تذکرہ

ہندی ۱۲۰۹ھ میں مکمل ہوتا ہے ۔۔۔۔۔۔ اس سے یہ امر پایہ

ثبوت کو پہنچتا ہے کہ تحسین سے چار سال قبل مصحفی نثر میں

۱۔ محشر شاکر د میں درد کا یہ شعر بھی یاد رہے :

گنگو اردو زبان کی کوئی ہم سے سیکھ جائے

کیا ہوا دہلی میں محشر اپنی یدائش نہیں

اردو کے لفظ کو زبان کے معنوں میں استعمال کر رہا ہے۔“
(صفحہ ۴۴ - ۴۵ ، اورینٹل کالج میگزین ، بابت فروری ۱۹۳۱ء)

(الف) ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر جلد بازی سے کام لیا ہے ؛
وہ میرا مطالب نہیں سمجھے ؛ میری مراد اردو نثر نگاروں سے تھی ۔
اس جماعت میں تحسین ہی ایسا شخص ہے جو سب سے پہلے اس لفظ کا
استعمال کر رہا ہے ۔ اس کے پیش روؤں میں دو تین شخص بچھے معلوم
ہیں لیکن وہ اردو یا اردوے معلیٰ زبان کے واسطے نہیں لاتے
بلکہ 'ہندی' وغیرہ کے لیے ۔

(ب) ڈاکٹر کا یہ اعتراض کہ تحسین 'زبان اردوے معلیٰ' لکھتا ہے
اور مصحفی محض 'اردو' ، ایک غیر ضروری باریک بینی اور موشگافی ہے ؛
مقصد دونوں کا ایک ہے ۔ جن اہام میں تحسین نے قلم اٹھایا ہے ان اہام
میں یہ زبان 'اردوے معلیٰ' یا 'زبان اردوے معلیٰ' شاہجہان آباد کے
نام سے یاد کی جاتی تھی ۔ بلکہ یہ امر الٹا تحسین کے تقدم کو مصحفی پر
ثابت کرتا ہے ، کیوں کہ زبان کا قدیم نام 'اردوے معلیٰ' تھا ، بعد میں
معلیٰ (صفی) حذف کر کے 'زبان اردو' یا یہ حذف زبان 'اردو' کہنے لگے ۔

ڈاکٹر کا یہ قول کہ مصحفی کا تذکرہ ہندی تالیف ۱۲۰۹ھ
تحسین کی 'نو طرز مرصع' سے چار سال قبل تالیف ہوتا ہے ، صحیح نہیں
معلوم ہوتا ۔ مولانا آزاد کی تالیف 'آب حیات' کے اثر میں بے شک میں
نے نو طرز مرصع کی تالیف ۱۲۱۳ھ بیان کی ۔ ہندوستانی سے تحسین کی
تالیف اس وقت تک میری نظر سے نہیں گزری تھی ؛ کچھ عرصے کے بعد
جب اس تالیف کے ابتدائی اوراق جو زیادہ تر ایک نامکمل سے دیباچے
پر شامل تھے ، میرے ہاتھ آئے ، ان کو پڑھ کر میں نے اپنی رائے
بدل دی ۔ عبارت آئندہ اس کتاب کے زمانہ تالیف پر روشنی ڈالتی ہے جو
میں اپنے مضمون مذکورہ بالا سے نقل کرتا ہوں :

"میر صاحب (میر تقی میر) کے بعد محمد حسین عطا خان تحسین
المخاطب یہ مرصع رقم ہیں ۔ وہ فیض آباد آکر نواب شجاع الدولہ
کی ملازمت میں داخل ہوتے ہیں ۔ ایک روز انہوں نے امیر خسرو

کی 'چار درویش' فارسی کے مجوزہ ترجمے کا ایک حصہ نواب وزیر کو سنایا ، اس نے بہت پسند کیا اور کتاب کی تکمیل کی فرمائش کی ۔ مؤلف نے عہد تن مصروف ہو کر اس کام کو سرانجام دیا اور کتاب جس کا نام 'نوطرز مرصع' تھا ، نواب کی خدمت میں پیش ہونے والی تھی کہ ۱۱۸۸ھ میں شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا ۔ تحسین کچھ عرصہ خاموش رہا ، بعد میں دیباچہ کتاب میں ایک قصیدہ نواب آصف الدولہ کی مدح میں داخل کر کے کتاب مذکور نواب کی خدمت میں پیش کی ۔ یہ واقعہ ظاہر ہے کہ آصف الدولہ کی نوابی کے ابتدائی دور میں پیش آیا ہوگا ۔" (صفحہ ۷۳ ، اورینٹل کالج میگزین ، بابت ماہ مئی ۱۹۲۹ء) ۔

اس طرح 'نوطرز مرصع' کی تاریخ تالیف ۱۱۸۸ھ کے تقریب بعد مانی جا سکتی ہے اور نتیجہ ظاہر ہے کہ 'نوطرز مرصع' کو ہر حال میں 'تذکرہ ہندی' تالیف ۱۲۰۹ھ پر تقسیم حاصل ہے ۔

میرے پاس 'نوطرز مرصع' کا جو نسخہ ہے وہ جیمز مارٹن کے واسطے ۱۲۱۳ھ میں نقل ہوا تھا ، اس کا خاتمہ یہ ہے :

"تمام شد قصہ منبر کہ نوطرز مرصع من تصنیف حسین عطا خان المتخلص و غائب بہ مرصع رقم خان کہ در علم خوش نویسی و حد عصر و مستثنیٰ بودند غفرلہ ذنوبہ ۔"

یہ نسخہ شجاعت علی کے نسخے سے نقل ہوا ہے جس پر ۱۲۰۹ھ ہجری فصلی درج ہے ۔

میں نے جب شاہ مراد کو نظم میں اور تحسین کو نثر میں سب سے اول 'اردو' کا لفظ استعمال کرنے والا کہا تھا ، اس وقت میرے پیش نظر اردو نگار تھے نہ فارسی نگار ؛ فارسی نگاروں میں 'اردو' لکھنے والے یقیناً اردو نگاروں سے اقدم ہیں ۔ ان میں خان آرزو سب سے قدیم ہیں جو 'غرائب اللغات' تالیف عبدالواسع ہانسوی کی اصلاح شدہ اشاعت میں ایک سے زیادہ موقعوں پر 'اردو' اور 'اصطلاح اہل اردو' لائے ہیں ۔ بعض امثال ملاحظہ ہوں :

غرائب اللغات میں عبدالواسع ہانسوی لفظ 'رجواڑہ' بہ معنی تجہ خانہ لائے ہیں ! خان آرزو اس لفظ پر معترض ہیں ! فرماتے ہیں :

”رجواڑہ بدین معنی اصطلاح شاہ جہان آباد است بلکہ اہل آردو است کہ این قسم اماکن اکثر در لشکر راجہا می باشند و الا دواصل رجواڑہ جائے بودن راجہاست۔“

رجواڑہ کی مثال میں شاہ مبارک آبرو کا یہ شعر یاد رہے :

فاسق کے دل پہ ڈالی جب نفس بد نے برگی
رجواڑے کی گلی کا تب جا غبار دیکھا

’گڑک‘ کی تشریح میں خان آرزو لکھتے ہیں : ”لیکن گڑک یہ اصطلاح اہل آردو نوعی است از شیرینی کہ از کجند و شکر سازند۔“ ان مثالوں میں اصطلاح اہل آردو سے مراد یہی زبان ہے ۔
’لکٹورہ‘ کے متعلق خان کا بیان ہے : ”لکٹورہ در عرف آردو وغیرہ یہ معنی حرف ناز و غرور است۔“

’ہڑبھتا‘ کے متعلق گویا ہیں : ”لیکن ہڑبھتا یہ زبان آردو اہل شہرہا نیست ، شاید زبان قریات و سوانح باشد و بدین معنی نکلتا شہرت دارد۔“ آخری مثال میں تو خان آرزو صاف ’زبان آردو‘ لکھ گئے ہیں ۔

یہ مثالیں میں نے اپنے ایک مضمون ’آردو کی شاخ ہریانی زبان میں تالیفات‘ سے جو نومبر ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا ، نقل کی ہیں ۔ اب جو باتیں میں لاہور میں پیشہ کر ۱۹۲۹ء و ۱۹۳۱ء میں لکھ چکا ہوں ، ڈاکٹر صاحب یورپ جا کر ان معلومات پر اضافہ تو درکنار ان کا پورا خاکہ تک اپنے ناظرین کی خدمت میں پیش نہیں کر سکے ہیں ۔

غلطیاں ہر شخص سے ہوتی آتی ہیں اور میں کوئی استثنا قائم نہیں کرتا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میری غلطیاں بتانے میں ڈاکٹر صاحب نے الفاظ و تفریط سے کام لیا ہے ۔ زیادہ رنج دہ یہ امر ہے کہ اس تمام واقعے کے متعلق وہ ۱۹۳۸ء و ۱۹۳۹ء میں مجھ کو لندن سے لکھ چکے ہیں اور میں جواب دے چکا ہوں ۔ میں نے خود ان کو

نامہ مراد بھیجوا یا اور نامی صاحب سے جواب دلوا یا ۔ ہم دونوں نے اپنی غلطی کا احساس کیا اور شرمندہ ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے ۲۳ دسمبر کے خط میں نامہ مراد کی رسد میں لکھتے ہیں :

”نامہ گرامی اور نامہ مراد ملا ؛ یاد آوری اور کرم فرمائی کا شکریہ ۔ آپ کو نامہ مراد کی تحصیل کے لیے بہت زحمت اٹھانی پڑی ۔“

دوسرے خط میں جو ۲۵ فروری ۱۹۳۹ء کا نوشتہ ہے ، لکھتے ہیں :

”نامہ مراد دیکھنے سے میں کہیں سے یہ معلوم نہ کر سکا کہ یہ تاریخ آپ نے کیسے معین کی ہے ۔ نامی صاحب نے کچھ مبہم سا بیان تحریر کیا ہے جس سے معنی دو بطن شاعر رہ گئے ہیں اور صاف طور پر کہیں سے پتا نہیں چلتا کہ نامہ مراد ۱۱۹۹ء میں لکھا گیا تھا ۔“

ان خطوں کے آنے پر مجھے نامی صاحب کی تلاش کرنی پڑی ؛ جب وہ اپنے گلوں سے تشریف لانے ان سے گفتگو ہوئی ۔ ان کو دکھایا گیا کہ اعتراض صحیح ہے ، دوسرے ذرائع دیکھے ۔ نامی صاحب جدا پریشان ہوئے ۔ ان سے ڈاکٹر صاحب کے نام خط لکھوا یا گیا اور دیگر ضروری اطلاع بھیجوائی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر یہ معاملہ ختم ہو جانا چاہیے تھا ، خصوصاً اس صورت میں جب کہ نامی صاحب ان کو لکھ چکے تھے کہ ”شیرانی صاحب کو میری مبہم تحریر سے دھوکا ہوا ۔ دیباچے کی تحریر کو آپ اب وضع نہ سمجھیں ؛ جو کچھ وہاں لکھا گیا ہے اسے نظر انداز کر دیں ۔“ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس معاملے کو ختم نہیں ہونے دیا اور بقول : ع

دگر از سرگرم قصہ زلف پریشان وا

اب از سرنو اس داستان کو ”اوربٹل کا لیج میگزین“ میں دہرا رہے ہیں ۔ یہ سلسلہ ہے میری اس حماقت کا جس کو ڈاکٹر صاحب میری ”کرم فرمائی“ کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ وہی مثال ہوئی ”نیک برباد گناہ لازم ۔“

اس مرتبہ پھر مجھ کو ندامت ہے سر جھکانا پڑتا مگر خوش قسمتی
 ہے ڈاکٹر صاحب کے مصحفی والے شعر نے میری مشکل کشائی کی ۔
 مجھے یاد آ گیا کہ میں نے خود کسی موقع پر یہ شعر نقل
 کیا تھا اور ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے میری اس مضمون کی
 طرف رہ کمانی کی جس میں یہ شعر آیا تھا ، یعنی "اردو زبان اور اس
 کے مختلف نام ۔"

آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فارسی تالیفات سے

اردو زبان کے وجود کا ثبوت

(از "اورینٹل کالج میگزین" بابت نومبر ۱۹۲۹ء)

ہمارے اکثر اہل قلم کا عقیدہ ہے کہ اردو زبان کو عالم وجود میں آنے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ان کے نزدیک شاہ جہان آباد کی تعمیر کے ساتھ اس زبان کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ عہد اکبری کی یاد گار ہے جب کہ شاہی دربار میں مختلف اقوام و ممالک کے لوگوں کا سنگم ہوتا ہے۔ سنٹر ہلاک میں جو گزشتہ صدی کے ایک مشہور مستشرق ہیں، سب سے منفرد رائے رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک عہد اکبری میں ٹوڈرمل کی مالی اصلاحات اس زبان کے وجود میں لانے کی ذمہ دار ہیں جن کی رو سے فارسی نے محکمہ مال پر قبضہ جا لیا تھا۔ چون کہ یہ رائے عام طور پر معلوم نہیں ہے اس لیے میں اسے یہ غرض اطلاع ناظرین یہاں درج کرتے دیتا ہوں؛ ان کا بیان ہے :

"ٹوڈرمل کے حکم اور اکبر کی لیاخت بالیسی جس کی بنا پر ہندو اعلیٰ ملازمتوں کے واسطے مسلمانوں سے مقابلہ کر سکتے تھے، اس امر کی تشریح کرتی ہے کہ اٹھارہویں صدی کے خاتمے سے پیشتر ہندو قوم فارسی زبان میں مسلمانوں کی تقریباً استاد بن گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ بالائی ہند میں ایک نئی بولی یعنی اردو رواج میں آئی جو ہندوؤں کا ذریعہ تعلیم بنے بغیر کسی حالت میں وجود پزیر

نہیں ہو سکتی تھی۔“

(انگریزی ترجمہ آئین اکبری ، صفحہ ۲۵۲ ، جلد اول)

اردو زبان کی قدامت کا نظریہ جو آئندہ سطور میں پیش کیا جاتا ہے ، اب تک جیسا کہ چاہیے اس پر کسی نے توجہ نہیں دی ہے ۔ ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ زبان ہندوستان میں مسلمانوں کے داخلے اور توطن گزینی کا نتیجہ ہے ، اور جوں جوں ان کی سلطنت اس ملک میں وسعت اختیار کرتی گئی یہ زبان بھی مختلف صوبوں میں پھیلتی گئی ۔ دسویں صدی سے اس میں تصنیفات کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے جو سب سے پہلے گجرات میں اور بعدہ دکن میں شروع ہوتا ہے ۔ اس صدی سے بیشتر اس زبان کے وجود کا پتا صرف فارسی تصنیفات سے لگ سکتا ہے جو نویں ، آٹھویں اور ساتویں قرن ہجری میں ہندوستان میں لکھی گئی ہیں ۔

ہندوستان میں فارسی تصنیفات غزنوی دور سے ملتی ہیں ۔ ان میں سب سے مقدم لاہور کے دو شاعر ابوالفرج رونی اور خواجہ مسعود سعد سلمان کے دیوان ہیں ۔ دہلی میں تاج الدین ریزہ ، منہاج سراج اور امیر خسرو ساتویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں ۔ آنے والی صدی میں امیر کے بعد ضیاء برنی اور مجد بن مبارک کرمانی ہیں ۔ ان کے بعد شمس سراج عقیف اور مولانا تاج الدین مفتی الملکی ہیں جو نویں صدی میں گزرے ہیں ۔ ان کے علاوہ ایک جماعت فرہنگ نگاروں کی ہے جو دہلی ، مالوہ ، بنگالہ اور گجرات میں ہوئے ہیں ۔

ان مصنفین کے ہاں ہندی الفاظ و محاورات کا ایک معتد بہ ذخیرہ ملتا ہے جو انہوں نے ضرورتاً دانستہ و نادانستہ اپنی تالیفات میں داخل کیا ہے جس سے ہمیں صاف پتا چلتا ہے کہ وہی زبان جس کو آج کل ہم اردو کہتے کے عادی ہیں ، ان ایام میں موجود تھی اور مسلمان اپنے گھروں میں اُسے بولنے کے عادی تھے ۔ الفاظ کے متعلق ممکن ہے یہ توجہ پیش کی جائے کہ پتا پر ضرورت ان کو فارسی میں داخل کر لیا گیا ہے ، اس لیے صرف الفاظ کی شہادت پر مسلمانوں میں ایک ہندوستانی زبان

کے استعمال کا عقیدہ نہیں مانتا جا سکتا۔ لیکن محاورات کے متعلق یہ توجیہ تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ فارسی تصنیف میں ہندی محاوروں کے ترجمے کا استعمال اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا مصنف ہندوستانی ہے اور یہ کہ وہ ہندوستانی زبان میں غور و فکر کرنے کا عادی ہے۔ اسی طرح اس زمانے کے بعض مستاہیر کے ہندی نام اور عرف دیکھ کر بھی حکم لگایا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس ملک کی زبان سے بہت گہرا تعلق رکھتے تھے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اصل مضمون کی طرف رجوع کروں۔

ہندی الفاظ کا استعمال سب سے پہلے عرب مؤرخین و سیاحین ہند کے ہاں ملتا ہے۔ مثلاً مسعودی ہندوستان کے مشہور سیوے ام کو 'ابج' کے نام سے یاد کرتا ہے اور امطرغری نیو کے ذکر میں لکھتا ہے کہ سندھی زبان میں اسے لیون کہتے ہیں۔

غزنوی دور میں ابوریحان البیرونی اپنی مشہور تالیف 'کتاب الہند' میں جو ہندوؤں کے علوم و فنون پر لکھی گئی ہے، سنسکرت کے علاوہ سینکڑوں ہندی الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔ ان میں ایک موقع ایسا آ گیا ہے جہاں ہندوؤں کے نصف ماہی ناموں کے ذکر میں اس نے ایک سے لے کر پندرہ تک گنتی کنائی ہے۔ مثلاً :

اواساس برقعہ (کذا) پڑوہ یہ تریہ جوت پنجے ست (کذا) چھٹہ							
و	ب	ج	د	ہ	و	ز	
میں	اتیں	نون	دھیں	یاہے	دواہے	ترہے	چودھے
پنجاہے							
ح	ط	ی	با	بب	بج	بد	بو

(کتاب الہند، صفحہ ۲۹۵)

مذکورہ بالا اعداد 'کتاب الہند' کے مرتب کا خیال ہے اسی زبان سے علاقہ رکھتے ہیں جو بہت کچھ موجودہ سندھی کے قریب ہے۔

فارسی کے میدان میں غزنوی دور سے ہندی الفاظ استعمال میں

آ رہے ہیں۔ فردوسی، عنصری، فرخی، منوچہری، اسدی، بیہقی اور سنائی کے ہاں ذیل کے الفاظ ملتے ہیں :

ہت ، دشمن ، شامہ ، کت ، چندن ، کوتوال ، نوبہار ، بیلک ، لکھن ، شل ، کتار اور ہانی ۔

ابوالفرج رونی

سلطان ابراہیم اور اس کے فرزند مسعود ثالث کے عہد کا شاعر ہے اور لاہور کا باشندہ ہے : اس کے دیوان میں یہ ہندی الفاظ ملتے ہیں :

دند ، جوہر ، جت

میں مثالیں بھی درج کیے دیتا ہوں :

بشکل پیل یک دندش نگہ کن

نعم چون پیل یک دندش ہزار است

(صفحہ ۲۰ ، طبع گلزار حسینی ، بمبئی)

آذرے کاندرو جوہر اوست

جوہر دیو پال ہو داؤن

(صفحہ ۹۰ ، طبع گلزار حسینی ، بمبئی)

کرد افغان و جت برغیت و حرص

پہرہ زد موکب سوار ملک

(صفحہ ۹۲ ، طبع گلزار حسینی ، بمبئی)

’دند‘ کے لیے صاحب لڑھک ریشدی نے کہا ہے کہ یہ ہندی لفظ ہے ۔ فرہنگ آند راج میں لکھا ہے :

”گویا این ملوس دند باشد کہ لغت ہندی است“

لیکن راقم کا خیال ہے کہ ابوالفرج لاہوری ہے ، اس لیے ’دند‘ اس نے پنجابی زبان سے لیا ہے جو دانت اور ہاتھی دانت کے لیے آج بھی بولا جاتا ہے ۔ ’پیل یک دند‘ ہے شاعر کا مقصد اک دنتا ہاتھی ہے ۔

’جت‘ بھی اصل میں پنجابی لفظ ’جٹ‘ ہے جو ایک قوم کا نام ہے ، اور جسے اردو میں جاٹ کہتے ہیں ۔ عرب مؤرخین ’زط‘ لکھتے ہیں ۔ جوہر سے مقصد راجپوتوں کی وہ رسم ہے جس میں دشمنوں سے عہدہ برآ نہ ہونے کی صورت میں وہ اپنے مال و اسباب کو چلا کر اور اہل و عیال کو قتل کر کے مقابلے میں آ ڈالتے تھے اور جب تک ایک ایک کر کے ہلاک نہ ہو جائے جنگ سے منہ نہ موڑتے ۔

خواجہ مسعود سعد سلمان

سلطان ابراہیم مسعود ثالث اور اوسلان بن مسعود کے عہد کے شاعر ہیں ، لاہور وطن ہے ۔ خواجہ کے ہاں یہ ہندی الفاظ ہیں :

کت ۔ مارامار ۔ برشکال ۔

امثال : ع

چونفلور بر تخت و نور بر کت
چورعد ز ابر بغرید کوس محمودی
برآمد از پس دیوار حصن مارامار

برشکال اے بہار ہندوستان
اے نجات از ہلائے تاپستان

’کت‘ کی تشریح میں فرہنگ نامہ قواس میں لکھا ہے :

”تخت ہندوان باشد میان بافتہ ۔“

’بہر الفضائل‘ اور ’شرف نامہ احمدنیری‘ و ’مؤید الفضائل‘ میں ’کت‘ بہ ہائے غلوٹ لکھا ہے اور وہی معنی دے ہیں ۔ ہمارے ہاں ’کت‘ کی موجودہ شکل ’کھاٹ‘ ہے ، لیکن ضیا، برنی اور صاحب ’سیرالاولیاء‘ کے ہاں پنجابی شکل میں ’کت‘ ہی ملتا ہے ۔ بعض فرہنگ نویسوں کا خیال ہے کہ ’کت‘ اصل میں چنی لفظ ہے جس کو نیموری فوجیں ایرانی میں روشناس کرتی ہیں ، مگر صحیح یہ ہے کہ یہ لفظ

ہندوستانی الاصل ہے؛ غزنوی عہد کے شعراء اس سے واقف ہیں اور ہندوستان کے سلسلے ہی میں ذکر کرتے ہیں :

فرخی

خلافت جدا کرد جیہاں را
ز کتھائے زرین و شاہانہ زیور

اسدی

بدو گفت صہراب شہ را بگوی
ذکر ہارہ باز آمدم رزم جوی
کہ ہر خون بیاہم کت و افسرت
برم زین مراندیب بے تن سرت

’ماہارمار‘ پنجابی اور اردو میں عام ہے جس سے مقصد آپس کی مار پیٹ اور حملہ وغیرہ ہے۔

’ہرشکال‘ - برش + کال ، یعنی بارش کا موسم ۔

عثمان مختاری غزنوی

سلطان مسعود ثالث و ارسلان کے عہد کے شاعر ہیں اور ہندوستان میں آئے ہیں ؛ ان کے ایک شعر میں دو ہندی لفظ ’چوں‘ اور ’مار‘ ملتے ہیں :

زمن بدیدے باوے بیستہ گفتمے چوں
مگیں بدیدے برمن نستہ گفتمے مار

حکیم سنائی متوفی ۵۵۴۷

عین الدولہ بہرام شاہ کے عہد کے شاعر ہیں ؛ ان کے ہاں دو لفظ ’کوٹوال‘ اور ’ہائی‘ ملتے ہیں :-

امثال :

جای و جان ہر دو پیشکر تواند
نہ دران معدہ خدرہ میدہ
کوٹوال و نفس شمار تواند
نہ دران دیدہ قطرہ ہائی

’کوٹوال‘ = کوٹ + والا یعنی مالک حصار۔ والا کا استعمال الفاظ کے آخر میں پنجابی اور اردو میں بہت عام ہے^۱۔

’ہائی‘ دراصل ہانڑی ہے۔ پنجاب میں آج بھی ہانڑی^۲ ہارے مخلوط ہندی بولا جاتا ہے، اردو میں اس کی ثقالت دور کر دی گئی۔

تاج الدین ریزہ

ان کو صاحب سیرالاولیاء و ہفت اقلیم تاج ریزہ اور مولانا جالی سیرالاولیاء میں تاج سنگریزہ لکھتے ہیں۔ یہ سلطان شمس الدین التمش اور اس کے جانشینوں کے مداح ہیں۔

ہد بن قوام شرح ’مخزن اسرار‘ تصنیف ۱۰۹۲ھ میں لکھتے ہیں کہ تاج ریزہ کو ہاتھی کے پاؤں تلے مروا دیا گیا تھا۔ ان کے ایک شعر میں دو ہندی لفظ ’سیر‘ اور ’من‘ استعمال ہوئے ہیں :

ضمیر از منے قدیم مرا سیر کن برطل
بگذار ازین حدیث کہ یک سیر و یک من است

’من‘ اگرچہ فارسی میں مستعمل ہے لیکن فارسی خوان زیادہ تر سیر کے مفہوم میں لاتے ہیں، مثلاً خواجہ حافظ :

دو ہار ہدم و از بادۂ کہن دو منے
مراغنے و کٹاہے و گوشۂ چمنے

تاج ریزہ کے ہاں اس کا مفہوم ہندوستانی من یعنی م سیر ہے۔

۱۔ کثرت استعمال ہے ’والا‘ کا آخری ’الف‘ گر جاتا ہے۔ ’وال‘ کے لائحے سے پنجاب میں بہت سے قسمیات و دیہات کے نام بنائے گئے ہیں، مثلاً موہن وال، ڈھولن وال، دھاریوال، سبجو وال، یگو وال، ہڑ وال وغیرہ وغیرہ۔ (مرتب)

۲۔ یہ تلفظ پنجابی کے علاوہ ہندی، سندھی، بلتانی و راجستھانی وغیرہ زبانوں میں بھی رائج ہے۔ (مرتب)

طبقات ناصری از منہاج سراج نوشتہ ۵۶۵۸

قاضی منہاج الدین اپنی تاریخ ناصرالدین محمود متوفی ۵۶۶۸ء کے نام پر مکتوب کرتے ہیں۔ ذیل کے ہندی الفاظ اس تصنیف میں موجود ہیں :

سیل - لک - بہار - سندھ - ہایک - پہلہ -

امثال :

- (۱) و او بر سلطان سیلے زد (صفحہ ۱۱۸)
- (۲) بخشش او لک لک و کشتن او لک لک (صفحہ ۱۱۸.....)
- (۳) و بہار یہ لغت ہندوی اسم مدرسہ باشد (صفحہ ۱۳۸)
- (۴) و او را یہ لغت ہندوی سندھ گویند (صفحہ ۱۵۸)
- (۵) و مبالغہ مرد ہایک و سوار از بہارچ بر سمت دہلی روان شد (صفحہ ۲۰۹)
- (۶) بعد از مدتی کہ آن خدمت بجا آورد پہلہ دار شد (صفحہ ۲۵۳)

’بہار‘ سنسکرت لفظ ’وہار‘ کی ہندی شکل ہے جو معبد و عبادت گاہ کے معنی دیتا ہے۔ بدھ مت کی بنا پر یہ لفظ ہندوستان سے باہر بھی پہنچ گیا ہے۔ یہ بیان کرنا دل چاہی سے خالی نہ ہوگا کہ ایران میں یہ لفظ زردشتی عہد میں بھی معلوم تھا۔ بلخ میں بدھ مت کا ایک مشہور مندر تھا جس کا نام ’نو وہار‘ یعنی نیا مندر تھا۔ دین زردشتی کے ظہور پر یہ مندر آتش کدہ بنا لیا گیا اور ’نوبہار‘ نام رکھا گیا۔ زردشتیوں کی روایات میں یہ نہایت مقدس مانا جاتا تھا۔ شاہ لہراسپ خلع سلطنت کے بعد اسی آتش کدے میں انوکھین ہوتا ہے۔ چنانچہ دقیقی لہراسپ نامے میں لکھتا ہے :

بلخ گزین شد بدان نوبہار کہ یزدان پرستان آن روزگار
سر آن خانہ را داشتندے چنان کہ سر مکہ را تازیان این زمان

اس مندر کا متولی ہرمک یا ہرمک کے نام سے مخاطب تھا۔ آل ہرامک جو غایفہ ہارون الرشید کی وزارت کے لیے مشہور ہیں اس معبد کے

قدیم متون نہیں۔ ہر ملک' بھی دراصل ہندی ہے، جس کے معنی پسواے معبد ہیں۔

'پایک' ۴ سنسکرت یا دانتک یہ معنی زیادہ۔ فارسی قاریوں میں یہ لفظ اکثر اوقات ہندو پیادے کے لیے استعمال ہوا ہے۔

'ہلہ' اہل لغت کہتے ہیں "در ہندوستان خریطہ طورے راگویند کہ ہمراہ اہل دول باشند و زر غیرات و کاغذ ہائے ضروری دو آن بود" ۵ اس سے لفظ ہلہ دار بنا جس سے مراد ایسا بلازم ہے جو اس خریطے یا بلوے کو لے کر آقا کے ساتھ ساتھ رہے۔

امیر خسرو

امیر تصنیفات متعددہ کے مالک ہیں اور ان میں ہندی الفاظ بھی مختلف مقامات میں پکھڑے ہوئے ہیں۔ میں سب سے پہلے 'قرآن السعدین' تصنیف ۶۸۸ء سے شروع کرتا ہوں جس میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں:

چوترو، ساغر، عوض، راوت، پایک، پگ، کوزہ، ہالا، کیورہ، سیوٹی، بیل، مولسری، سال، تبول، پیر، گل صد برگ، چونہ، بنگ، بلاندر۔

امثال:

(۱) چوترو و قصر بلندش دو آب

گشت ازان ساغر صافی حباب

(صفحہ ۳۲، قرآن السعدین، علی گڑھ ایڈیشن)

۱۔ اس لفظ کی اصل سنسکرت لفظ 'ہرمکھ' ہے جس کے معنی سردار، بزرگ اور معزز شخص کے ہیں۔ (مرتب)

۲۔ یہی لفظ فارسی میں 'پیک' یہ معنی قاصد کی صورت میں موجود ہے۔ (مرتب)

۳۔ فرہنگ آنتواج (صفحہ ۵۱۵) طبع نولکشور ۱۸۸۹ء۔ (مرتب)

- (۲) لشکر مشرق زغوفی تا بہ ہنگ
چیرہ دل و خیرہ کش و تیز جنگ
(صفحہ ۲۵، قرآن السعدین، علی گڑھ ایڈیشن)
- (۳) راوت ژوبین زن و خارا شکلی
ہشت بہ ہشت از بے روی مصاف
(صفحہ ۳۶، قرآن السعدین، علی گڑھ ایڈیشن)
- (۴) ہاپک بازی گر و موزوں احرام
دادہ بازی سر خود چہر نام
(صفحہ ۳۶، قرآن السعدین، علی گڑھ ایڈیشن)
- (۵) اے دھل والے بتان نہادہ
ہگ ہستہ و ریشہ کج نہادہ
(صفحہ ۳۶، قرآن السعدین، علی گڑھ ایڈیشن)
- (۶) آب کہ باران بگل کوزہ ریخت
کوزہ بینداد و شکست و بریخت
(صفحہ ۶۰، قرآن السعدین، علی گڑھ ایڈیشن)
- (۷) ہر گل ہالا کہ دھد بوستان
ہوشترے ہست بہ ہندوستان
(صفحہ ۷۰، قرآن السعدین، علی گڑھ ایڈیشن)
- (۸) کہورہ ہر برگ چو سم سید
عود ازو سوختہ چوں مشک بید
(صفحہ ۷۰، قرآن السعدین، علی گڑھ ایڈیشن)
- (۹) سیون خوش کہ کیندش گلاب
از ہمہ سو رو ہیمہ روے آب
(صفحہ ۷۰، قرآن السعدین، علی گڑھ ایڈیشن)
- (۱۰) یک گل بیل و دہ دیگر درون
گل ز گل و گل ز گل آمد برون
(صفحہ ۷۰، قرآن السعدین، علی گڑھ ایڈیشن)

(۱۱) مولسری خورد و بزرگ از هنر
خورد و بزرگ از دانش پسر و
(قرآن السعدین ، علی کڑہ ایلشن)

(۱۲) سادہ نوے کاجلس دے از سال خلعت
یک مد نو گشتہ شد سال راست
(صفحہ ۱۳۵ ، قرآن السعدین ، علی کڑہ ایلشن)

(۱۳) بیرہ نبول کہ صد برگ بست
چوں گل صد برگ پیامد بست
(صفحہ ۱۸۵ ، قرآن السعدین ، علی کڑہ ایلشن)

(۱۴) تا ز منے مجلس شد مزدہ یافت
ہنگ رہا کرد و بہ مجلس شتافت
(صفحہ ۱۱۲ ، قرآن السعدین ، علی کڑہ ایلشن)

’ساغر‘ یعنی ساگر ، بہ معنی حوض و تالاب ۔

’مغوض‘ یعنی اودھ ، ایک صوفے کا نام ہے ۔

’تراوت‘ راجپوت ۔

’ہاپک‘ پیادہ ۔

’کوزہ‘ اور ’صد برگ‘ دو ہندوستانی پھولوں کے نام ہیں ۔ یہ فارسی
نام مسلمانوں نے ہندوستان میں رکھے ہیں ۔

امیر فرماتے ہیں :

اگرچہ پارسی نامند اسرہا
ولے در ہند زادنند از زمین ہا
گر این گل در دیار پارسی زاد
چرا زونہست در گشتارشان باد

(صفحہ ۱۳۰ ، قرآن السعدین)

صد برگ کو آج کل ہزارہ کہتے ہیں ۔

(۱) . صفحہ ۵۵ ، طبع نولکشور ، ۱۸۷۵ء (مرتب) ۔

خزائن الفتوح ۵۷۱

یہ تصنیف علاؤالدین محمد شاہ خلجی (۱۲۹۵ء - ۱۳۱۵ء) کے عہد کی بعض جنگوں کے حالات میں ہے۔ امیر نے اسے اپنی طرز میں لکھا ہے۔ یہ کتاب سلطانہ ہمنوریکل سوسائٹی علی گڑھ نے گزشتہ سال شائع کی ہے۔ ذیل کے الفاظ اس میں مستعمل ہیں :

ہایک ، بیڑہ ، نبول ، راوت ، دھانک ، چونہ ، گھٹی ، ہسٹھ ، مار مار ، رائے۔

امثال :

- (۱) و از درون ہندوان مار مار فریاد میگردند (صفحہ ۸۷)
- (۲) چون ہسٹھائے رائے بیش سائبان لعل۔۔۔ پسیدند (صفحہ ۱۱۱)
- (۳) دریں ہفتہ روز گھٹیاے گزشتہ شد و شب و فرازے معاہدہ گشت (صفحہ ۱۲۸)
- (۴) کہ سنگ قلعہ را نیز چونہ سازند (صفحہ ۱۳۲)
- (۵) خود را ہمیشہ دھانکاں خاص تسلیم کردم (صفحہ ۱۵۰)
- (۶) راوتان را بیڑہ نبول ہاید داد (صفحہ ۱۶۰)
- (۷) باشارت رائے ہمہ برگستوانی و ہایک نبول شدند (صفحہ ۱۶۰)

ہسٹھ : اہاجی اور سفیر۔

گھٹی : یعنی گھاٹی یا ذرہ۔ امیر نے اس کو پنجابی لہجے میں لکھا ہے۔

دھانک : سنسکرت لفظ دھانٹک ہے یہ معنی تیر انداز و کبان داو۔ اسلامی افواج کے ساتھ ہندو فوجیں بھی ہوا کرتی تھیں ، مسلمان لشکر سے تہیز کے لیے وہ ہندی ناموں سے پکارے جاتے تھے۔ یعنی راوت ، ہایک اور دھانک وغیرہ۔

دیول رائی خضر خان ۵۷۱۵

یہ بھی حضرت امیر کی تصنیف ہے۔ الفاظ ذیل اس میں نظر سے گزرنے ہیں :

کیورہ ، جائے ، بیل ، کوزہ ، پتولہ ، کرنہ ، لادی ، کرنا ،
رائی ، رائہ ، راوت ، تپول ، رائے چہہ ، ماؤلسری ، میوت ، دونہ ،
سکھ آسن ، الاون ، تالی ، تنگہ ، ڈولہ ۔

امثال :

- (۱) سپاہ و راوت و رائہ ز حد پیش
پساده خود چہ گورم از عدد پیش
(صفحہ ۶۵ ، علی گڑھ ایڈیشن)
- (۲) ہاست افتاد باہیل و خزانہ
جہانے پر شد از رائی و رائہ
(صفحہ ۸۱ ، علی گڑھ ایڈیشن)
- (۳) سوم لادی گرفتہ پر سر این بار
کہ در ہندی است لادی بار بردار
(صفحہ ۱۰۱ ، علی گڑھ ایڈیشن)
- (۴) دوم کرنا کہ از نیکش خبر بود
زید چون نیم نام خویش کسر بود
(صفحہ ۱۰۰ ، علی گڑھ ایڈیشن)
- (۵) چنان بود آن پتولہ گسرچہ دلہد
کہ جان پارہ پتوان کرد پیوند
(صفحہ ۱۲۶ ، علی گڑھ ایڈیشن)
- (۶) وزان سو دلربائے عاشقان جائے
ہمہ تن پیر دلہا را شدہ جائے
(صفحہ ۱۳۰ ، علی گڑھ ایڈیشن)
- (۷) دگر آن رائے چہہ شاہ گدا
کہ بوئے مشکبار آمد جو ملہا
(صفحہ ۱۳۱ ، علی گڑھ ایڈیشن)
- (۸) دگر ماؤلسری کش طرفہ نامے
پرنگ طرفہ سروارید نامے
(صفحہ ۱۳۱ ، علی گڑھ ایڈیشن)

- (۹) دگر دونه کہ آن رضان ہند است
ز تری ہوش درخورد پسند است
(صفحہ ۱۳۲ ، علی گڑھ ایڈیشن)
- (۱۰) دگر کونہ کہ چون زوجیت بوئے
معطر گردد از یک خانہ کوئے
(صفحہ ۱۳۶ ، علی گڑھ ایڈیشن)
- (۱۱) نشانہ اندر مکہ آسن آن ہری را
چو گردون در ترازو مشتری را
(صفحہ ۱۳۲ ، علی گڑھ ایڈیشن)
- (۱۲) الاون را رگ از اندام بیرون
کندو بر پشت و رگہا کردہ برخون
(صفحہ ۱۵۷ ، علی گڑھ ایڈیشن)
- (۱۳) دگر ساز برغین نام آن تال
بر انگشت پریرویان قتال
(صفحہ ۱۵۷ ، علی گڑھ ایڈیشن)
- (۱۴)
پرندہ تنگہ چون در حشر نامہ
(صفحہ ۱۶۰ ، علی گڑھ ایڈیشن)
- (۱۵) بدولہ در نشست آن در کرم نضر
چو غیر مومنان در ہلہ حشر
(صفحہ ۲۵۲ ، علی گڑھ ایڈیشن)
- ’لادی‘ آج کل بوجہ کے واسطے آتا ہے ، یعنی وہ وزن جو کسی
جانور پر رکھا جائے۔ امیر کہتے ہیں کہ لادی ہار بردار کو کہتے
ہیں یعنی ہار برداری کے جانور کو : ع
کہ در ہندی است لادی ہار بردار
’بتولہ‘ یعنی پتولہ ۔ فرہنگوں میں اس کے لیے لکھا ہے

”ہانتہ ویشی کار ہندوستان۔“

”ماؤلسری“ مولسری ، اسیر نے دونوں طرح لکھا ہے ۔
”سکہ آسن“ بالکی

”الون“ طہور کی تسم کا کوئی ساز ہے ۔ بحرالفضائل میں اسے
”الین“ لکھا ہے اور تشریح میں ”ساز ہندوی است“ کہا ہے ۔ اس سے
ظاہر ہے کہ الون اور الین ایک ہی چیز ہے ۔

تاریخ فیروز شاہی از ضیاء برقی ۵۷۵۸ھ

مولانا ضیاءالدین نے یہ تاریخ فیروز شاہ کے عہد میں لکھی ہے ۔
اس تاریخ کے علاوہ وہ کئی مصنفات کے مالک ہیں ، یعنی حسرت نامہ ،
نمائے بھٹی ، صلوات کبیر ، عنایت نامہ الہی اور مآثر سادات ۱ ۔ تاریخ
آل برمک کا ترجمہ بھی انہوں نے فارسی میں کیا ہے ۔

یہ خوف طوالت میں امثال سے قطع نظر کرتا ہوں اور الفاظ کی
فہرست کے ساتھ ساتھ صفحات کا حوالہ ہی دیے دیتا ہوں ۔ میرے
زیر نظر بنگال اینسائیک سوسائٹی کی مطبوعہ تاریخ فیروز شاہی ہے ۔

- | | | |
|------|--------------------------|------------|
| (۱) | راہاں و رائگان | (صفحہ ۵۰) |
| (۲) | تلونڈیا | (صفحہ ۵۱) |
| (۳) | ہک لک ہا پک و دھانک | (صفحہ ۵۲) |
| (۴) | در زمین جٹوان و منداہران | (صفحہ ۵۳) |
| (۵) | چبوترہ ناسری | (صفحہ ۵۴) |
| (۶) | دھولپا زنان | (صفحہ ۵۴) |
| (۷) | میر ہا و کشتیا | (صفحہ ۸۴) |
| (۸) | دو لک آدمی | (صفحہ ۸۶) |
| (۹) | کھار و کھوان | (صفحہ ۸۶) |
| (۱۰) | و کھب و فراش او نو بودے | (صفحہ ۱۱۷) |

- (۱۱) مسخر گان و بهندان (صفحه ۱۳۰)
- (۱۲) یز برای تنگه و چپل (صفحه ۱۳۷)
- (۱۳) بهندانی بهندان (صفحه ۱۶۳)
- (۱۴) ناداشتی و بهندانی (صفحه ۱۶۳)
- (۱۵) ملک هن مار (صفحه ۱۷۷)
- (۱۶) ملک جهجو (صفحه ۱۸۱)
- (۱۷) پیره قنپول (صفحه ۱۸۲)
- (۱۸) و شراب کچه خوار (صفحه ۱۸۲)
- (۱۹) سلطان بر هوده نشسته بود (صفحه ۱۸۳)
- (۲۰)
- (۲۱) تهاگان در شهر گرفتار شدند (صفحه ۱۸۹)
- (۲۲) ثیکه بر هندان (صفحه ۲۰۰)
- (۲۳) کوتوال (صفحه ۲۱۰)
- (۲۴) دب (صفحه ۲۱۲)
- (۲۵) و غله به یک چپل میرے رسید (صفحه ۲۱۲)
- (۲۶) مندل زنان (صفحه ۲۱۶)
- (۲۷) ابریسیم و بتوله آورد (صفحه ۲۲۳)
- (۲۸) فرمود تا کشتیا را جانب کره الا هو کنند (صفحه ۲۳۱)
- (۲۹) ملک چونا (صفحه ۲۳۷)
- (۳۰) ملک فخرالدین کهنه (صفحه ۲۳۹)
- (۳۱) ملک وکن الدین انبه (صفحه ۲۴۱)
- (۳۲) و اگر تو لقمه خواهی کرد (صفحه ۲۴۵)
- (۳۳) چهار ها بسته بودند (صفحه ۲۷۸)
- (۳۴) سلسانیان و ساغان (صفحه ۲۸۹)
- (۳۵) بگتی و بنگه . . . بگتی گران (صفحه ۲۸۳)
- (۳۶) بهنیا (صفحه ۲۸۵)
- (۳۷) بسوه کنند (صفحه ۲۸۷)
- (۳۸) غوطان یا پلاهران (صفحه ۲۸۷)

- (۳۹) چرائی - (صفحہ ۲۸۷)
- (۴۰) کڑی و چرائی (صفحہ ۲۸۸)
- (۴۱) چودھری چودھریان پکن چیتل ازبئی (صفحہ ۲۸۷)
- (۴۲) لکھا و کروڑا (صفحہ ۲۹۳)
- (۴۳) چبوترہ سبحانی و موری دھنہ (صفحہ ۳۰۱)
- (۴۴) منہ (صفحہ ۳۰۳)
- (۴۵) موتھہ درمنے سد چیتل (صفحہ ۳۰۵)
- (۴۶) بر و موبن (صفحہ ۳۱۰)
- (۴۷) نتو (صفحہ ۳۱۳)
- (۴۸) رہوری ۰۰۰ ساری (صفحہ ۳۱۶)
- (۴۹) دھاوہ (صفحہ ۳۲۰)
- (۵۰) اباحتیان و بودھکان پیدا آمدند (صفحہ ۳۲۶)
- (۵۱) مٹھ ہا و - جوہا پر آب دھر چبوترہ . . . چھپرے (صفحہ ۳۳۳)
- (۵۲) ناگرہان و برہمستان و چاتیان (صفحہ ۳۶۳)
- (۵۳) در دل او غیرت و غصہ افتاد (صفحہ ۳۶۷)
- (۵۴) تیرو دانگ (صفحہ ۳۸۵)
- (۵۵) در پرنگاہ خود (صفحہ ۳۲۰)
- (۵۶) ملک بہتاخازن (صفحہ ۳۲۳)
- (۵۷) بسینہاں (صفحہ ۳۳۷)
- (۵۸) تھانہا (صفحہ ۳۴۷)
- (۵۹) دھاوہ (صفحہ ۳۴۷)
- (۶۰) دف و دھولک (صفحہ ۳۵۲)
- (۶۱) گھائیہاے بازگشت (صفحہ ۳۷۸)
- (۶۲) سولندھار (صفحہ ۳۸۲)
- (۶۳) بدھلیا (صفحہ ۳۸۳)
- (۶۴) بہنگری و بہنگی (صفحہ ۳۸۷)
- (۶۵) یکم بلشت زمین - (صفحہ ۳۹۸)

- (۶۶) زمین اکھل (صفحہ ۴۹۹)
- (۶۷) مٹکا طباخ..... لداھا باغبان..... شیخ بابو ٹاپک (صفحہ ۵۰۵)
- (۶۸) و در آن آیام غصہ سلطان جد پر خالی بیشتر بود (صفحہ ۵۱۳)
- (۶۹) باسواران تہذ خود (صفحہ ۵۱۳)
- (۷۰) ملک قبول تو را باند (صفحہ ۵۲۸)
- (۷۱) دھکراں لشکر (صفحہ ۵۳۳)
- (۷۲) پگھا دو گردن انداختہ (صفحہ ۵۳۵)
- (۷۳) نہوسولہل — حسام اذہنک (صفحہ ۵۴۷)
- (۷۴) لکوک و کروڑ (صفحہ ۵۵۳)
- (۷۵) دیہا و باغیا و بھٹیا مسلم داشتہ (صفحہ ۵۵۵)
- (۷۶) موٹھی و کتجد (صفحہ ۵۶۸)
- (۷۷) گل کر نہ و سیوی ... جنبیری ... کرنہ جھوانک ... پوٹلہ کھرنی و جیوی ... بڈھل ... سینل (صفحہ ۵۶۹)
- (۷۸) کتکھر (صفحہ ۵۹۰)
- (۷۹) سپاوتان (صفحہ ۵۹۳)
- (۸۰) مشعلیا و ڈیولٹا بسیار بر افروختند (صفحہ ۶۰۹)
- ’تاونڈی‘ اس کے معنی پنجابی میں موضع ، بستی اور نوآبادی کے ہیں ۔ پنجاب میں آج بھی یہ لفظ مستعمل ہے ، مثلاً تاونڈی گوجران ۔ برنی نے اسی طرح لکھا ہے ، یعنی تاونڈی کھو کھراں (صفحہ ۵۳)
- ’جٹوان‘ یعنی جاٹ جٹو ۔
- بھٹ ۔ بھانڈ کی پنجابی شکل ہے ۔ اس سے بھنڈائی یہ معنی بھنڈائی بنا لیا ہے ۔
- ’کھنڈ‘ کھانڈ کی پنجابی شکل ہے ۔ قند اسی کا معرب ہے ۔
- ’ہرنسار‘ یہ تقلید فارسی اسم فاعل بنا لیا گیا ہے ۔ ایسی ترکیبیں آج بھی رایج ہیں ، مثلاً ہتھ چھٹ ، کھل اھاڑ ، لے لوٹ ، دل بھینک اور مکھی مار ۔

’ہکتی‘ ایک قسم کی شراب کا نام ہے ، اس سے ’ہکتی گرو‘ بنا لیا ۔

’کری‘ یعنی کڑی ۔ ایک قسم کا ہصول جو گوار پر لیا جاتا ہے ۔

’منڈہ‘ یعنی منڈی ۔

’ادھاوہ‘ یعنی ڈاک کا ہرکارہ اور ڈاک ۔

’سوندھار‘ عاوارے میں اب بھی ادھار سدھار ہولا جاتا ہے ۔

اس میں سدھار کو تابع سہل مانا گیا ہے ۔ سوندھار سے معلوم ہوتا ہے

کہ یہ لفظ یا معنی ہے اور ادھار کا مرادف ۔

’پجائی‘ یعنی جتی ۔ جینی مذہب کا درویش اور عالم ۔

’ڈانگ‘ لٹھ اور چوب دستی ۔

’منڈل‘ جلسہ اور جماعت ۔

’ہلشت‘ بالشت کی پنجابی شکل ہے ۔

’منکا‘ مانکیا کی پنجابی شکل ہے ۔

’لدا‘ یعنی لادھیا ۔

’جموں‘ جاموں کی پنجابی شکل ہے ۔

’موٹھی‘ آن ایام میں بعض الفاظ کے آخر میں ایک یا بے زائدہ

ملتی ہے ، مثلاً جوار کو جواڑی ، چہر کو چہری ، کہنہ کو کہنی

کہنے سے ۔ پنجاب میں آج بھی ایسی ’ی‘ بعض الفاظ میں موجود ہے ،

مثلاً جواڑی ، مکی ، سکی ، سری ، وغیرہ ۔

صیرالاولیا

یہ کتاب خواجہ نظام الدین اولیاء اور ان کے خلفاء و معاصرین

وغیرہم کے حالات میں ہے ۔ اس کے مصنف سید محمد بن سید مبارک کرمانی

المتوفی ۷۷۷ھ ہیں ۔ الفاظ ذیل اس میں مرقوم ہیں :

چنڈو گھر ، چوترو ، ہیلو ، کھٹ ، خوش ، جواڑی ، لک ،

جینل ، عورت ، مہین ، تلخ ، کریلہ ، ڈولہ ، منڈی ، شیخ موہن ،

ہیکہ ، بھوکا یعنی عیش ، پٹی کھٹ (ہاضات) ، بی بی والی ،

کرہل (دوخت) ، کہنڈ سال ، لنگھن ، ہندی خانہ بھاکسی ، دوخت بڑ ،

جامہ جھمرٹی ، کھچڑی ، آہری ، ہلنگ ، سانڈی ، مولانا شہاب الدین

گستوری ، ہتھاول (ہتھاول) ، آکلہ ، محمود پٹوہ ، رومال ، جگری ، چھیری ، چھپر دار ۔

’خوش‘ کا مفہوم وہی ہے جو اردو میں آتا ہے یعنی شاد و سرور
بقایت خوش شد ۔ (صفحہ ۶۶)

اس کو میں ہندوستانی اثر کے نام سے یاد کرتا ہوں ۔ خوش کے
یہ معنی صرف ہندوستان میں آتے ہیں ، فارسی میں زیادہ تر مرغوب و
پسندیدہ کا مفہوم لیا جاتا ہے ۔

’عورت‘ یہ معنی زن فارسی میں آتا ہے لیکن اردو میں اس سے مراد
بیوی بھی لی جاتی ہے ۔ صاحب ’سیرالاولیا‘ نے ’ہاں عورت او ہو د‘
(صفحہ ۸۸) میں بیوی یا زوجہ کے معنوں میں استعمال کیا ہے ۔ یہ بھی
ہندی اثر ہے ۔ اردو میں آج بھی یہ معنی لیے جاتے ہیں ۔

’لنگھن‘ روزہ ہندوان ۔ مثلاً :

لنگھنت گرت ترا کشفد سر پہ

سیر غورون ترا پہ از لنگھن (صفحہ ۸۸)

’بھاگسی‘ قید خانہ و قید ۔

’جگری‘ اس میں یہ قول شیخ بہاء الدین برناوی زیادہ تر
مشائخ کا شجرہ ہوتا تھا ؛ بعد میں اور مضامین بھی لائے جانے لگے ۔
اصل میں ’ذکر‘ یا ’ذکری‘ تھا ، ہندوستانی اثرات میں جگری بن گیا ۔

تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عقیف

یہ کتاب امیر تیمور کے حملے کے بعد لکھی جاتی ہے ۔ مصنف کے
والد اور چچا فیروز شاہ تغلق (۷۵۳ھ و ۷۹۰ھ) کے ملازم تھے اور
مصنف ان کے قائم مقام کے طور پر کام کرتا رہا ۔ اس کتاب کے علاوہ
مناقب ہد شاہی اور کتاب باواہی بھی انہی کی تصنیف ہے ۔ ذیل کے
ہندی الفاظ اس قاریج میں شامل ہیں ۔ طوالت کے ڈر سے میں نے صرف
الفاظ پر قناعت کی ہے اور حوالہ صفحات ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی
مطبوعہ تاریخ سے دیا ہے :

(صفحه ۳۷)	تلونڈی. مال سالینہ
(صفحه ۶۵)	چوڈول زرین
(صفحه ۷۰)	ہنگ از سر فرود آوردہ
(صفحه ۷۵)	خرمک
(صفحه ۹۳)	دو کروڑ مال. بوجھ سو دھار
(صفحه ۹۹)	در تنگہ دو چیل
(صفحه ۱۰۰)	ہلنگہائے خوب
(صفحه ۱۰۳)	رای بدیع ہو ہوشی
(صفحه ۱۰۸)	بہر دو پیش محل
(صفحه ۱۰۸)	طاس گھڑ پالہ. نثار چہتر
(صفحه ۱۱۱)	پانصد منے سنگ
(صفحه ۱۱۱)	کنگھرہ ہندانیہ
(صفحه ۱۱۳)	دولک پیادہ
(صفحه ۱۱۸)	دیرہ سلطان فیروز شاہ
(صفحه ۱۲۵)	پنجاہ کر کہ. . چم کر کہ. . چولہ پاکھرو آسختہ
(صفحه ۱۲۸)	سدا پھل و جنبہ پری. . . ہونڈ
(صفحه ۱۳۵)	ملک ہرشچنہ نشی
(صفحه ۱۳۶)	کھاران با ڈولہ ایستادہ. . . کراہہ ڈولہ نیم تنگہ
(صفحه ۱۳۸)	سلطان ہمد راجو نان نام بود
(صفحه ۱۵۶)	تورا پاند
(صفحه ۱۶۸)	ڈھولی
(صفحه ۱۷۰)	دو زمین جاجنگر مہتہ را ہاتر گویند
(صفحه ۱۷۱)	پیلان چندہ فرستادہ آہند
(صفحه ۱۷۸)	کوشک چندواڑی (م ن مہندواڑی)
(صفحه ۱۷۹)	زمین اکھل
(صفحه ۱۸۸)	در ہوا دھکے مہخوردند
(صفحه ۱۹۶)	کڑھای مال
(صفحه ۲۰۸)	کونگی ون

- یک سیر کھجڑی (صفحہ ۲۱۶)
 چوکیا می باید نشاند (صفحہ ۲۲۶)
 منگہ پنج تنگہ منے بود (صفحہ ۲۳۳)
 طائفہ ہندوگان باہلی..... گھڑ پال خانہ (صفحہ ۲۴۱)
 محل داکھ..... محل چھجٹہ چوہیں (صفحہ ۲۴۴)
 ہند سالوہ..... ہشتاد ہنی (صفحہ ۲۶۶)
 دوخت سینل..... کھنسی (صفحہ ۳۰۹)
 باہن پیس کردہ (صفحہ ۳۱۱)
 آنرا ہندوی کس گویند..... ژنار داران و سپوژگان (صفحہ ۳۱۲)
 طائفہ کھار و کھوانی (صفحہ ۳۲۵)
 دو جیکے یا کیلے (صفحہ ۳۲۷)
 اگر در تلے و دھنڈے ماہی ہونے.....
 در آن تل و دھنڈ اندازند (صفحہ ۳۲۸)
 دو دیگ ڈولہ آہنیں (صفحہ ۳۲۸)
 ہند مالجہ..... ہند سپہال یو..... ہند سالوہ
 ہند سپہنہ (صفحہ ۳۳۰)
 عبدالحم غریب جاہر سولہ مار..... چولہ یز و راج
 لکھوک (صفحہ ۳۳۱)
 مہر نیم چیتل کہ آنرا ادہ گویند و مہردانگ چیتل
 کہ یکہ خوانند (صفحہ ۳۳۳)
 پیش سمدھیان (صفحہ ۳۵۱)
 برگ دوختان نگرک کہ آنرا دو عرف جے گویند (صفحہ ۳۶۱)
 میکند (صفحہ ۳۶۲)
 طائفہ ادو تیان (صفحہ ۳۶۷)
 دونفر ڈھول (صفحہ ۳۷۰)
 دانکانہ کہ آنرا دھنکانہ گویند (صفحہ ۳۷۹)
 ہر دو را منسکہ می گفتند - (صفحہ ۳۸۵)
 گردونہا..... کہ بہ زبان ہندوی بھر کر

(صفحہ ۳۹۳)	(بہرگہ) گوہند
(صفحہ ۳۹۵)	روزینہ در خزانہ
(صفحہ ۳۰۳)	ملک ساہن
(صفحہ ۳۰۶)	چو کھنڈی
(صفحہ ۳۱۰)	اے غریبانگن
(صفحہ ۳۱۱)	چون درمیان دائرہ وزیر و دائرہ بادشاہ ہرچ فرق لیست
(صفحہ ۳۲۳)	بالائے ہلنگ
(صفحہ ۳۳۳)	ملک مذکور را آکھامہ ہفایت خوش کرد
(صفحہ ۳۳۹)	گروڑات
(صفحہ ۳۳۹)	ٹٹ
(صفحہ ۳۳۹)	دھول
(صفحہ ۵۰۶)	کہت

’خرم گہ‘ اصل میں خرمگہ ہے جو بڑے خیمے کے معنی دیتا ہے۔ چونکہ خرم + گہ کی ترکیب سے ذم کا چلو بھی مترشح تھا، اس لیے سلطان ہد تغلق (۱۷۲۵ء و ۱۷۵۲ء) نے اس ترکیب میں اصلاح دے کر خرمگہ بنا لیا۔

’ہلنگ‘ اہل لغات کہتے ہیں ”چار پایہ چوبیس کہ براں نشیند و جنبند و بیشتر در ہندوستان متعارف است و میان آنرا بہ نوار بہ باند و ہمکم کنند۔“

’کھور‘ پرانے پر اطلاق ہوتا ہے۔ یہاں پرانی اینٹوں سے مقصد ہے جن کو پس کر چونے میں ملاتے تھے۔

’چندہ‘ صحیح فارسی لفظ چنیدہ ہے، یہ معنی منتطب و خاص، لیکن عوام اردو میں اب بھی چندہ بولتے ہیں۔
’کڑا‘، ’کڑا‘ اس کی تصغیر کڑاھی ہے۔

’مال‘ یہ معنی دولت۔ ہندوستان میں اس لفظ نے جدید معنی پیدا کر لیے یعنی ٹیس پکوان، اور مصنف نے انہی معنوں میں یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ اردو میں آج بھی یہی مفہوم موجود ہے۔
’ہنگ‘ مونگ۔

’گیل‘، گپلا، یعنی راستہ۔

’ڈاولہ‘ یعنی ڈول۔

’کمرک‘ ایک وزن کا نام ہے۔

’ادوتیاں‘ بہ حالت جمع قصہ خوان۔

’غیبانگان‘ بہ حالت جمع، غیبانہ اس کا واحد اور غیبانی مونث ہے۔ آخری شکل میں بہ لفظ آج بھی اردو میں مستعمل ہے۔ اہل لغت کا خیال ہے کہ غیبانی دراصل غائبانی ہے، یعنی ایسی عورت جو چھپ کر حرام کرائے۔ لیکن اس کے مذکر غیبانہ کی موجودگی میں یہ تشریح کمزور ہو جاتی ہے؛ شمس سراج کے ہاں بہ لفظ ایک معصوم گالی کے طور پر آیا ہے۔ شیخ ہاجن کی تصنیف میں بھی یہ ملتا ہے۔

’روزینہ‘ بہ معنی روزانہ استعمال ہوا ہے؛ عام اردو میں اب بھی روزانہ کی جگہ روزینہ بھی بولا جاتا ہے۔

’دائرہ‘ اس موقع پر خیمے اور فرودگاہ کے مفہوم میں لایا گیا ہے۔ بہ نئے معنی ہندوستان میں اس لفظ کو ملے ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ ڈیرہ بہ معنی خیمہ اسی کی ایک پکڑی شکل ہے۔

’ہنی‘ باغات کی پیدائش کا ایک بیانہ۔

’ہچی‘ کے واسطے کہا گیا ہے کہ سنسکرت لفظ ’ہکشن‘ سے ماخوذ ہے جس کے معنی مضبوط و مستحکم اور جمع ہونے کے ہیں۔ فارسی کا لفظ ہرجین بھی مفہوم ادا کرتا ہے؛ ”تحقیق آئست کہ ہرجین کردن بہ معنی محکم و استوار کردن است“ ہرجین کاری کے لیے لکھا ہے؛ ”انواع تلاشی کہ از سنگ ہارہا بر سنگ دہگر کنند آرا ہرجین کاری“

۱۔ مصنف کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے۔ یوں بھی دونوں لفظ باہم مترادف ہیں اور مردانہ بیشک یا چوپال کے معنوں میں مستعمل ہیں۔ عموماً پنجاب کے مشرقی اضلاع میں ’ڈیرہ‘ اور مغربی اضلاع میں ’دائرہ‘ مروج ہے۔ دونوں ہی ترکیبی حالت میں آبادیوں اور بستیوں کے ناموں کے لیے استعمال ہوئے ہیں، مثلاً ڈیرہ بابا تانک، دائرہ دیں پٹا وغیرہ (مہتاب)۔

گوہند۔ ” بھی کڑی بھی ہیں مفہوم ادا کرتا ہے۔ اس لیے گان غالب ہے کہہ ”بھی“ اور ”بھی کڑی“ فارسی ”ہر چین“ اور ”ہر چین کڑی“ کی ہکڑی شکل ہے۔

’قل‘ قال یعنی تالاب۔

’دھنڈ‘ ہائی کی تفرق جھیل یا بڑا تالاب۔

’دھنگانہ‘ یعنی دانگانہ۔ ایک قسم کا محصول جو اجناس ہری من

ایک دانگ کے حساب سے وصول کیا جاتا ہے۔

’سالیدہ‘ یعنی سالانہ۔

کتاب بازارہی

یہ تنجیم و تفلول و شگون پر ایک کتاب ہے جو ورہمیر روتیا داس برہمن کی سنسکرت کتاب ”ہری ہتہ سمپتہ“ کا ترجمہ ہے۔ دیباچے میں مترجم کا نام عبدالعزیز شمس سراج تھانہسری مؤلف تاریخ فیروز شاہی لکھا ہے۔ فیروز شاہ تغلق (متوفی ۷۹۷ھ) کو قلعہ کانگڑہ کی فتح کے وقت ایک کتاب خانہ ہاتھ لگا تھا؛ اس میں یہ کتاب بھی شامل تھی جو بادشاہ کے حکم سے ترجمہ ہوئی۔ مترجم نے سینکڑوں سنسکرت الفاظ استعمال کیے ہیں۔ میں نے ان سے قطع نظر کر کے بعض ہندی الفاظ کو لیا ہے جو اتفاقاً آ گئے ہیں۔ میرے پاس بازارہی کا ایک ناقص قلمی نسخہ ہے۔

سپینوں کے نام : جیت ، ہساکھ ، جیٹھ ، اسازھ ، ساون ، بہادون ، آسوج ، کولک ، منکسر ، بوس ، ساگھ ، بہاگن ۔
تہوں^۲ کے نام یوں دیے ہیں : بڑوا ، دوہج ، تیج ، چوتھ ،

۱۔ موجودہ صورت ڈھنڈ ہے جو مغربی پاکستان کے طول و عرض میں موجود ہے۔ وادی کاغان میں ’ماہی ڈھنڈ‘ اور سندھ میں ’لکھی ڈھنڈ‘ منجھر ڈھنڈ وغیرہ۔ غالباً سندھی صورت ’ڈنڈہ‘ ہے۔
(مرتب)

۲۔ تہ بمعنی قمری دن۔ (مرتب)

پنجپیں ، چھٹہ ، ستمیں ، آئسٹیں ، نویں ایکوسی ، ڈواؤسی ،
تروؤسی ، چتروسی ، ہونو ، اور دوسری قسم میں اماؤس ہے ۔

’الفاظ‘ : تیغ و کنارہ ، تہہ ، مندل ، پکھ ، یعنی گینہ ، تھیل یعنی
زمین ریگستان ، پوست درخت عایلہ و بیلہ کہ آئرا ہندوی گساہلہ
خواتند ۔ لشکریاں و سپہگاہاں ، جہگاہاں و بتالاں و کھتیریاں ۔ غلہ نخود و
سنگ و لوبیا و ماش و موٹہ ۔

مفرح القلوب

میں اس کی تاریخ تصنیف سے ناواقف ہوں ؛ صرف اسی قدر
معلوم ہے کہ کتاب ’عقیدہش‘ کا ترجمہ ہے ، جس کو
تاج الدین مفتی الملکی نے ملک الملوک الشرق و الغرب نصرة الدولة
والدين مطلع شہنشاہ کے حکم سے کیا ہے ۔ بعض الفاظ قدیم کی
موجودگی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب نویں صدی ہجری
میں کسی وقت لکھی گئی ہوگی ۔ مفرح القلوب میں گولہ و تنگ
کے الفاظ موجود ہیں ، اس وجہ سے شبہ کیا جا سکتا ہے کہ اس عہد
کے بعد لکھی گئی ہو ۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ آلات
آتش بازی اس عہد میں ہندوستان میں رائج ہو چکے تھے ، خصوصاً
دکن میں ۔ فرشتہ تاج الدین فیروز شاہ بہمنی (۵۸۰۰ و ۵۸۲۵)
کے عہد میں ان کا ذکر کرتا ہے ۔ فرہنگ شرفنامہ احمد شہری
میں جو باریک شاہ والی ہنگال (۵۸۶۸ و ۵۸۷۹) کے عہد کی تصنیف ہے ،
لفظ ’گشتگیر‘ کی تشریح گولے سے کی ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ
گولہ و تنگ کا استعمال اس قرن میں ہندوستان میں ہو رہا تھا ۔
مفرح القلوب میں ہندوستانی خیالات میں طرز تکلم کا اس قدر غلبہ ہے
کہ قدم قدم پر اس کی جھلک نظر آتی ہے ۔ یہ خصوصیت اس لیے
نہیں ہے کہ وہ ایک سنسکرت کتاب کا ترجمہ ہے یا یہ کہ اس میں
ہندوستانی طریق زندگی کا نقشہ ہے ، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ اس کا
ترجمہ کنندہ ایک ہندوستانی ہے جو ہندی زبان میں غور و فکر کرنے
کا عادی ہے ۔ الفاظ ذیل اس کتاب سے ماخوذ ہیں :

دوخت ہاکھر	(صفحہ ۲۵)	چوکی	(صفحہ ۵۷)
کھپ	(صفحہ ۷۳)	مراتبہ	(صفحہ ۵۷)
نہال گردیدن	(صفحہ ۹۲)	لنگوٹ	(صفحہ ۱۳۳)
کچھوندہ	(صفحہ ۱۳۳)	کاہل	(صفحہ ۱۸۹)
چنہر	(صفحہ ۱۹۳)	دیوہرہ	(صفحہ ۲۰۵)
دائرہ	(صفحہ ۲۰۵)	متحرک	(صفحہ ۲۱۳)
روزینہ و شبینہ	(صفحہ ۱۱۳ ، ۱۵۷)		

’کھپ‘ پیالہ و رکلی۔

’مراتبہ‘ پورا جملہ یوں ہے ”مراتبہ بادشاہی چھ نوع میں پایند“
 صحیح لفظ مرتبہ ہے یا یہ حالت جمع مراتب ، لیکن عوام الناس چہاں
 اور غلط الفاظ بولتے ہیں ، مراتبہ بھی بول جاتے ہیں ، مثلاً خدا تمہارا
 مراتبہ دوتا کرے ۔

’نہال گردیدن‘ اردو کے محاورے ’نہال ہونے‘ کا لفظی ترجمہ ہے
 جس سے مراد سر سبز ، کامران ، شاد کام اور فائز المرام ہونا ہے ۔
 ’کچھوندہ‘ یعنی کچھنہ ۔
 ’چنہر‘ چہتری ۔

’کاہل‘ عربی اور فارسی میں یہ معنی مستعمل ہے ،
 ہندوستان میں ڈیوہک اور بزدل کے معنوں میں آتا رہا ہے ۔ چنانچہ
 ’مفرح القلوب‘ کا یہ جملہ ”ہر کہ تاشنوا کلر کند و غصہ بسیار
 دارد و کاہل و ترسان و غافل و بد نشان و دروغی باشد۔“ (صفحہ ۱۸۹)
 ایک پرانی مثال ضیاء برنی کی تاریخ سے ملاحظہ ہو :

”و بجائے آئینہ دانایان و کوردانان غلام بچکان کاہل ہے سروہا و
 خواجہ سراہان ہے بیز را در آورد۔“ (صفحہ ۷۶)
 دکنی سے مثال :

تو ہم اک ہاک کو ماروں یہ دس مل
 ہموں کو کیا نہیں بوجھے ہو کاہل
 ’مؤید الفضلا‘ میں بد دل کی تشریح میں کاہل لکھا گیا ہے ۔

’متحرک‘ اس لفظ کا استعمال اس جملے میں ہوا ہے : ”اے خداوند
حرکہ سخن متحرک استوار دارد ہاں معاینہ کنند چنان چہ مثالی۔“
(صفحہ ۲۱۵)

یہاں متحرک دھوکے باز اور چال باز کے معنوں میں آیا ہے۔
یہ اسے معنی ہے جو صرف ہندوستان میں اس لفظ کو مانے ہیں۔
یہی حالت لفظ ’حرکت‘ کی ہے جس کے معنی اردو زبان میں چال،
دم اور جھانسی کے لیے جاتے ہیں لیکن ناظرین کو یہ سن کر تعجب
ہوگا کہ اب سے ساڑھے پان سو سال پیشتر بھی یہ لفظ بعینہ انہی
معنوں میں استعمال ہو رہا تھا۔ میں شمس سراج کی تاریخ فیروز شاہی
سے ایک مثال دیتا ہوں :

”باما آقلندران حرکت کردہ لشکر ماوا بہ تعبہ از درون حصار
بیرون آورد۔“ (صفحہ ۱۱۵ و ۱۱۶)

’شبیتہ‘ یعنی شبانہ اردو میں جہاں عوام الناس سالیٹہ اور روزیٹہ
بجائے سالانہ و روزانہ بول جاتے ہیں، شبیتہ بجائے شبانہ بھی
کہہ دیا کرتے ہیں۔

فارسی میں بعض الفاظ کے آخر میں ہائے زائدہ لانے کا دستور ہے ؛
ہندوستان میں اس ’ی‘ کا بہت رواج رہا ہے۔ پنجابی اور دکنی اردو
میں اس کی بہت مثالیں ملتی ہیں، لیکن ’مفرح القلوب‘ سے یہ مثالیں
ملاحظہ ہوں :

غروری بجائے غرور (صفحہ ۵)
منغسی بجائے منغس (صفحہ ۲۰۷)
قلبی بجائے قلب (تاسرہ) (صفحہ ۲۰۹)

ہائے قاعلیت کی مثالیں :

زحمتی (مریض) (صفحہ ۱۳) - دوشی (صفحہ ۱۸۹) - چہار ہائی (صفحہ ۱۳۷)
ہائی ہذا دانائی اور دشمنی کی جگہ دانائی اور دشمنائی لایا گیا ہے۔
(صفحہ ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۱۱۱، ۱۲۹ اور ۱۵۰) - اردو میں عوام آج

بھی دانائی اور دشمنائی بول جاتے ہیں۔ اردو میں فعل 'رہنا' کسی امر کی مداومت کے اظہار کے لیے خصوصیت کے ساتھ لایا جاتا ہے، جو کام فارسی میں 'می' یا 'ہمی' سے لیا جاتا ہے۔ مفرح القلوب اس خاص معاملے میں بالکل اردو کی تقلید کرتی ہے، مثلاً 'بے خبر افتادہ ماند' (صفحہ ۶۱) یعنی بے خبر پڑا رہا۔ 'ایستادہ شدہ ماند' (صفحہ ۳۸) کھڑا کا کھڑا رہا۔ 'خدمت گزری کردہ خواہم ماند' (صفحہ ۱۳۸) خدمت کرتا رہوں گا۔ 'نزدیک دیو ہرہ نشستہ میانہ' (صفحہ ۲۰۵) دیوہرے کے پاس بیٹھا رہتا۔ 'چرا از دیدن ما درون سوراخ شدہ ماندی' (صفحہ ۲۱)۔

فارسی زبان میں طریق تمدید کا استعمال کم ہے، برخلاف اس کے اردو میں بہت عام ہے۔ چنانچہ اردو کا اثر ہم اس عہد کے مصنفین میں بھی دیکھتے ہیں، مثلاً ضیا برنی :

'در خزائنا جاروب دھانید' (صفحہ ۴۱۸) گویا 'جھاڑو دلوا دی' کا ترجمہ کیا ہے۔ علیٰ ہذا 'خالے را کشانید' (صفحہ ۷۱۴) 'جاروب زناید' (صفحہ ۴۴۲)۔ و نام ایشان را از خطبہ دورکنانید و ایشان را متغلب گویانید' (صفحہ ۴۹۳)۔ 'خود را سلطان عہد خوانانیدے و سلطان عہد گویا نیدے' (صفحہ ۴۹۷)۔ کہ سالہا خود را ابو ہنگال میخوانا نیدند و مرد ہا میگوینا نیدند' (صفحہ ۵۹۳)۔

مفرح القلوب سے اس کی مثالیں :

'تفاوت کنانید' (صفحہ ۷۲) 'میان ایشان ہاری بود۔ عورتے زال جدائی کنانید'۔ (صفحہ ۹۶)

میں اس موقع پر اپنے مضمون سے گریز کر کے چند کلمے ایک ضروری امر کے متعلق کہنا چاہتا ہوں۔ ہمارے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں آ کر ایک دراز عرصے تک صرف فارسی زبان سے سروکار رکھا اور اس ملک کی کسی زبان سے کوئی تعلی پیدا نہیں کیا؛ برخلاف اس کے میرا خیال ہے کہ انہوں نے خواہ

اس وقت جب کہ غزنوی دور میں پنجاب میں مقیم تھے ، اور خواہ اس وقت جب کہ قطب الدین کے ساتھ جا کر دہلی میں آباد ہوئے ، اس ملک کی زبانوں میں برابر دل چسپی لی ہے ۔ نہ صرف یہ بلکہ ہندوستانی ماحول کے مطابق اپنے تمدن و زندگی میں ضروری تبدیلیاں بھی کر لی ہیں ۔

ان ایام میں سب سے زیادہ اقتدار عربی کو حاصل تھا ۔ وہ ان کی علمی و مذہبی و قانونی زبان تھی ۔ علما کے علاوہ طبقہ مشائخ میں بھی مقبول تھی ۔ یہ شیخ اپنے مریدوں کو خلافت نامے تک اس زبان میں دیتے تھے ۔ شیخ فرید الدین گنج شکر نے جو خط سلطان غیاث الدین بلبن کے نام لکھا ہے ، عربی میں تھا ۔ تمام کتبے مساجد و تہور و دیگر عمارات کے عربی میں ہوتے تھے ۔ ساتویں صدی ہجری بلکہ متتصف قرن ہشتم کے بعد تک یہی کیفیت رہی ۔ مسکوکات کی زبان عربی تھی یا سنسکرت ۔

فارسی کا درجہ دوسرے نمبر پر تھا ۔ یہ خیال کہ ہر شخص فارسی جانتا تھا ، قطعاً غلط ہے ۔ فارسی جاننے والوں کی تعداد فارسی نہ جاننے والوں کے مقابلے میں بہت کم تھی ۔ غلاموں کے زمانے میں مسلمان جماعت زیادہ تر ترک ، ایرانی ، خلج ، افغان ، ہندو اور ہندی مسلمانوں پر شامل تھی جن کی قومی زبانیں بالکل مختلف تھیں ۔ ان میں تعلیم یافتہ طبقے کی تعداد بہت محدود تھی ۔ دربار کے سوا فارسی زبان عوام الناس میں کم سمجھی جاتی تھی ۔ البتہ ایک بڑی جماعت اس کی تحصیل و تعلیم میں ہر وقت مصروف تھی ۔ شعر و تاریخ و سیر و تصوف و انشا کے لیے فارسی سے زیادہ کام لیا جاتا تھا ۔ انہوں نے صدی سے اس میں لڑھنگ نگار اور شرح نگار پیدا ہونے لگے ہیں ۔ مشائخ کی مجالس حال و قال میں جس طرح فارسی کی غزلیات پر لوگ سر دھتے تھے ، اسی طرح عربی کے قول اور ہندی لغات پر بھی وجد کرتے تھے ۔ مغلوں کے زمانے میں جو عروج فارسی زبان کو ہندوستان میں ملا ، اس سے قبل کبھی نصیب نہیں ہوا ۔

رہی ہندی زبان ، سلطان محمود نے لاہور میں جو سکھ چلا یا تھا ،

اس میں ایک طرف عربی اور ایک طرف سنسکرت تھی۔ محمود کے جانشینوں نے اس ملک میں جو سکے لگائے (یہ سکے چاندی اور تانبے کی آمیزش سے تیار ہوتے تھے) ان میں بالکل ہندی سکے کی طرز اختیار کر لی گئی تھی، یعنی ایک طرف گھوڑے کا - وارے اور دوسری طرف ہندی ییل کی تصویر ہے۔ ایک طرف 'سری ہمیر' (امیر) اور دوسری جانب 'سینتا دیو' یہ خط سنسکرت مرثوم ہے۔ غوریوں نے اپنے زمانے میں غزنویوں کی تقلید کی۔ معزالدین محمد بن سام (متوفی ۵۹۰ھ) کے مسکوکات پر کبھی 'سری ہمیر' ہے، کبھی 'سری محمد سام' (محمد بن سام) ہے، بلکہ ایک دہار پر ایک جانب لکشمی کی تصویر ہے اور ایک طرف 'سری محمد ون سام' (محمد بن سام) ہے۔

جب علاؤالدین محمد خوارزم شاہ (۵۹۷ھ) کا ہندوستان کے کچھ علاقے پر قبضہ ہوتا ہے تو وہ بھی غزنویوں اور غوریوں کی تقلید پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کے اکثر سکوں پر ہندی ییل کی تصویر ملتی ہے۔

شمس الدین التمشی (۶۳۳ھ) کے عہد میں ییل اور سوار کی تصویر کے سکے نہایت عام ہیں جن میں اس کا نام کبھی "سری سلطان شمس دژ" (شمس الدین)، کبھی "الشمس" (التمش) اور کبھی "سمیرل دیو" (شمس الدین) ہے اور دوسری طرف "سری کھلیہ" (خلیفہ) ہے۔ بعض پر "سری مستنصر" (مستنصر بالله، ۶۲۲ھ - ۶۲۳ھ) ہے۔ سنسکرت علاؤالدین محمد شاہ خلجی (۷۱۵ھ) کے آخر عہد تک سکوں پر برابر درج ہوتے رہے۔ نہ صرف سکوں میں انہوں نے ہندوستانی ماحول کا لحاظ کیا ہے بلکہ اور امور میں بھی، یعنی مالیات میں قدیم دستور کو ملحوظ رکھا۔ پٹواری، بلاھر اور چودھری یہ دستور رہے۔ دیہی حسابات کا پٹواری کی ہی پر دارومدار رہا۔ بیکہ، بسوہ، پیمایش میں من اور سیر اوزان میں جیتل اور تنگہ زر رائج میں قائم رہے۔ طرز زندگی میں ہندوستانی بن گئے! ہلنگوں اور کھانوں پر سونے لگے، ہان کھانے لگے، کھجڑی کے پت شائق تھے، عرسوں کے موقعوں پر لوہے کے کڑھاؤں میں کھانا پکاتے تھے، سلاطین اور شہزادگان کی وفات کے وقت ماتم داری کے ایام

میں زمین پر سوتے تھے^۱، جس سے محاورہ 'زمین خفتن' نکلا۔ خسرو :
وز زمین خفتن همه آفاق شد پہلو کبود۔

ہندی موسیقی کے ساتھ ابتدا ہی سے ان کو شغف رہا ہے۔
شیخ بہ الدین زکریا کی طرف ملتان ٹوڈی منسوب ہے۔ شیخ نظام الدین اولیا
(۷۲۳ھ) کو مولانا وجیہ الدین کی ہندی جگری پر حال آیا تھا۔
گوہال ٹاپک دکن سے علاء الدین خلجی کے دربار میں آتا ہے اور
اپنا کمال دکھاتا ہے۔ امیر خسرو اسی کے میدان میں اس کو شکست
دیتے ہیں۔

سلطان محمود کے زمانے سے ہندو فوجیں بھرتی کی جاتی تھیں۔
سلطان مسعود شہید کے عہد میں سندھ سپہ سالار کی وفات پر تلک کو
ہندو فوجوں کا افسر بنا دیا جاتا ہے اور نیالتگین والی ہندی
سرکوں کے لیے جس نے بغاوت کا اعلان کر دیا تھا، ہندوستان بھیجا
جاتا ہے۔ تلک نے نیالتگین کو شکست دے کر بغاوت کو فرو کیا۔
اسی عہد میں ایک فوج ہندوؤں کی کرمان میں متعین کی جاتی ہے۔
عین گھمسان کی جنگ میں یہ لوگ ہشت دکھاتے ہیں اور غزنویوں
کو شکست ہو جاتی ہے۔ سلطان ان مفرورین کے پیشواؤں کو
بلواتا ہے اور اس بزدلی کا باعث دریافت کرتا ہے۔ ان سرداروں
میں سے چھ شخص کٹار کھا کر اپنے آپ کو ہلاک کر دیتے ہیں۔
سلطان مسعود کو اس حادثے کی اطلاع پہنچتی ہے اور وہ جھنجھلا کر
کہتا ہے :

”این کتارہ بکرمات یا یست زد۔“ (تاریخ وحقی صفحہ ۵۳۸)

غلاموں کے زمانے میں بھی اسلامی فوجوں کے ساتھ ہندو شامل
ہوتے تھے۔ ان میں راوت (راچپوت) دھانک (نیر انداز) ہاپک (پاندے)
جنگ میں حصہ لیتے تھے۔ کھار اور کھواری باربرداری کے کام میں

۱ - دیکھو برنی، صفحہ ۱۲۳

۲ - سیرالاولیا، صفحہ ۵۱۲۔

مصروف تھے۔ دھاوے ڈاک کا کام کرتے تھے۔ دھکڑوں کے سپرد کچھ اور خدشات تھیں۔ باہلی فیروز شاہ تغلق کے عہد میں شکر میں امداد دیتے تھے۔ ملک چھجو والی اودھ کی فوج جس نے جلال الدین فیروز شاہ خلجی کے مقابلے میں اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا تھا، زیادہ تر ہندوؤں سے بھری گئی تھی۔

ہندو طبیب بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور مسلمان مریض ہلا تکاف ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ غیاث الدین خلجی کے ذکر میں ہندو اطباء کے واسطے یہ جملہ لکھتا ہے :

”ونا گراہا و پرہیا و جاتیاں در شہر طبیبان معروف و مشہور بودند و مبارکہ تھے (چوں) کہ چندر طبیب و مہرک مرضی ہندو جا جا جراح در ہندوستان نبودند و نباشد کہ در نظر اول مرض را در پادہ و بہ علاج و تداوی دفع (ند) کنند۔“
(صفحہ ۳۶۳، تاریخ فیروز شاہی)

جوتشی بھی علوی حقائق سے حد مبالغہ نہیں؛ عوام تو در کنار مسلمانوں تک ان کی قدر کرتے تھے۔ مؤرخ موصوف ان ہندو نجومیوں کے متعلق کہتا ہے :

”و بنایان کہ از ہمہ درین علم بیشتر بودند چندان صدقات از سلطان علاؤالدین و از حرم او می یافتند کہ اینان را ازان اسباب ہا می شد و در شہر از مسلمانان و ہندوان منجم بسیار بودند۔“
(صفحہ ۳۶۳، فیروز شاہی)

مسلمانوں کے پورے پورے ہندی بن جانے کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت درکار ہے کہ وہ اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر کرتے تھے۔ اسیر خسرو :

ترک ہندستانم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری ندادم کز عرب گویم سخن

انہوں نے ہندی نام اور عرف تک اختیار کر لیے تھے، مثلاً ملک چھجو غیاث الدین بلبن (متوفی ۸۶۸۹ء) کا بھتیجا تھا۔

ملک جوان بن محمد بن تغلق (۷۷۵ھ) کام نام تھا۔ اسی طرح ملک بیٹا خازن ، ملک مقبول عرف ثوروا پاند ، ملک فخرالدین کھنڈ ، ملک رکن الدین انبہ ، ملک عرف مار ، علاء الدین کڑک ، پیرا مالی ، شیخ بابو تاپک چہ ، لداہا باغبان ، سنگا طبخ ، اختیارالدین مدھو ، تنھو سولہل ، حسام الٹھنگ شیخ بوہن ، مولانا شہاب الدین کدھوری ، خواجہ لطیف الدین کھنڈیالی ، محمود پلوہ ، عبدالحق عرف جاجر سوندھار ، ملک ساہن ، مردوں کے ، اور لادی ، کرنا اور بی بی رانی عورتوں کے نام تھے ۔

یہی اصول پیشہ وروں ، عہدہ داروں اور عازات وغیرہ کے ناموں میں بھی کام کر رہا ہے ۔ مثلاً راوت عرض اور بہاد دار ۔ امیر خسرو کے نانا راوت عرض تھے ۔ محل داکھ اور محل چھجہ چوبیس ، کوشک ، سہندواڑی اور کوشک سالورہ ۔ بگنی گہر ، طاس گھڑیال ، گھڑیال خانہ ، حوض رانی ، چندو گہر ، بند سالورہ ، بند مالجہ ، چوٹرہ سبجانی ، چوٹرہ ناصری وغیرہ ہندی فارسی آمیز نام ہیں ۔

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ بالکل ہندوستانی بن گئے تھے اور ہندی زبان ان میں رچ گئی تھی ۔ وہ بھی زبان بولتے تھے ، اسی میں سوچتے تھے اور جب فارسی لکھتے بیٹھتے تو نادانستہ ہندی محاورے اور ضرب الامثال ان کے قلم سے ٹپک پڑتے تھے ۔

ناظرین کو علم ہو گا کہ امیر خسرو پر اعتراض ہونے میں کہ وہ فارسی میں ہندی محاورات کا استعمال کر جاتے ہیں ۔ مولانا شبلی نے ذیل کے محاورے ، جو قابل اعتراض ٹھہرے ہیں ، اپنی تصنیف ’شعر العجم‘ میں غالباً شروع الشعرا سے نقل کیے ہیں :

آواز کردن ، گفتار میگویم ، مالا کلام کردن ، زگرہ او چہ می رود ،

ان آیات میں یہ محاورے آئے ہیں :

(۱) سالہا شد کہ نیام خبرو فر کویت

دل ویران شدہ را آیم و آواز کم

(۲) من از سر زندہ کردم کر تو یارا یک سخن گوئی

سو میدانم نہ کوئی لیک من گفتار میگویم

- (۴) دعوایِ خدوں بجائے دل غویں می کم
 یک بوسہ ہا لیم زن و مالا کلام کن
- (۵) جان میرود ز من چو گرمیزند بہ زلف
 مردن مراست از گرہ او چہ میرود
- راقم کا خیال ہے کہ 'آواز گردن' پر اعتراض حق بجانب نہیں۔
 ذیل کے شعر ملاحظہ ہوں :

صائب

خضر در بادیدۂ شوق ز ہمراہی من
 آنقدر دور بماند است کہ آواز کم

سلیح

بے تکلف من کیجئے ہمہ بزم او سلیم
 سرمۂ چشم پر افشون مرا آواز کرد

(بہار عجم)

'از گرہ او چہ میرود' یہ ظاہر "اس کی گائیکہ سے کیا جاتا ہے" کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ وارستہ اور خان آرزو اس کو ترجمہ سالتے ہیں لیکن صاحب 'بہار عجم' اختلاف کرتے ہیں اور صائب کا شعر ذیل نقل کرتے ہیں :

خون میچکد ز غنچۂ منقار بلبلان
 زہی نقد تازہ گز گرہ روزگار رفت

صائب کے ہاں اس میں شک نہیں محاورے کی صورت کسی قلم بدل ہوئی ہے۔ میرزا غالب کا یہ شعر بھی یاد رہے :

گوئی مہساد دوشکین طرہ خدوں شود
 دل زان تست از گرہ ما چہ میرود

'مالا کلام کرنا' کسی سودے یا معاملے کے انقطاع و فیصلے کے لیے راقم نے جسے پور میں بولتے سنا ہے۔ گفتار میگویم، بات کہتا ہوں کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ امیر خسرو کے ہاں اور اسے محاورے
ہیں جن کو ہندوستان کا پر نو مانا جا سکتا ہے ، مثلاً :
'نیشکر با دل خوردن' ہانہوں کے ساتھ گئے کھانے کا ترجمہ
معلوم ہوتا ہے :

نشاہ نیشکر با پسِل خوردن
نہ درنگ با صبا تعجیل کردن

(خضر خانی ، صفحہ ۳۰۰)

شعر آئندہ میں 'دندان در شکم خوردن' اس کے بیٹے میں دانت ہیں یا
اس کے بیٹے میں ڈاڑھی ہے کا ترجمہ ہے :

چون تیر بدان راست دلش را زیراک
چون خرپزہ دندانش درون شکم است

چہ بنی چرخ را زانگونه خندان
نگہ کن در شکم چہ است دندان

'سب کو ایک لاناہی ہانکنا' اردو کا محاورہ ہے ، امیر بعینہ اس کا
لفظی ترجمہ "ہیک چوب ہمہ را راندن" کرتے ہیں :

رباعی

خسرو ز زبان تبت گوہر ہمہ را
چندا ز نہان تبت جوہر ہمہ را
شد رانندہ ستان و تیغ و تیر از کلکت
زین گونه بیک چوب سراں ہر ہمہ را

(غرۃ الکمال)

شعر آئندہ میں 'ان تلون میں ٹیل نہیں' کا ترجمہ ہے :

خالے بہ رختی دیدم و گفتم کہ تسل است
گفتا کہہ پسو نیست درین تسل نیلے

غصہ عربی اور فارسی میں اندوہ گلوگیر اور اندوہ کے لیے استعمال

ہوتا ہے ؛ اردو میں یہ لفظ بالمعوم خشم اور طیش کے مفہوم میں لایا جاتا ہے ؛ امیر خسرو بھی انہی معنوں میں لائے ہیں :

شد اندر غصہ شادی خان والا
مدد جست از پلساء حق تعالیٰ

(صفحہ ۲۷۶ ، خضر خانی)

ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے مصنفین بھی یہی معنی لیتے ہیں ، مثلاً ضیاء برنی انہی تارچ میں :

”و اگر تو غصہ خواہی کرد ۔“

”و دران ایام غصہ سلطان مجد برخاستی بیشتر بود ۔“ (صفحہ ۵۱۳)

فرہنگ بحرالقضایل میں بھی غصہ یہ معنی غضب دکھایا گیا ہے ۔ مفرح القلوب سے دو مثالیں عرض ہیں :

”دو غصہ خود را نسوزد“ ۔

”چون بگفتار وزیر غصہ پادشاہ فروشت“ ۔ (صفحہ ۱۶۷)

ہندوستان میں یہ معنی اس قدر عام رہے ہیں کہ لٹریچر بھی نہیں بچ سکا ۔

نرو میخورم غصہ سینہ در

امیر خسرو کے کلام میں اگر باقاعدہ تلاش کی جائے تو مجھ کو یقین ہے کہ ایسی اور مثالیں دستیاب ہوں گی جن میں ہندی الفاظ اور محاورے استعمال ہوئے ہیں ۔ ان کی مثنوی مفتاح الفتوح سے ایک شعر نقل کیا جاتا ہے جس میں ’مار مار‘ استعمال ہوا ہے :

ز تیرکن تیر زہر آلود میخورد

چندی مار مار آغاز میکرد

’مار مار‘ یہ معنی سمی بیہم ہم اس سے پہلے بھی دیکھ چکے ہیں جو ’خزائن الفتوح‘ میں آیا ہے ۔

ضیاء برنی کے ہاں بھی ہندوستان کا اثر موجود ہے ۔ اردو کا ایک

مجاورہ ہے 'چراغ لے کے ڈھونڈنا' ، برنی نے اس کو یوں لکھا ہے :

"مغل را چراغ بر کمره طلب کردے۔" (صفحہ ۳۴۳)

"ابن روز چراغ بر کمره میطلبیدند۔" (صفحہ ۱۵۰)

چراغ بر کردن ، یہ معنی روشن کردن چراغ ۔

'بیڑہ الٹانا' ایک اور مجاورہ ہے جس کے معنی فارسی میں یوں بیان ہوئے ہیں :

"در زمان ساجی در سلاطین هند رسم بود کہ پیش اسرا

برائے انصرام رسانیدن مہم بیڑہاں می انداختند ، کسیکہ آئر

برداشتے انصرام آن مہم ہنمہ او واجب شدے" (حیث)

اب ضیا، برقع میں مجاورہ اپنی تاریخ میں لاتا ہے :

"راوتان و ہایکان معروف از ملک چہجو بیڑہ قبول گرفتہ بودند و

دعویٰ کردے۔" (صفحہ ۱۸۲)

"و بیڑہ جانیازی از پیش الیاس بھنگی میگرفتند۔" (صفحہ ۵۹۳)

امیر خسرو کے بیان سے اس قدر اور معلوم ہوتا ہے کہ بیڑے کی

رسم ان ایام میں قبل از جنگ عمل میں آتی تھی اور بیڑہ تمام لشکر کو

ملتا تھا تا کہ جنگ کے وقت وفادار رہے ۔

"بستان رنگین فرایش دادند کہ راوتان را بیڑہ قبول باید داد

تا جان سپاری کنند ۔ باشاوت رائے ہمہ برگستوان و ہایک قبول شدند۔"

(صفحہ ۱۹۰ ، خزائن الفتوح)

'اندز اندر گھٹنا' اردو روزمرہ ہے ؛ برنی لکھتا ہے :

"و درون درون میکا ہیدار۔" (صفحہ ۳۰۳)

'خالہ کا گھر' ایک اور مجاورہ ہے ؛ برنی کہتا ہے :

"چنان کہ خوردگان نازنین در خانہ خالکان میان روند۔"

(صفحہ ۳۱۳)

’اللہ آمین‘ ایک اور محاورہ ہے ؛ بری کہتا ہے :

”و آنکہ مثل زند آمین اللہ آمین کنان در منزل اول رسیدند۔“
(صفحہ ۵۳۵)

اردو میں چکر آنا بولتے ہیں ؛ بری نے ’دوران آمان‘ لکھا ہے :

”و ملک را از نظارۂ چنان نگارے دوران سے آمد۔“ (صفحہ ۵۵۷)

’انگشت در دھان انداختن‘ رحم اور امان کی درخواست کرنے کے

معنوں میں فارسی محاورہ نہیں ہے ؛ لیکن بری لکھتا ہے :

”هر دو انگشت در دھان می انداختند۔“ (صفحہ ۵۹۳)

میں خیال کرتا ہوں کہ یہ کوئی ہندی محاورہ ہے ؛ فارسی میں

اس کے قریب ’انگشت آمان‘ اور ’انگشت زینہار‘ ہے ۔

”اشتر دزدیدن و کوز وقتن راست نیابد۔“ (صفحہ ۲۵۷)

بری کے ہاں یہ ضرب المثل بھی ہندی الاصل معلوم ہوتی ہے ۔

شمس سراج غنیف کے ہاں بھی ہندوستانی اثر موجود ہے ؛ مثلاً

اردو محاورہ ’بہی کرہ سے خرچ کرنا‘ اس نے یوں ادا کیا ہے :

”خرج و اخراجات از گرہ خویش میگردند۔“ (صفحہ ۵۹)

چپکے چپکے کا ترجمہ ”خواجہ جہان بٹہاں پٹہاں در خاطر خویش“ کیا ہے

(صفحہ ۶۷) ۔ ایک لفظ کی تکرار سے فارسی میں کثرت معلوم ہوتی ہے

اور اردو میں محاورہ ہے ۔ ہاں دہنے کا ترجمہ اس کے ہاں ”برگ دادے“

(صفحہ ۱۰۱) ہے ۔ بارہ بارٹ ہونا مختلف الرائے یا منتشر یا براگندہ ہونے

کے لیے آتا ہے ؛ شمس سراج کسی قدر اختلاف سے لکھتا ہے :

”خلائی دہلی رفت رہ شد۔“ (صفحہ ۱۸۵ ، ۳۰۶ ، ۳۲۷)

’ناک میں دم آنا‘ اردو کے ساتھ مخصوص ہے ؛ مگر شمس سراج

لکھتا ہے :

”جان ایشان بہ بینی رسیدند۔“ (صفحہ ۲۲۶)

اور امیر خسرو فرماتے ہیں :

نا تو از چشم لطف در بینی جان مردم رسیده در بینی
 ”ہمایو بسیار در حضرت بیاورد“ (صفحہ ۲۹۹ میں ہمایو کی تکرار
 ہندوستان کا پرتو ہے۔ ذرہ بھر یا ’ذره برابر‘ اردو میں وات دن بولا جاتا
 ہے ؟ شمس سراج لکھتا ہے :

”ذره میل خم نہاد“ (صفحہ ۳۱۲، ۳۳۸)

’کسی کی ہائے لینا‘ اردو ہے۔ شمس سراج کے ہاں اس کا ترجمہ
 بھی موجود ہے : ”آہ دل او کہہ ہستاند“ (صفحہ ۵۱۳) اسی طرح
 ’سختی پر سختی کرنا‘ کا ترجمہ اس کے ہاں ’تفتی پر تفتی کر دے‘ ہے۔
 (صفحہ ۳۹۷)۔ ’پگڑی اتارنا‘ اردو میں کسی کی بے عزتی کرنے کے
 مرادف ہے ؟ یہی مفہوم شمس سراج کے ہاں بھی موجود ہے :

”جوں پگ از سر فرود آوردند چہ حرمت ماند“ (صفحہ ۳۳۳)
 مفرح القلوب میں ہندوستانی محاورے اور ضرب الامثال بہ کثرت
 ہیں ؟ میں بعض یہاں درج کرتا ہوں :

”آن کی خوشی اس میں ہے“ اس مطلب کو فارسی میں یوں
 ادا کیا ہے : ”خوشی ایشان ہر بست“ (صفحہ ۹)

’خوش ہوئے‘ کا یوں ترجمہ ہوا ہے ”پیریل از گفتار زن
 خوش شد۔“ (صفحہ ۱۸۰)

’کانوں پر ہاتھ دھرنا‘ : ”گریہ ہر دو دست خویش بر گوش نہاد۔“
 (صفحہ ۳۲)

’جان ہے تو جہان ہے‘ : ”اول جان بعدہ جہان۔“ (صفحہ ۲۲)
 ’آدھی کو چھوڑ ساری کے پیچھے دوڑنا‘ : ”نیم نان گزاشتہ
 برائے تمام نان برود۔“ (صفحہ ۷۱)

’نیم الامثال میں یہی مثال یوں دی گئی ہے :

”آدھی کو چھوڑ ساری کو دھائے، آدھی رہے نہ سارے ہائے۔“

(صفحہ ۱۶)

اس طرح ایک اور ضرب المثل ہے :

’پور کی ماں کوٹھی میں سر دے کر روئے‘ (نجم الاسفال - صفحہ ۱۵۲)

مفرح القلوب میں اس کو ہوں ادا کیا گیا ہے - ”مادر دزد سرور گندو انداختہ گریہ میکند -“ (صفحہ ۱۰۵)

’تسموں سے کھمال ادھیڑا‘ اردو کا روز مرہ ہے لیکن مفرح القلوب ”ہست شا از دوال خواہم کشید -“ (صفحہ ۱۲۶)

مگر سب سے عجیب ترجمہ الیون اتر جانے کا کیا گیا ہے یعنی ”جون الیون فرود آمدے -“ (صفحہ ۱۲۶)

اسی طرح اور روزمرے میں ، مثلاً ”از من چہ خواہد گرفت -“ (صفحہ ۱۰۳) یعنی میرا کیا پکڑے گا یا مجھ سے کیا لے گا - ”اگر خیریت خود میخواہی“ (صفحہ ۱۳۶) ”اگر اپنی خیریت چاہئے ہو“ کا ترجمہ ہے - ”این اندک لطف کہ جان مرا گزاشته -“ (صفحہ ۱۶۸) یعنی یہ کیا تھوڑی سہراںی ہے کہ میری جان چھوڑ دی (بچا دی) - ”این بخت من کشادہ“ (صفحہ ۲۱۹) یعنی میرا نصیب کھل گیا - اور ”ز نار داوان گریختہ کہ موازنہ دوازده کروزہ صیاح شد -“ (صفحہ ۱۸۷) یعنی ہر مین ایسے بھاگے کہ بارہ کوس پر جا کر صبح ہوئی -

’موت ہونا‘ اردو ہے لیکن تاج الدین فرماتے ہیں :

”وقت برآیدن آفتاب موت وے خواہد شد -“ (صفحہ ۱۷۹) اور

چھینٹ چھینٹ کر دینے کے واسطے لکھا ہے :

”بار وا چنداں قطره قطره کرد -“ (صفحہ ۱۷۸ ، ۲۰۲ ، ۲۲۳) -

ایک اور ہندی ضرب المثل جس کا مفہوم ہے ”ٹولی رسی جوڑ لی گره تو باقی رہی“ مصنف نے اس طرح بیان کی ہے : ”اگر رسن شکستہ شود کسے پیوند کند ، گره از میان فرود -“ (صفحہ ۱۲۹)

تاج الدین مفتی المالکی کی اس فارسی استعداد پر میں جانتا ہوں

کہ فارسی خوان ناک بھوں پڑھائیں گے، لیکن یہ اغلاط صرفی یا نحوی نو ہیں نہیں بلکہ روزمرہ اور محاورے سے تعلق رکھتی ہیں اور ظاہر ہے کہ ایک شعلیں جو عمر بھر ہندی بولتا رہا ہے اور اٹھتے بیٹھتے اسی میں سوچتا اور فکر کرتا ہے، فارسی لکھنے وقت اس کی اپنی زبان کے محاوروں اور طرز بیان کا قلم سے مترشح ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ فارسی میں اگرچہ اس تالیف کو کوئی رتبہ نہیں دیا جاسکتا؛ اس کے اکثر جملے اور فقرے اہل زبان کے نزدیک سہل ہیں؛ مثلاً 'ایون فرود آمدن' اور 'ہر دو دست خویش برگوش نہادن' ان کی نگاہ میں بالکل بے معنی ہیں، مگر ادھر ایک اردو خوان ان سب محاوروں کو سمجھتا ہے، کیونکہ وہ رات دن ان کو بولتا اور سنتا رہتا ہے، اس لیے اردو کی قدامت کے متلاشی کے لیے یہ کتاب نہایت بیش قیمت ہے، کیوں کہ اس کے ذریعے سے ہمیں اس عہد کی اردو زبان کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اردو ان ایام میں محاوروں، روزمروں اور ضرب الامثال سے مالا مال ہے اور یہ خصوصیات ایک زبان میں اسی وقت پیدا ہوں گی جب کہ وہ عہد طفولیت کو خیر باد کہہ کر مدراج شعوری تک اڑتا کر چکی ہو اور ایک حالت پر قائم ہو گئی ہو۔ مفرح القلوب یہ ظاہر حالات بہار میں لکھی گئی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ اردو اس عہد میں دور دور تک پھیل چکی تھی۔

شمس سراج عظیم اور ضیاء برنی فارسی میں اعلیٰ قابلیت کے مالک ہیں۔ اس زبان کے ساتھ ان کی مزاولت یہ منزلہ طبیعت ثانیہ کے ہے اور امیر خسرو کو تو خود اہل زبان تسلیم کر چکے ہیں اساتذہ کی صف اول میں ان کا شمار ہوتا ہے؛ تاہم دیکھا جاتا ہے کہ اردو کا اثر ان بزرگوں کی تالیفات میں نمایاں ہے۔ 'ناک میں دم آنا'، 'جراغ لے کر ڈھونڈنا'، 'خالہ کا گھر'، 'ہاتھیوں کے ساتھ گئے کھانا'، 'سب کو ایک لالھی مانگنا' 'بیڑہ اٹھانا'، اور 'ان تلوں میں تیل نہیں' وغیرہ کے استعمال سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بزرگ اس زبان سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔

امیر خسرو کے بعض اشاروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس زبان سے بہت محبت تھی : 'قرآن السعیدین' میں فرماتے ہیں : ع

طرفہ بسود تیزی ہندی زبان (صفحہ ۵۰)

اور غرۃ الکمال کے دیبچا ہے میں : ع

چو من طوطی ہندم از راست برسی

ز من ہندوی برس تا نغز گویم

الفرض و ثبوت کے ساتھ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس عہد میں مسلمان جماعت کی زبان قطعاً بدل چکی تھی اور وہ اپنے گھروں میں ہندی (اودو) بول رہے تھے۔ اس زبان کا اقتدار اس حد تک قائم ہو چکا تھا کہ عوام الناس دو کتار امرا و شرفا تک کے نام و عرف ہندی ہونے لگے تھے۔ ملک چھجوا ، ملک چونا ، ملک ہرن مار ، ملک پٹھا ، ملک فخر الدین کھٹ ، ملک رکن الدین ابہ اس زمانے کے امرا کے نام ہیں ، اور لادی ، کرنا ، اور بیدی رانی عورتوں کے نام ہیں۔ ملکی عہدے اور سلاطین کے محل بھی ہندی ناموں سے بتکارے جاتے تھے۔

زبانوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ غیر زبانوں کے الفاظ لیے کر ان کی شکل یا معنی میں تصرف کر لیا کرتی ہیں ، چنانچہ اودو نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ الفاظ ذیل ملاحظہ ہوں :

شعہ (بہ معنی خشم و غضب) ، مال (نقیس کھانا) ، حرکت

(فریب ، دم ، جھانسد) ، متحرک (چالباز ، دم باز) ، غوشی (مرضی اور

۱۔ ہندوستان میں دستور ہے کہ جب کسی خاندان میں اولاد

نویشتہ نہیں رہتی اور بے در پے بچے ضائع ہو جاتے ہیں تو والدین اپنے نوذائیدہ بچے کو چھاج یا ٹوکری میں رکھوا کر مسجد میں بھجوا دیتے ہیں جہاں اسے صحن مسجد میں گھسیٹا جاتا ہے۔ اسے مولود کا نام گھسیٹا ، گھسا ، سٹنا وغیرہ رکھ دیا جاتا ہے۔ چھجو بھی اسی قسم کا نام ہے۔ اس سے مراد ایسا مولود ہے جسے چھاج میں ڈال کر گھسیٹا گیا ہو۔

منیلا ، عورت (بیوی) ، کاحل (بزدل و ترسان) ، خوش (شاد و خرم) ،
مراتبہ (مرتبہ) ، دائرہ (خمیدہ) ، ڈیرہ (خمیدہ) ۔

دھنگانہ	بجائے	دانکالہ	،	دشمنایکی	بجائے	دشمنی
دامایکی	،	داناں	،	روژینہ	،	روزانہ
سالینہ	،	سالانہ	،	شبینہ	،	شیانہ
غروری	،	غرور	،	نموداری	،	نمود
ڈقالی یا فدالی	،	دقالی	،	پلینہ	،	فلینہ
صیل	،	قصیل	،	نقارا یا نگارا	،	نقارہ
چنندہ	،	چیندہ یا چنیدہ	،	ڈرا	،	ڈرہ
اور غیبانہ	،	غائبانہ				

یہ الفاظ اب سے پانسو چھ سو سال پیشتر اسی غلط انداز میں
بولے جا رہے تھے جیسے آج بولے جاتے ہیں ۔ یہ واقعہ ان ایام میں
اردو کی ایک حالت پر قائم ہو جانے کا بین ثبوت ہے ۔

پہاں ناظرین کی توجہ ان بعض الفاظ کی طرف بھی منعطف کرائی
جاتی ہے جو امیر خسرو اور ضیا برنی کے ہاں پنجابی لہجے میں لکھے
ہوئے ملتے ہیں ۔ مسلمانوں کو ہندوستان میں سب سے پیشتر تین زبانوں
سے سابقہ پڑا ہے : سندھ میں سندھی ہے ، پنجاب میں پنجابی ہے
اور دہلی میں دہلی کے علاقے کی زبان ہے ۔ اردو پر سندھی کا اثر
مطلقاً نہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زبان اس وقت تک وجود
ہی میں نہ آئی تھی ۔ غزنوی دور میں مسلمان پنجاب کے مختلف

۱۔ فاضل مصنف کی رائے محل تامل ہے ۔ اردو پر سندھی کا لسانی اثر ،
خواہ کتنا ہی غنیف کیوں نہ ہو ، موجود ضرور ہے ۔ اردو میں
بعض ایسے الفاظ مستعمل ہیں جن کے بنیادی لفظ سندھی کے سوا اور
کہیں نظر نہیں آتے ۔ مثال کے طور پر گنتی میں باوہ ، یس ، ہانسی ،
تہی ، بیالیس ، باون ، پانسو ، چتر ، بیاسی ، ہانوے میں سابقہ 'ہا' یا
'بہ' اردو کے 'دو' سے ، جو فارسی سے مستعار ہے ، کوئی تعلق
نہیں رکھتا ، لیکن سندھی میں 'دو' کے لیے (باقی حاشیہ صفحہ ۹۸ پر)

شہروں میں آباد ہو جاتے ہیں اور قریباً دو سو برس تک یہاں مقیم رہتے ہیں۔ اس کے بعد معزالدین محمد بن سام (۵۶۰ء) اور قطب الدین ایبک (۵۶۰ء) اپنی متواتر فتوحات سے ہندوستان خاص فتح کر لیتے ہیں اور شہر دہلی جدید مفتوحہ ملک کا دارالسلطنت بن جاتا ہے۔ اس واقعے سے ایک صدی بعد ہم دیکھتے ہیں کہ دہلی کے یہ آبادکار جو شمال سے آئے تھے، اپنی گفتگو میں بہت سے ایسے الفاظ بولتے ہیں جو خاص پنجاب کے لہجے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن بیشتر اس کے کہ میں ان الفاظ کی فہرست حوالہ قلم کروں، مجھ کو ایک قاعدہ کلیہ بیان کر دینا چاہیے جو پنجابی اور ہندوستانی الفاظ کی شناخت کی تعیین کرتا ہے۔ وہ قاعدہ یہ ہے کہ پنجاب میں ایسے الفاظ جن میں ہندوستان کی زبان میں ثانی حرف علت واقع ہو، ان کے حرف علت کو اس کے مناسب اعراب سے بدل کر حرف مابعد کو مشدد کر دیتے ہیں، مثلاً ساکھن، پھول اور کھچڑی پنجابی لہجے میں مکھن، پھل اور کھچڑی بن جاتے ہیں۔ اس قاعدے کو پیش نظر رکھ کر جب ہم امیر خسرو اور ذیابری کی فہرست الفاظ پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو متعدد پنجابی الفاظ ہماری نگاہ سے گزرتے ہیں، مثلاً پک، لک، پھنگ، کھٹی، کھنڈ، بھنڈ، انہ، بھٹائی، جموں، مٹہ، ہلنت، مٹکا، لدھا، مٹک، کھت، تل، ٹٹ۔ ان پر دو اور پنجابی لفظوں کا اضافہ کیا جاتا ہے یعنی تلونڈی اور دھنڈ۔ آٹھویں صدی کے اختتام تک یہ الفاظ دہلی اور اس کے علاقے میں پنجابی لہجے میں بولے جاتے رہے، بعد میں اس

(صفحہ ۹۷ کا باقی حاشیہ) لفظ 'بہ' آج بھی مستعمل ہے۔ کم از کم بلتائی، پنجابی اور اردو کی حد تک اسے سندھی اثر کہا جاسکتا ہے۔ اردو کا ایک لفظ 'پڑوسی' یعنی محلے دار ہے، اس کا بنیادی لفظ 'پاڑا' بہ معنی 'محلہ' سندھی میں موجود ہے۔ اردو میں 'پاڑا' ترکیبی حالت میں محلوں کے ناموں کے لیے بھی کلم آتا رہا ہے، مثلاً 'گھوسی پاڑا' یعنی گوجروں کا محلہ وغیرہ۔ (مرتب)۔

علاقے کی زبان کے اثرات میں مقامی لہجہ غالب آ گیا ؛ چنانچہ اب ہاگ ، لاکھ ، بھنگ ، کھاٹی ، کھاٹ ، بھانڈ ، بھانڈ ، آم ، بھنڈی ، جاموں ، ماٹ ، بالشت ، مانگا (مانگیا) ، لادھا (لادھیا) ، مونگ ، کھاٹ ، تال اور ٹاٹ بولتے ہیں ۔ 'توتوڈی' اور 'دھنڈ' اردو کے دائرے سے بالکل خارج ہو چکے ہیں ؛ اگرچہ پنجاب میں آج بھی بولے جاتے ہیں ۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ مسلمان دہلی میں آباد ہونے وقت کوئی نہ کوئی زبان پنجاب سے اپنے ساتھ لے کر گئے ہیں ؛ جو دہلی کی زبان کے ساتھ مل کر اردو کی شکل میں ظہور پزیر ہوئی ۔ یہ احتمال کہ دہلی میں دونوں قسم کے لہجوں کا رواج تھا ، یعنی لوگ بھانڈ بولتے تھے اور بھنڈ بھی ، کھاٹ بولتے تھے اور کھنڈ بھی ، آتب بولتے تھے اور انب بھی ، واقعت معلومہ کی روشنی میں بے بنیاد ٹھہرتا ہے ۔ امیر خسرو ، ضیا برنی اور سیدہ کرمانی ایک ہی قسم کا لہجہ اختیار کیے ہوئے ہیں ۔ مثلاً ان کے ہاں الفاظ لک ، پگ اور کھٹ بار بار ملتے ہیں اور ہر بار اسی شکل سے لکھے جاتے ہیں ۔ لاکھ ، ہاگ اور کھاٹ بدول کر بھی ان کے قلم سے نہیں نکلتے ۔

غزنوی دور میں قیام پنجاب کے وقت مسلمانوں کا پنجابی زبان سے تعلق میں آنا ایک لازمی امر ہے ۔ خواجہ مسعود سعد سلمان کو ہندی کا پہلا صاحب دیوان مانا جاتا ہے ۔ یہ امر ظاہر ہے کہ اس ہندی سے مراد پنجابی زبان ہے ؛ لیکن خواجہ مسعود سے ایک عرصہ قبل خود سلطان محمود غزنوی کے عہد میں پنجابی سے مسلمانوں کا رابطہ قائم ہو جاتا ہے ۔ بیرونی کی 'کتاب الہند' میں جہاں مسکوت اور سندھ کے الفاظ ملتے ہیں وہاں پنجابی الفاظ کا ذخیرہ بھی نظر آتا ہے ۔ بیرونی کا سب سے زیادہ قیام ملتان میں رہا ہے ۔ کتاب الہند ۴۴۳ھ کی تالیف ہے ۔ میں یہاں اس کتاب سے صرف چند الفاظ پر قناعت کرتا ہوں ۔ میرے زیر نظر پروفیسر سٹاف کا مرتبہ اڈیشن ہے ۔

صفحہ ۹۹ : ڈانگ ، یعنی پہاڑی علاقے کا جنگل

گندہ = گیندا
مہکال = مہکال

صفحہ ۱۰۰ : 'ہراسولا' - بارہ مولا ، کشمیر کے راسنے میں ایک
قصے کا نام

صفحہ ۱۰۳ : مگر = آبی جانور
برشکال = برسات

صفحہ ۱۰۴ : ہفتے کے نام :

آدت بار ، سوم بار ، منگل بار ، بدھار ، برہسپت بار ، شکر بار ،
شیشجر بار -

صفحہ ۱۰ : میلج ، ملیچھ

صفحہ ۴۴ : بھوت ، برہت ، ناگ

صفحہ ۴۶ : (ڈ) ہاڈی ، ڈوم ، چندال

صفحہ ۶۷ : برہت

صفحہ ۸۶ : سورن ، تولہ ، ماتھ ، افدی ، جو ، کل

صفحہ ۷۸ : تلہ (ترازو)

صفحہ ۷۹ : آنگل ، ہت (ہاتھ)

صفحہ ۸۱ : تاڑی ، بھوج ، بونی (بونہی)

صفحہ ۸۶ : کتارہ (کٹار) ، جتجوا (جنیو)

صفحہ ۹۳ : نالک وساین

صفحہ ۹۴ : تھوھر

صفحہ ۹۸ : بنارسی (بنارس) ، منگیبری (منگیبر)

صفحہ ۱۱۷ : لون ، پانی

صفحہ ۱۳۰ : پنج ند ، سند ساگر

صفحہ ۱۵۷ : کوت (کوٹ = قلعہ)

صفحہ ۱۵۹ : لونگ

صفحہ ۱۷۱ : کھڑی

صفحہ ۲۸۷ : زائر (جائرا)

صفحہ ۲۸۸ ہست ، ہریالی

صفحہ ۲۸۹ دیپالی (دوالی)

ان صورت حالات میں یہ قیاس کہ مسلمان پنجاب سے ہندوستان
جانے وقت کوئی زبان اپنے ساتھ لے جاتے ہیں ، بہت کچھ قابل قبول
معلوم ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم ایک صدی کے
گزرنے کے بعد بھی اس زبان کے آثار امیر خسرو اور غیاثی ہرنی کے
ہاں موجود ہاتے ہیں ۔

فارسی زبان کی ایک قدیم فرہنگ میں اردو زبان کا عنصر

یہ مقالہ مؤلف نے ۱۹۲۸ء کی آل انڈیا اورینٹل کانفرنس منعقدہ لاہور کے شعبۂ اردو میں زیر صدارت نواب صدر یار جنگ پڑھا تھا ؛ بعد ازاں دو نسطوں میں رسالہ 'مخزن' بابت مارچ و اپریل ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا (مرتب)

ہندوستان میں فرہنگ نویسی کا سلسلہ علاؤ الدین خلجی (۵۶۹۵ و ۵۷۱۵ء) کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے مشہور شاعر مولانا فخرالدین قواس غزنوی اس فن کی بنیاد ڈالتے ہیں اور ان کا فرہنگ نامہ اس ملک کا پہلا نثری نورس شمار ہوتا ہے۔ یہ تالیف اگرچہ حجم میں نہایت مختصر ہے اور ایک رسالے سے زیادہ بڑی نہیں لیکن اس کے معتبر اور مستند ہونے میں کوئی شک نہیں، کیوں کہ عہد اکبری سے قبل تک اکثر و بیشتر فرہنگوں کا ماخذ رہی ہے، خصوصاً 'نشاء نامہ' کے لغات کے لیے۔ فرہنگ نامے کے بعد دوسرا نمبر 'دستور الافاضل' مؤلفہ رفیع حاجب خیرات کا آتا ہے جو ۵۷۴ء میں یہ عہد فیروز شاہ تغلق (۵۷۵ء و ۵۷۹ء) تالیف ہوئی۔ اس کے بعد قاضی بدر الدین دہلوی المعروف بدعاوالی کی فرہنگ 'ادات الفضلا' تصنیف ۸۲۲ھ قابل ذکر ہے۔ چوتھا نمبر کتاب 'بہر الفضائل' کا ہے جس کا ایک مختصر تیسرا ہمارے مضمون کا موضوع ہے۔

یہ لغت نگار اور ان کے اکثر متبعین اپنی فرہنگوں میں فارسی الفاظ کی تشریح کے وقت بعض اوقات ان کے ہندی مرادفات بھی بیان کر دیا کرتے ہیں۔ ایسے الفاظ کا ذخیرہ کم و بیش ہر فرہنگ میں موجود ہے۔ اگرچہ یہ مصنف ہندوستان کے مختلف صوبوں سے علاقہ رکھتے ہیں جہاں مختلف بولیاں اور بھاشاں مروج ہیں؛ کوئی بنگالے کا باشندہ ہے، کوئی مالوے کا، کوئی دہلی کا ہے تو کوئی کڑے کا، اور ان میں سے ہر ایک مصنف کا اپنے اپنے وطن کی زبان سے واقف ہونا بھی لازمی ہے۔ مگر دیکھا جاتا ہے کہ ہندی الفاظ لکھتے وقت وہ مقامی زبانوں سے قطع نظر کر کے صرف اس خاص زبان کے الفاظ درج کرتے ہیں جو کم از کم ہندوستان کے مسلمانوں میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ذخیرہ الفاظ ان کتابوں میں عام ہے۔

یہ نہ تصور کرنا چاہیے کہ چون کہ فرہنگ نویس ایک دوسرے سے نقل کرنے کے عادی ہوا کرتے ہیں اس لیے یہ الفاظ ان کی تصنیفات میں عام ہو گئے۔ اس عقیدے کی تردید بہت آسانی سے ہو سکتی ہے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ فارسی فرہنگوں میں ہندی الفاظ کی قرویج کا ابتدائی مقصد یہ تھا کہ ایسے مشکل اور مبہم الفاظ کی تفہیم جن کے لیے یہ حالت دیگر ایک لمحے اور دقت طلب بیان کی ضرورت محسوس ہوتی، مختصر اور آسان طریقے پر کردی جائے۔ اس کے لیے ایسی زبان کی ضرورت تھی جو مسلمانوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہو۔

دوسرے اگر یہ ذخیرہ الفاظ ہندوستان کے تمام صوبوں اور علاقوں میں بولا اور سمجھا نہ جاتا تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ بنگالے کا فرہنگ نویس مالوے کے فرہنگ نویس سے اپنی تصنیف میں نقل کرنا اور بعد میں اس سے ایک اور مصنف جو دہلی یا پنجاب کا متوطن ہے، انہیں یہ جنسہ اپنی فرہنگ میں نقل کرنا

جس سے نہ خود وہ اور نہ اس کے قارئین واقف تھے۔ علاوہ بریں یہ تمام الفاظ ان فرہنگوں میں مشترک نہیں ہیں جیسا کہ ایک دوسرے سے نقل لینے کی صورت میں ان کو ہونا چاہیے تھا، بلکہ ان میں لہجے کا اختلاف بھی موجود ہے جو یہ ظاہر زیادہ تر مقامی اور عصری اثرات کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

مثلاً فارسی لفظ 'آفتاب برست' کا ہندی مرادف 'ادات الفضل' اور 'بہر الفضائل' میں 'گہراکھت' بیان کیا گیا ہے، مگر 'شرف نامہ ابراہیم فاروق' میں 'گہراکھت' مرقوم ہے۔

چندو کے لیے ہندی لفظ ایک فرہنگ میں 'گنگو' ہے، دوسری میں 'گانگو' اور تیسری میں 'گونگو'۔

جوزیویا کا مرادف 'زبان گویا' میں 'چاہیل'، 'ریاض الادویہ' میں 'جہیل' اور 'بہر الفضائل' میں 'چائے پیل' مرقوم ہے۔

فرہنگ نامہ فواس میں افتخار الطیب کے واسطے ہندی الفاظ 'لوکہ'، 'و مکہ' اور 'نکہ' ملتے ہیں۔ 'زبان گویا' میں 'جہیہ کھر'۔ مگر 'بہر الفضائل' میں صرف 'نکہ' پر قناعت کی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس قسم کا اختلاف محض نقالی کی بنا پر پیدا نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں اس ذخیرے کا اکثر حصہ بہ جنسہ یا کسی قدر تغیر کے ساتھ آج بھی اردو زبان میں مستعمل ہے۔

ان دلائل سے ایک یہی صحیح نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ یہ الفاظ اس عام مشترکہ زبان سے تعلق رکھتے ہیں جس کو فی زمانہ اردو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہ الفاظ جو آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فرہنگوں میں ملتے ہیں، اردو زبان کا سب سے قدیم سرمایہ ہیں۔

اس موقع پر کتاب 'بہر الفضائل' کے عہد تالیف اور اس کے مصنف کے متعلق چند الفاظ بیان کرنے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔

ان کا نام محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود بنو خزائنہ البلیخی

المعروف بہ کری ہے۔ ان کی ایک اور تصنیف کتاب جواہر المعادن ہے جو فنون بدیع و بیان و عروض پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا کوئی نسخہ معلومہ کتب خانوں میں موجود نہیں ہے۔ لیکن جس تالیف نے ان کی شہرت کو ہمارے عہد تک زندہ رکھا ہے، وہ ان کی "شرح مخزن اسرار نظامی" ہے۔ فی الحقیقت یہ ایک عالمانہ کتاب ہے جس میں دو ہزار سے زائد آیات کی تشریح نہایت کامیابی کے ساتھ کی گئی ہے۔ یہ شرح آیات کلام پاک، احادیث نبوی اور کلام شعرا سے قدم قدم پر مزین ہے اور اب تک بالعموم مخزن کی سب سے بہتر شرح مانی گئی ہے اور برابر استعمال میں آ رہی ہے۔ اسی لیے اس کے قلمی نسخے بھی کثرت سے دست یاب ہوتے ہیں۔ یہ کتاب اگرچہ ہر زمانے میں مقبول رہی ہے تاہم دیکھا جاتا ہے کہ یورپ اور ہندوستان میں اس کے عہد تصنیف اور اس کے مصنف کے متعلق غلط فہمیاں موجود ہیں جن پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

شرح مخزن اسرار

یورپ میں شرح مخزن اسرار کا زمانہ گیارھویں صدی ہجری مانا گیا ہے۔ اسپرنگر فہرست کتاب خانۃ اودہ میں (صفحہ ۵۲۱) اس کے ذکر میں لکھتے ہیں :

"اس کتاب کے خاتمے پر اس کا سال تاریخ جب یہ کتاب تصنیف ہوئی تھی، یہ حساب جمل درج ہے، یعنی ۵۱۰۹۱ :

بہر گوارا اندر شدم از بہر تساوخ
دلہم گفتا "زہے شرح گلستان"

ادھر دیو برائش ہوزیم کی فہرست خطوط فارسی میں (صفحہ ۵۷۳) اسی شرح کے ایک اور نسخے کے ذکر میں لکھتا ہے :

"جیسا کہ فہرست کتب خانۃ اودہ میں (صفحہ ۵۲۱ پر) مذکور ہے، زمانۃ تصنیف ایک منظوم تاریخ ہے جس میں مادۃ تاریخ "زہے شرح گلستان" مطابق ۵۱۰۹۱ ہے، برآمد ہوتا ہے :

نسخہ۔ ہذا ایک براق اشاعت کا حامل ہے کیوں کہ پہلے منسلح ہے
اس کی تاریخ خرید ۱۰۸۹ء مندرج ہے۔“

ڈاکٹر ابھے انڈیا آفس کے مخطوطات فارسی کی فہرست میں
اسی شرح کے ایک اور نسخے نمبر ۹۹۸ کے ذیل میں لکھتے ہیں :

”لیکن رہو کے نسخے سے جس میں ۱۰۸۹ء مطابق ۱۶۷۸ء تاریخ خرید
مذکور ہے ، ثابت ہوتا ہے کہ اس شرح کی ایسی اشاعت جو کسی
قدر اقدم بھی ہے ، موجود ہے۔“

اسی فہرست کے نمبر ۲۵۱۲ کے تحت ڈاکٹر موصوف بہ سلسلہ
کتاب ہر الفضائل گویا ہیں :

”اس کا مصنف محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود بنو خزائنۃ
البلخی المعروف بہ کرخی شرح غزن اسرار کا مصنف ہے جو ۱۰۹۱ء
میں یا اس سے کچھ سال قبل تصنیف ہوئی ہے۔“

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ مادۂ تاریخ جو مغربی فضلا نے
بلخی کی شرح غزن اسرار کی طرف منسوب کیا ہے ، درحقیقت کسی
نامعلوم شرح گلستان سعدی کے لیے نکالا گیا ہے ۔ میں اپنے سامعین کی
توجہ اس قدرے ”زبے شرح گلستان“ اور اس کے معنوں کی طرف مبذول
کرنے کا مستدعی ہوں ، کیوں کہ فارسی زبان میں اس کی ترجمانی
صرف ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ گلستان کی کیا ہی
عملہ شرح ہے ۔ اس کے سوا کوئی اور معنی نکلتے بھی نہیں ؛ اس لیے
ناممکن ہے کہ کوئی سچے دار انسان ایسا فقرہ نظامی کی شرح غزن اسرار
کے سال تاریخ کے لیے لکھے ۔ یہ ایک ایسا مغالطہ ہے جس کے مغربی
اہل قلم آسانی سے شکار ہو سکتے ہیں ۔

ادھر ہندوستان میں اسی شرح کے سلسلے میں ایک نہایت ہی
عجیب مذاق کیا گیا ہے ۔ میرے پیش نظر ”ظہور الاسرار در شرح غزن
اسرار“ اشاعت دوم طبع نولکشور ۱۸۸۸ء ہے ۔ حالانکہ یہ
شرح فی الحقیقت بلخی کی ملکہ ہے لیکن نولکشور نے کسی شخص
ظہور الحسن بن محمد کلیم اللہ بن عظمت اللہ پٹھوری کو جو سید ابوالحسن

عریضی۔۔۔نی و حسینی کی اولاد سے ہیں ، اس کا مصنف ظاہر کیا ہے ۔ یہ کون بزرگ ہیں ، میں نہیں جانتا ، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ادبی دھڑی کی تاریخ میں یہ ایک دلیرانہ مثال ہے ۔

کارکنان مطبع نے خاتمے میں کسی قدر عقدہ کشائی کی کوشش کی ہے ۔ ان کا بیان ہے کہ :

”اس کتاب کا لسانی نسخہ جو ہمیں نورالحسن صاحب رئیس کثرت پور نے یہ غرض طباعت ارسال کیا تھا ، صریحاً پرانا معلوم ہوتا تھا ، لیکن کتاب کی وہ عبارت جس میں مصنف کا نام درج تھا ، مٹائی جا کر اس کی بجائے ظہورالحسن کا نام لکھ دیا گیا تھا ۔ ہم نے اصل مصنف کے نام کی تحقیق کے خیال سے اس کے اور نسخوں کی تلاش کی لیکن بد قسمتی سے ہماری کوشش ہار آور نہیں ہوئی ۔ اس لیے مجبوراً ہم نے اس کو ظہورالحسن ہی کے نام پر شائع کر دیا ۔“

جب اس شرح کے صفحات پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اس زمانے سے جو اسپرنگر اور اس کے مقلدین نے اس کی طرف منسوب کیا ہے ، بہت اقدم ہے ۔ شرح میں اکثر ایسے شعرا کے اشعار نقل ہوئے ہیں جو آٹھویں صدی ہجری کے اختتام سے قبل ہو گزرے ہیں ۔ حتیٰ کہ مصنف خواجہ حافظ کی شہرت سے بھی قطعاً ناواقف معلوم ہوتا ہے ۔ چنانچہ خواجہ کا نام اس کی شرح میں کہیں نظر نہیں آتا ۔ اس کے ہاں حکیم ستانی ، خاٹانی شروانی ، حکیم انوری ، سوزی ، عبدالواسع جبلی ، رشید وطواط ، ظہیر فارہانی اور شیخ سعدی کے نام ملتے ہیں اور سعدی کو مشرف الدین کے نام سے یاد کیا گیا ہے جو حلیت میں ان کا صحیح نام ہے ۔ بعد میں آنے والی صدیوں میں شیخ کا اصلی نام فراموش ہو جاتا ہے اور ان کے والد کے نام پر بالعموم مصباح الدین مشہور ہو جاتے ہیں ۔ چون کہ مصنف شیخ کے اصلی نام سے واقف ہے ، اس سے ظاہر ہے کہ اس کا تعلق ایسے قریب زمانے سے ہے جب کہ ہندوستان میں بھی لوگ شیخ کے صحیح نام سے اطلاع رکھتے تھے۔ یہ امر گیارہویں صدی ہجری میں ناممکن ہے

جب کہ سعدی ہندوستان میں بلا امتنا مصلح الدین کے نام سے یاد کیے جاتے تھے ۔

شرح میں ذیل کے ہندوستانی شعراء کے ایات منقول ہیں :

- ۱ - مسعود سعد سلمان . ۲ - تاج الدین دبیر ریزہ یا سنگریزہ
 - ۳ - عید نوکی . ۴ - امیر خسرو ترکہ اللہ
 - ۵ - امیر حسن سجری . ۶ - قیصر سجری
 - ۷ - مولانا بھاگوری . ۸ - مولانا جلال الدین گستاخی
 - ۹ - مولانا حمید قلندر . ۱۰ - مولانا فخر الدین
 - ۱۱ - ابوبکر نسیمی . ۱۲ - امیر ایم الدین حسین سجری
 - ۱۳ - مولانا مفتی الدین . ۱۴ - عید منجم
- ہانسوی

اب یہ ہندوستانی شعراء جن میں سے بعض کے نام ہم پہلی مرتبہ سنتے ہیں ، ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ نویں صدی ہجری سے بہت قبل گزرے ہیں ۔ اگر مصنف کا زمانہ گیارہویں صدی ہجری ہوتا تو ضروری تھا کہ وہ نویں اور دسویں قرن ہجری کے شعراء کو بھی اپنی شرح میں داخل کرتا ۔

لیکن اس شرح کا سال تصنیف معلوم کرنے کے لیے نظامی کے شعر ذیل کی تشریح میں :

کیست درین دائرہ دیر ہائے
کوس لمن الملک زند جز خدائے

یہ عبارت ملتی ہے :

”آخریش آہان و زمین ہر قول حکماء اصحاب ذکاوت و کفایت یک لک
ہشتاد ہزار دو صد و نود و شش سال است و این در سال خمسہ
و تسعین و سبع مائتہ من الهجرة بود ۔“

اسی شرح میں حضرت شارح یہ عبارت لکھتے ہیں :

”بدانکہ درین وقت کہ از ہجرت پیغامبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

ہفت صد و نود و پنج سال است ، از گکہ خلقت آدم تا امروز شش
ہزار و ہفت صد و نود و چہار سال گزشتہ ۔“

ان عبارتوں سے صاف واضح ہوتا ہے کہ بلخی اس شرح پر
۹۵۰ھ ہجری میں مصروف تھا ۔ کتاب جبر الفضائل سے ہمارے عقیدے
کی اور بھی تقویت ہو جاتی ہے ۔ وہاں اس تصنیف کے چوتھے باب
میں مختلف قوموں کے مروجہ سنین و تاریخ کے ذکر میں یہ عبارت
مرقوم ہے :

”آغاز تاریخ ہجرت از حرۃ ماہ محرم گرفتند و درین وقت از تاریخ
ہجرت بیستمین ہمسد سی ہفت سال است ۔“
(ہمسد ۔ ہشت صد)

جس سے واضح ہوتا ہے کہ جبر الفضائل ۸۳۰ھ ہجری میں تصنیف
ہو رہی تھی ۔ اسی طرح بکرماجیت کے ست کے بیان میں مذکور ہے :
”تاریخ ایشان از جلوس والے بکرماجیت است در اجین و درین وقت
از تاریخ او یک ہزار چار صد نود سال است ۔“

دونوں کتابوں کے درمیان بیالیس سال کا فرق ہے ، جس سے
ہمیں یہ لباس کرنا چاہیے کہ شرح مخزن بلخی نے اپنی عمر کے
ابتدائی زمانے میں اور جبر الفضائل آخری زمانے میں لکھی ہے ۔

چند الفاظ مصنف کی وطنیت کے متعلق بھی کہنے ضروری معلوم
ہوتے ہیں ۔ اگرچہ عام طور پر بلخی مشہور ہیں ، لیکن وہ قطعاً
ہندوستانی اور ہندوستان زا ہیں ۔ ان کی دوسری نسبت میں بہت کچھ
اختلاف ہے اور مختلف نسخوں میں مختلف شکل میں مرقوم ہے ۔ وہ نے
ایک نسخے میں ’کرخی‘ لکھا ہے ، ڈاکٹر اینٹھی نے نمبر ۲۵۱۲ میں
’کرخی‘ ، نمبر ۲۹۹۷ میں ’نکوئی‘ اور نمبر ۹۹۸ میں ’ہکرنی‘
اور اسپرنگر نے (صفحہ ۵۲۱ پر) ’ہکرنی‘ لکھا ہے ۔ پنجاب یونیورسٹی
لائبریری کے ایک نسخے میں بھی ’ہکرنی‘ ہے ؛ اور چون کہ اکثر
نسخوں میں ’ہکرنی‘ ملتا ہے ، اس لیے ہمیں ’کرخی‘ اور ’نکوئی‘
سے جو بعض نسخوں میں ملتے ہیں ، امراض کلم کے مان لینا چاہیے

کہ صحیح لفظ 'بکری' ہے اور 'کرخی' اور 'لکوی' بھی اس کی سیخ شدہ شکلیں ہیں۔ میرے نسخے میں جہاں یہ لفظ واقع ہوتا ہے عبارت ہوں ہے :

”غزاة البخی المعروف بکری“

اور چونکہ پورا جملہ عربی میں ہے ، اس لیے ہمیں یہ تصور نہ کرنا چاہیے کہ لفظ 'بکری' کی 'ب' نفس کلمہ کی ہے ، جیسا کہ دیو اور انتھے کا خیال ہے ، بلکہ حسب قواعد عربی بائے صلہ مائی چاہیے۔ اس لیے مصنف کی نسبت 'کرخی' ہے نہ 'بکری' اور اس کے وطن کا نام 'کرا' بلکہ 'کڑہ' ہے۔

کڑہ دریائے گنگا پر آباد ہے ۴۴ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ آج کل ایک موضع سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ، اور تحصیل سرائیہ میں واقع ہے ، لیکن قدیم زمانے میں وہ ایک آباد اور حاکم نشین شہر تھا اور کئی اہم تاریخی واقعات کا مرکز۔ کیتباد اور اس کے باپ نصیر الدین بغرا خان کے درمیان یہی ملاقات ہوئی ہے۔ اس کا ذکر امیر خسرو نے اپنی مثنوی 'قران السعدین' میں کیا ہے۔ جلال الدین فیروز شاہ خلجی علاؤ الدین کی سازش کا شکار اسی کڑہ کے سامنے ہوتا ہے۔ کڑہ کے علاوہ فضلا کے نام بہت کم سننے میں آئے ہیں۔ ظن غالب ہے کہ ہمارا مصنف اسی شہر کا متوطن ہو اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ کسی ایسے مقام کا باشندہ ہے جو سلطنت دہلی کے تابع ہے کیوں کہ جرائد الفاضل میں جو باب ہندی اوزان و دینار و درہم پر ملتا ہے اور جس میں مکہ معظمہ کے اوزان کا دہلی کے اوزان سے مقابلہ کیا گیا ہے ، وہاں مصنف دہلی کو آند ہار کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔

۱۔ اس کے علاوہ کبری احمد آباد کے قریب ایک قصبے کا نام بھی ہے جو سلاطین گجرات کے عہد میں بہت مشہور تھا۔ 'سرات سکندری' ، 'آئین اکبری' ، 'مرشتہ' اور 'طبقات اکبری' میں اس کا ذکر آتا ہے۔ تاریخ فیروز شاہی میں (صفحہ ۵۱۸) (باقی حاشیہ صفحہ ۱۱۱)

ہلخی کے سواخ حیات کے متعلق ہم کو کون علم نہیں ، صرف اس قدر اطلاع ہے کہ وہ شاعر بھی تھا اور عالم بھی ۔ شرح مخزن اسرار کے ایک اعلیٰ نسخے میں جو ۱۰۱۱ء کا نوشتہ ہے ، ان کو ملک الشعراء فضل الدین محمد ہلخی کے نام سے یاد کیا گیا ہے ! جس سے ظاہر ہے کہ اکبری عہد میں دنیا ان کے متعلق زیادہ معلومات رکھتی تھی ۔ امیرنگر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فضل الدین محمد نے سکندر نامے کے دونوں حصوں پر حواشی بھی لکھے ہیں ۔ مختصر یہ کہ انہوں نے شادی آبادی شاعر خاقانی و انوری کی طرح ایک اسناد ، شاعر اور فرہنگ نگار کی زندگی بسر کی ہے ۔

بعض موقعوں پر مولانا فضل الدین کی تصنیفات میں ہم کو جدید اطلاع بھی مل جاتی ہے ، مثلاً دہلی کے سب سے چلے شاعر تاج الدین دبیر یا ربیعہ کے متعلق جو شمس الدین التمشی ، رکن الدین فیروز اور سلطانہ رضیہ کے عہد کا شاعر ہے ، معلومہ ذرائع (ہفت اقلیم) سے صرف اسی قدر علم ہے کہ وہ نہایت بہت قامت تھا ، اس لیے اس کو ربیعہ کہتے تھے ۔ (مولانا جہاں سیرالعارفین میں اس کو ستکریزہ لکھتے ہیں) اس شاعر کے بعض قصیدے اتفاق سے قصائد انوری مطبوعہ نولکشور میں کسی غلطی کی بنا پر داخل ہو گئے ہیں ۔ ہلخی ایک موقع پر اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ :

”تاج ربیعہ وا بہائے قبل انداختند۔“

گویا یہ عبرتناک ایام ہوتا ہے دہلی کے اس شاعر کا جو اپنی

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۱۰) اس کو ایک جگہ کڑھ لکھا ہے اور دوسرے مقام پر کڑھ بنی ، لیکن صحیح نام کڑی ہے ۔ اب کڑی سے ’کڑی‘ نسبت آسانی کے ساتھ بن جاتی ہے اور ظن غالب ہے کہ مصنف اسی کڑی کی طرف منسوب ہے ۔ کڑی قصیدہ ہونے کے علاوہ ہر گز بھی نہا ۔ (صفحہ ۳۶۸ ، ۳۳۳ ، ۳۵۰ ، مرآت سکندری) ۔

ہندی نژادی پر شعر ذیل میں فخر کرتا ہے :

مولد و منشا میں دو خاکے ہندوستان مرا
نظم و نثر میں کہ با آب خراسان آمد است

اسی طرح عید منجم کے واسطے جو غیاث الدین تعلق (۱۷۲۸ء و ۱۷۲۸ء) کے عہد کا شاعر ہے ، لکھا ہے کہ اس کو سولی ملی تھی ۔ چنانچہ تاریخ فیروز شاہی ضیا برنی بھی اس کی مؤید ہے ۔

باضی کے ہاں ایک اور جدید اصلاح یہ ہے کہ فارسی لفظ خرگہ بہ معنی خیمہ بزرگ ۔ سلطان محمد بن تغلق (۱۷۲۸ء و ۱۷۵۳ء) کو اس کی ترکیب کی بنا پر جس سے دم کا چلنو بھی مترشح تھا ، ناپسند تھا ؟ اس لیے اس نے 'خرگہ' کو 'خرم گاہ' کی شکل میں بدل دیا ۔ چنانچہ دہلی اور اس کے اطراف میں خرم گاہ بولتے ہیں ؟ تاہم میں یہ فقرہ ملاحظہ ہو :

”ہوایں نوع آگاہی داد تا خواجہ جہاں را دریں چوڈول سوار
کشد و بخرم گاہ برد۔“

(صفحہ ۷۱ ، تاریخ فیروز شاہی ، شمس سراج عظیم)

۱۔ لیکن تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ امیر حسن سجری دہلوی کے نسخہ 'فوائد القواد' میں جو یقیناً ۱۷۲۸ء سے قبل کی تصنیف ہے ، لفظ 'خرم گاہ' موجود ہے ، مثلاً ”آزماں سلطان در خرم گاہ نشستہ بود ۔ سید نورالدین مبارک علیہ الرحمہ نزدیک قبر یک جانب خورمگاہی نشستہ بود۔“ (صفحہ ۲۳۸)

”و ہردو بیرون خورم گاہ بودند۔“

”و درون خورمگاہ برد۔“ (صفحہ ۲۳۹)

(’فوائد القواد‘ ، فخرالمطابع ۱۷۲۷ء)

اس سے ظاہر ہے کہ یہ اصطلاح محمد بن تغلق کے عہد سے قدیم ہے ؟ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یہ لفظ ہندوستان میں وضع ہوا ہے ۔ (مندرجہ بالا نوٹ شائع شدہ مضمون کے حاشیے پر حافظ صاحب مرحوم کے قلم سے لکھا ہوا ہے ۔ (مرتب)

اس کے علاوہ مولانا کی تصنیف میں ایسے ہندی شعرا کے نام بھی ملتے ہیں جو اور ذرائع سے ہم تک نہیں پہنچے، مثلاً امیر قیصر سجزی، جمال الدین استاجی اور ابوبکر نسیمی وغیرہ۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بحر الفضائل پر بھی ایک نظر ڈالی جائے۔

بحر الفضائل

یہ کتاب جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے، ۱۳۰۵ھ میں تصنیف ہوئی ہے اور عربی و فارسی لغات کی ایک فرہنگ ہے جو دو قسموں پر تقسیم ہے؛ پہلی قسم لغات پر مشتمل ہے جو ترتیب وار درج ہیں، دوسری قسم میں مختلف اور غیر متعلق مگر مفید مضامین ہیں جو عام معلومات پر مبنی ہیں۔ مآخذ کے لیے کتب ذیل شمار ہوتی چاہئیں :

لغت فارس لسانی، زبان گویا، لسان الشعرا، النفیس، فرہنگ نامہ شیخ زادہ عاشق (تاجیں، صبا، مغرب)، مقدمہ جلال اللہ زحشری، اسمی، تہذیب المصادر، متعلیمی قرآن؛ نیز رودکی، عنصری، عمیق بخاری، خاقانی، انوری، نظامی، سندی اور امیر خسرو دہلوی کے دواوین و کلیات سے بھی امداد لی ہے۔ فہرست مضامین حسب ذیل ہے جو خود مصنف کے الفاظ میں درج ہے :

قسم اول : در لغات اہل فضل و اصطلاحات اہل ان بے ترتیب حروف تہجی، و دریں قسم بیست و ہشت باب است۔

قسم دوم : در ابواب متفرقہ و دریں قسم چہارہ باب و سی ہفت فصل است۔

باب اول : در آسمانی بعضی از اہل و اولاد و نژاد و عزوات و اسباق و اسباب پرغایہر جلی اللہ علیہ وسلم۔

باب دوم : در الفاظ ادوات و غیرآں و دریں باب دو فصل است :

فصل اول در اعداد، فصل دوم در تنوین۔

باب سوم : در کنیت ها و درین باب چهار فصل است :

فصل اول در 'اب' ، فصل دوم در 'ام' ، فصل سوم در 'این' ،
فصل چهارم در 'هنت' -

باب چهارم : در آسانی ماهها و ایام هر ملت و درین باب
هفت فصل است :

فصل اول در ماهها ، عرب ، فصل دوم در ماهها ، روم ،
فصل سوم در ماهها ، فارس ، فصل چهارم در ماهها ، یهود ، فصل پنجم
در ماهها ، جبریه ، فصل ششم در ماهها ، هند ، فصل هفتم در آسانی
روزها که هفت روز است -

باب پنجم : در آسانی کواکب سیاره و ثابته و درین باب سه تا
فصل است -

فصل اول در بروج و منازل ثمر است ، فصل دوم در کواکب
سیاره و عقدین و کید ، فصل سوم در کواکب ثابته -

باب ششم : در اقلیم ها و آسانی بعضی شهرها مشهوره -
باب هفتم : در چلیه آدمیان -

باب هشتم : در وزن درم و دینار و قیراط و صاع و رطل و
من و جز آن -

باب نهم : در الفاظ دومعنی که فضلا را بکار آید و صنعتها -
درین باب شش فصل است :

فصل اول در الفاظ دومعنی ، فصل دوم در مثلث ، فصل سوم
در مثل ، فصل چهارم در اضداد ، فصل پنجم در تجنیس و تضعیف ،
فصل ششم در متلوب و معکوس -

باب دهم : در الفاظ متتلسب از هر نوع و درین باب نه
فصل است بدین تفصیل :

فصل اول در آسانی بهشت و حور و قصور و حیاض و غیر آن ،

فصل دوم در آسامی قیامت و 'دوزخ و متاعب آن' فصل سوم در آسامی حکما و الفاظ یونانی و سریانی ، فصل چہارم در آسامی یاد ہا ہر اجناس ، فصل پنجم در آسامی بیابان ہا ، فصل ششم در آسامی بادشاہان ہر بلاد ، فصل ہفتم در تمام طعوم یعنی مزدہا و مزاج آن ، فصل ہشتم در نام گنہا ریاحین عربی و فارسی و ہندی ، فصل نہم در متفرقات ۔

باب یازدہم : در آسامی مے و خمار و اوانین و اسباب ۔

باب دوازدهم : در آسامی پردہا و اوقات نواختن سرود و راگ ہا و در آسامی مزامیر و آج نوازند و در این باب سہ فصل است :

فصل اول در پردہا و شعبہا و وقت نواختن ، فصل دوم در راگہا ہندی ، فصل سوم در مزامیر و آج نوازند ۔

باب سیزدہم : در آسامی ہفتاد و دو ملت اہل بدعت و بعض اسباب و مقدم ایشان ، درین باب سہ فصل است :

فصل اول در آسامی ہفتاد و دو ملت اہل بدعت و اقوال ایشان ، فصل دوم در بیان احوال بعضی اہل ضلالت از ہفتاد و دو قول ، فصل سوم در بعض اسباب و مقام و دین ہا اہل بدعت ۔

باب چہاردہم : در الفاظ ہندی کہ در نظم بکار آید ۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کی فہرست مضامین سے عیاں ہے ، لغات کے سلسلے میں ایک مفید اور ضروری اضافہ ہے مگر بدقسمتی سے قدیم لغت نگار بھی اس سے واقف نظر نہیں آئے اور نہ اس کے نسخے ہی زیادہ تعداد میں ملتے ہیں ۔ صرف تین نسخے معلوم ہیں : ایک کتب خانہ آصفیہ میں اور دو نسخے جن میں ایک نصف کے قریب ناقص ہے ، انڈیا آفس کے کتاب خانے میں موجود ہیں ۔ ہر الفضائل کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے وہ نویں صدی ہجری کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے ، اور کوئی تعجب نہیں اگر خود مصنف کے عہد میں نقل ہوا ہو ۔ اس میں املا کی وہ تمام خصوصیات جو نویں صدی کے

منصف اول میں رائج تھیں ، موجود ہیں ۔ اس کا فارسی خط ہندوستانی تعلیق میں مرقوم ہے اور عربی خط نسخ کی اس شاخ سے تعلق رکھتا ہے جس کو بعض اوقات خط لاہوری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ اس کا کاتب ظریف محمد بن عبداللطیف قریشی الہمدی متوطن نریاد ہے جو احمد آباد گجرات سے ۱۹ کوس کے فاصلے پر واقع ہے ۔ میان الولک گجرات کے مشہور ولی اسی شہر میں مدفون ہیں ۔ لیکن یہ کتاب موضع مانڈورا میں نقل ہوئی ہے ۔

ایک دل چسپ خصوصیت اس نسخے کی یہ ہے کہ کاتب نے بعض اوقات ہندی الفاظ میں 'کھ' اور 'ڈال' اور 'نون' ہندی کی تہیز کے لیے ان کے نیچے تین تین نقطے دے دیے ہیں اور 'ڑے' کی شناخت کے واسطے اس پر ایک چھوٹی 'ٹوٹے' جیسا کہ آج کل دستور ہے ، لکھی ہے ۔ 'ٹائے' ہندی کے لیے کوئی علامت نہیں ۔ بعض اور خصائص بھی ہیں ، مثلاً دوزخ کی 'ڑے' پر ہمیشہ تین نقطے لگائے ہیں ۔ اسی طرح سال و سنین لکھنے وقت فارسی میں سات و عشرات و احاد کے درمیان واؤ عاطفہ لائے جانے کا دستور ہے ۔ لیکن کاتب یا مصنف اس واؤ کو حذف کر جاتا ہے اور بالکل اردو زبان کے طریقے پر لکھتا ہے ۔

سلطان فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ و ۷۹۰ھ) کے عہد میں مسلمانوں میں ایک نئی تحریک شروع ہوئی ہے جس کے اثرات میں ان کو ہندو کے علوم و فنون سے واقفیت حاصل کرنے کا شوق ہو جاتا ہے ۔ خود سلطان کے حکم سے سنسکرت کی بعض کتابیں فارسی میں ترجمہ ہوئیں ۔ ان میں 'دلائل فیروز شاہی' کا نام بہت مشہور ہے وراہمیر خلف ادتیا داس کی کتاب 'ہاراہی سنگھتا' کا جو فارسی میں 'ہاراہی' کے نام سے مشہور ہے اور تنجیم و تناؤل سے متعلق ہے ، عبدالعزیز شمس سراج عقیف 'تاریخ فیروز شاہی' کے مصنف فارسی میں ترجمہ کرتے ہیں ۔ انہیں اثرات میں بلخی نے 'بہرالفطائل' کی قسم دوم میں وہ ابواب باندھے ہیں جو ہندو سمت، ماہ و ایام، موسیقی اور ہیئت سے متعلق ہیں ۔ لیکن یہ ابواب بہت مختصر ہیں ۔ ایک باب میں

مصنف نے چبھو دیپ یا ہندوستان کے قدیم جغرافیے کا ذکر کیا ہے ، جو غالباً پرانوں کے بیانات پر مبنی ہے ۔ ایک باب ایسے ہندی الفاظ کا پاندھا ہے جو نظم ہندی میں کارآمد ہیں ۔ بدقسمتی سے یہ باب نہ میرے نسخے میں ملتا ہے اور نہ انڈیا آفس کے نسخے میں ۔

ایک موقع پر ہانچی نے ذیل کا ہندی شعر لکھا ہے :

دیکھ دیکھ پیو پیو گھر جاوے
تس تس نیمو نیمو نہ آوے

ایک فصل میں ہندوستان کے بھولوں کے نام ملتے ہیں جن کا ذکر یہاں خالی از دل چسپی نہیں :

(۱) انار	(۲) بالا	(۳) بانہ
(۴) ببری	(۵) بیل -	(۶) بیل -
(۷) بولسری	(۸) تلسی	(۹) کیوڑہ
(۱۰) چنبہ	(۱۱) جوہی	(۱۲) دونہ
(۱۳) وہلہ	(۱۴) راجیہ	(۱۵) راؤ بیل
(۱۶) ہست	(۱۷) سرکھند	(۱۸) سراہیل
(۱۹) کیسو	(۲۰) ستدورہ	(۲۱) سپوئی
(۲۲) کرنی	(۲۳) کوندل	(۲۴) کنیں
(۲۵) کھنن دالو	(۲۶) لمو	(۲۷) مالچی
(۲۸) بھونہ	(۲۹) مروہ	(۳۰) فرگس
(۳۱) جاسن (جاسون)	(۳۲) سنگار ہار	(۳۳) ناگپرس
(۳۴) گل نہروڑ (دوپہریہ)	(۳۵) تاج خروس	

ان میں سے دو تہائی ایسے ہیں جو آج بھی اردو میں مستعمل ہیں ۔

ہندی آلات موسیقی کے یہ نام دیے :

(۱) الاین	(۲) بھیر	(۳) بین
(۴) چتر	(۵) ڈھاک (ڈھولک)	(۶) دھل ، مندال (طبل)

- (۷) دوتاوہ کہ پٹھان نوازند (۸) دھد (۹) گہوڑی
 (۱۰) سنکھ (۱۱) کنکسرہ (۱۲) کتدلی
 (۱۳) کنجھال

اسی سلسلے میں مبارک و نا مبارک سرود کی شناخت کے واسطے
 اشعار ذیل لکھے ہیں جو خود مصنف کی تصنیف معلوم ہوتے ہیں :

مکن را ہر سہ گرہ باشد یقین داں
 یکن اول دو گر یک لکھنی داں
 رکن را اول آخر گرہ بود ہی
 میان ہر دو شان یک لکھنی بود ہی
 مکن را یک گرو دو لکھ بود نیز
 بجز ایں ہر سہ نبود دریاں چیز
 تگن را لکھ بود اول و زان ہی
 دو گرہ باشد باشد غیر آن کس
 چکن را لکھ بود پیش و ہی او
 میان ہر دو لکھ یک گرہ نہ تو
 بھکن را ہر دو لکھ ہی یک گرہ نیز
 نکن را جز سہ لکھ نبود دگر چیز

بلخی نے ڈھائی سو سے زیادہ ہندی الفاظ فارسی و عربی الفاظ کی
 تشریح کی غرض سے اپنی تالیف میں داخل کیے ہیں۔ ان میں نصف سے
 زائد ایسے ہیں جو آج بھی اردو میں بغیر کسی تغیر و تبدل کے بعینہ
 رائج ہیں، جس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اردو زبان ہمارے
 مروجہ نظریے کے برخلاف مغلیہ عہد سے بہت قدیم ہے۔

بعض ایسے الفاظ بھی ہیں جو آج اردو میں رائج ہیں مگر کسی قدر
 تغیر کے ساتھ؛ کچھ مثالیں عرض ہیں :

بلخی لیسو کو کیسو، بھرتہ کو برہتہ، چھڑولہ کو چھلیڑہ،

اجواشن کو جوائ ، ہاندو = ہندر کو ماندر میں کے ساتھ ، میں پھل کو میند پھل ، کپاس کو کپاسیہ ، دھوئیں کو دھوں ، پیپہڑہ کو پیپہسہ ، تھنچے کو تھانچہ ، گاڑھی چھاچھ کو جاڑی چھاچھ ، گجر کو گجرہ ، کنکھجورا کو کان کھجورا ، کچھوے کو کاجھہ ، کنکھی کو کنکھی ، نکمال کو نکمال ، بڑاگل کو باگل ، سولسری کو بولسری ، سل بٹہ کو سلاہتہ وغیرہ لکھتا ہے ۔

ایک تعداد ایسے الفاظ کی بھی ہے جن کی شناخت و صحت آج بہت دقت طلب ہے ۔ میں نے ایسے موقعوں پر بعض صورت نویسی سے کام لیا ہے ۔ کہیں کہیں ہندی لفظوں کو فارسی تصور کر لیا ہے ۔ مثلاً دو لفظ عرض ہیں ۔ ’میں‘ بہ معنی ماہی ہندی لفظ ہے ، مصنف نے فارسی سجدہ لیا ہے ۔ اسی طرح ’سلاہتہ‘ کی تشریح میں لکھا ہے ’سنگ کہ بدان دارو و جز آن شکند‘ ، ہندوی بٹہ گویند ۔“ میرا خیال ہے کہ سلاہتہ کوئی فارسی لفظ نہیں ہے ، بلکہ در حقیقت ہندی لفظ سل بٹہ ہے جسے سلاہتہ بھی بعض مقامات میں کہا جاتا ہے ۔

اردو زبان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے غیر زبانوں کے بعض الفاظ اپنے استعمال میں لیے کر ان کو خاص معنی دے دیے ہیں ، مثلاً کاهل بہ معنی سست کو قہماے اردو یزدل کے معنی میں استعمال کرتے تھے ۔ اسی طرح لفظ غصہ بہ معنی اندوہ ہے جو آج بھی اردو میں یہ معنی خشم و غضب مستعمل ہے ۔ بلخی نے اس لفظ کو دو جگہ لکھا ہے ؟ ایک جگہ بحیثیت لغت کے اور اس کے معنی غضب بیان کیے ہیں ، دوسرے مقام پر توفیر کی تشریح میں کہتا ہے : ”خط و نامہ و فرمان بادشاہان یا غصہ ۔“

ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اردو نے دوسری زبانوں کے الفاظ کی شکل یا حرکات میں تصرف کر لیا ہے ، مثلاً عاری کا انیاڑی ، یہ کا بیت ، ہلک کا ہلکت ، مدد کا مدت ، اور شرم کا شرم بنا لیا ۔ اس خصوصیت کے ذیل میں بلخی کے ہاں بعض الفاظ ملتے ہیں ، مثلاً فیلے کا ہندی مرادف اس نے ہلکتہ لکھا ہے ؟ چنانچہ ہلکتہ آج بھی اردو

میں مستعمل ہے ۔ علیٰ ہذا فصیل کے ذکر میں گویا ہے :

”فصیل دیوار سے کہ پیش دروازہ میں باشد و غلط عام در خلق
فصیل ۔“

اب جو غلطی کہ اب سے بان سو برس پیشتر کی جا رہی تھی ،
ہم آج بھی دہرا رہے ہیں اور وہی صیل بولتے ہیں ۔ کم خواب کا
ترجمہ کم قاب دیا ہے ۔ آج کل اردو میں فدالی = دف نواز کو فدالی
کہتے ہیں ؛ جہلا فدالی یا بھدالی بھی کہہ دیتے ہیں ۔ لیکن یہ تصرف
آج کا نہیں ہے بلکہ قدیم سے ہے ، چنانچہ صاحب بحر الفضائل لفظ کھک
کی تشریح میں لکھتے ہیں :

”ساز است کہ فدالی می نوازند ۔“

دشمنی کی بجائے دشمنانگی لایا ہے جو آج بھی عوام بولتے ہیں ۔
خلیل کو خلل کہاں لکھا ہے ؛ عوام آج کل بھی اس کو خلل
کہہ جاتے ہیں جو دراصل گلولہ ہے ۔

ان چند امثال سے کم از کم ہم کو اتنا پتا تو چل جاتا ہے کہ
اردو زبان نے بلخی کے عہد سے پیشتر ہی اپنے لیے ایک شاہراہ اور
زبانوں سے الگ نکال لی ہے اور اپنی شخصیت کو دوسری زبانوں سے
بالکل میز کر لیا ہے ۔

یہاں ان الفاظ کی فہرست درج کی جاتی ہے ؛ اس میں میں نے
دانستہ مصنف کے بیانات پر اکتفا کی ہے ؛ البتہ اس قدر کیا ہے کہ
بعض مولفوں پر تشریح غیر ضروری سمجھ کر ترک کر دی اور صرف
ہندی مرادف پر قناعت کی ہے تاکہ مضمون زیادہ دراز نہ ہو جائے :

آبنوس : دوختے است سیاہ چوب دارد ؛ ہندوی تیسرو گوہند ۔

اجمود : دارا یعنی جوانی ۱ ۔

آفرین : خورد علم بر سر دوکان ہا می ہندند بوقت آمدن پادشاہ ؛
ہندوی ڈھج گوہند ۔

اوزن : یعنی چینہ ۔
 آسا : فائزہ کہ عرب ثوبا گویند ؛ ہندوی جنبہائی^۱ ۔ گویند ۔
 اعرج : لنگ ؛ اہل ہند پانگہ گویند ۔
 اسفاناخ : سبزی کہ پالک گویند ۔
 اسم : نام الہ ، خدا کا نام ۔
 اشتر غار و اشتر غار : کیا ہے است غار دار مالوف شتر یعنی
 جوانمہ ۔

گشمہ : داروے خوشبو است ، چھلیڑہ گویند ۔
 اصابع الرسوص : نظم اشکن کہ چٹکیہ می فروشند ۔
 الطریق^۲ : تریپلہ ۔
 انفار الطیب : ہندوی نیکہ گویند ۔
 استرنک : مردم کیا ؛ ہندوی ہتھا جوی گویند ۔
 آفتاب پرست : حرہا ، اہل ہند گھرگھٹ^۳ گویند ۔
 اکلیل الملک : ہندوی کلو گویند ۔
 الوا : کیا ہے است تلخ کہ آن را کنوار گویند ۔
 ام خیلاں : ککر گویند و بعضے کنار و بعضے جلوآلہ را گویند ۔
 امایس : سنگھندو اول و آن را آمد ہندو جو کہ گویند ۔
 انبوخ : یعنی شکنج کہ در روے مردم می افتد ۔ ہندوی
 جہری گویند ۔
 انستہ : کیا ہے است کہ آن را عربی سعد خوانند و ہندوی
 مونہ^۴ گویند ۔
 انکران : جابتری ۔

- ۱ - یعنی جاہی (مرتب)
- ۲ - الطریق جسے عام طور پر عربی لفظ مسجھا جاتا ہے دراصل ہندی
 'تری پھل' کا معرب ہے ؛ اردو میں 'تریپلہ' اور پنجابی میں 'تریپڑا'
 ہو گیا ہے ۔ (مرتب)
- ۳ - یعنی 'گھرگٹ' (مرتب)
- ۴ - آج کل اردو میں 'ناگڑ مونہا' کہلاتا ہے ۔ (مرتب)

- آھک : چوئہ ۔
 آھوں : ہر وزن جاسوں ، نقاب ۔
 اہنک : ہندوی اے مے کہی ۔
 بادونگ ہوہ : نوعی از ریحان است یعنی دولہ ۔
 باد بیژن : یعنی پتکہ ۔
 بادبان دشتی : برہتہ ۔
 بار : بھل را گویند ۔
 باز : جانورے است معروف از سوا لکپہ آید ۔
 باردہم : ہندوی دمچیں ۔
 بابکوب : ہاتر ، ہائے ہاف ، جلاہہ یعنی ہتیکو ۔
 بیج : ہرچہ بہ زور یاوگراں بین شود چون
 میوہ پختہ کہ ہائے بروہند گویند بیج شد و ہندوی جبکا چور گویند ۔
 بذوالبیج : تخم بنگ و تخم دھاتورہ ۔
 برچیں : خار کہ گرد کشت داؤند ؛ ہندوی ہاری گویند ۔
 برص : کودہ ۔
 برعہ : آلت درودگراں کہ ہذاں سوراخ ہاکندہ ہندوی سیاری ۔
 بزاوند : چوہے کہ ہس در در زہ کنند برائے ہکمی یعنی ہوکھل ۔
 برخو : اہل ہند آنرا ہوزنہ گویند ۔
 بزغ : اہل ہند آنرا دادر گویند ۔
 بسباس : جابتری ۔
 بسنہ : یعنی مکو ۔
 بشک : کہ نہائی گویند ۔
 بغض : دشمنائی ۔
 ہند : گاؤ فعل ، ہندوی ساندہ ۔
 ہنلہ الحما : تخم لونگ و بڑی لونگ ۔
 ہنلہ الہالیہ : ہری چولائی ۔
 ہلادر : بھلاوہ ، بھداوہ ۔
 ہنچہ مریم : ہنھا جوڑی ۔

- بنفشه : هندوی پنسیس گویند -
 بوزه : کتله درخت ؛ هندوی پید -
 بیر : بهندوی و عربی چاه -
 تاجی : سپهر زر که در کار خیر بر سر مرد یا عورت می بندند -
 ترقوه : چنبر ، گردن یعنی بومی -
 تون : گل سرین و رنگین است -
 ترم : سرائیدن یعنی بکوان کرنین -
 تسو : یک نیم حبه است در پیچودن -
 تله : مخ دام که هندوی کورکی گویند -
 کیام : بهتا -
 تنکار : سپا که -
 تنگ : باز شتره هندوی هوت و موت و دھوکری که در کشتی
 فرود آید -
 توژنه : پوست درختی است ؛ هندوی بهوج پتر -
 توقیع : خط و نامه و فرمان پادشاهان یا خیمه -
 شامه : گیاه است ، هندوی نهساتنه -
 ثوبا و قازه : هندوی جنبهائی -
 نور : کلو فلک ، هندوی بر که گویند ؛
 ثولول : هندوی سیه گویند -
 جاهیوز : خار کز که بدان دلاوز چاه کشند - اهل هند آن را
 بلانی خوانند -
 جفن : آهک یعنی گچ از چونه کنند -
 جفزه : چوب پاره که کو دکان با رشته گردانند و او را لتو گویند -
 جترو : که زن به جهت پا کوبی می بندد -
 جوار : چرخ روغن گران ، هندوی گهائی -
 جوژ : اکهروت -
 جویژوا : جائے بهل -
 جوژ پاری : اکهروت -

جوز مائل : بار دھاتوره -

جوز قے : میند پهل ، جوزا لقتن یعنی کپاسیه -

جوز هندوی : ناریل و ماجیل هم گویند -

حیه : یک جیتل و دانه سرخ است که بدای وزن کنند و خرجه

دو جو باشد -

حسک : خار گوکهر و -

حضا ج : یعنی کفتار یعنی ترکیته -

حضجر : کفتار یعنی ترکیته -

حکاک : خارش اندام یعنی کهنس -

حکیم : طبیب و منجم -

خار باز : هندوی چهره و اونکه و ابکهاره گویند -

خرچنگوک : کپا ه است ، هندوی سبتل گویند -

خرزهره : درخت کنیر -

خرقه : تراه است ، بهندوی لونک گویند -

خروده : ککره -

خس الحار : شکار یعنی سچی -

خشت ژوبین : یعنی گوپهن -

خضر ج : به هندوی لونک گویند -

خنزیر : خوک یعنی سور -

دایم : جاوید و همیشه و جدا -

دخن : یعنی اوزن که آن را چینه گویند -

دژسین : حصار سین ، هندوی ثابته گویند -

دغدهغه : دست زیر بغل و کش کردن تا کسی به خندد ؟

هندوی گدگدی -

دولاب : چرخ ازاں چله که هندوی رسته گویند -

دود : دھوان -

دوک : آلتا هنی که بروماشون کنند یعنی اهل هند کوکری گویند -

دیپ سته : آن دیو که مردم را در خواب فرو گیرد ؛ اهل هند

آن را اتھارہ گویند ۔

دھوچہ : جوک ۔

ذروہ : یعنی سیدھی ۔

ذقن : ہندوی تھوڈوھی ۔

راسن : بازار دشتی کہ ہندوی یا چرکاندہ گویند ۔

راق : جا بتری ۔

وال : داروایست مثل صلیغ کہ کو دکاں در شب براۃ برائے

بازی می سوزند ۔

راویز : جواسہ ۔

رباط : یعنی تھانہ و سکونت ، جاے غذا ۔

رخبین : دواغ شیر : ہندوی جاڈی چھاچھ ۔

رخونہ : ماشورہ کہ اہل ہند آنرا کوکری گویند ۔

راب : یعنی جا بتری ۔

ول : پوست درخت ارلو ۔

ومان : اتار ، ہندوی ڈازم گویند ۔

ویہ : شش یعنی پیپہسہ ۔

زادالکوکب : داروایست کہ ہندوی کیس گویند ۔

زانکرو : جنجرو یعنی جرس و جلاجل و زنگہ ۔

زاک : یعنی پھٹکری ۔

زاک ترکی : ہیرا کمیس ۔

زبدہ : مسکہ ۔

زراوند : کچور ۔

زربلب : کیا ہے خوشبوست بر بینی گویند ۔

زرباد : کچور ۔

زعفران : کنلو ۔

زعفران سودہ : چابی ۔

زقوم و زعنویا : درخت تھوہر ۔

زلاہ : جلاہ ۔

- زمام : ہندوی ناتھ ستور و شتر -
 زاک : بھنگری -
 زنبور : ذیل و آن آلتے کہ دو کسی گل از چائے بیرون اندازند
 ہندوی مندل -
 زنجبیل : سندھی^۱ -
 سارید : تھانپہ -
 ساروق : چور -
 سال : چوٹے محکم و راست الدام است درہند -
 سپرز : تل -
 سیز دار : چاہتری -
 سیند ہندی : تخم جلیج -
 سپہ سپرہ : خرمسہ کہ ہندوی ستکہ گویند -
 ستوقہ : ستو -
 سجنجل : آئینہ و قرص روئی برائے زدن ساعت شب و روز ؛
 ہندوی کجرہ گویند و کھریالہ ہم گویند -
 سد باہہ : ہزار باہہ ، یعنی کل کھجورا -
 سراب : زمین شوریستان کہ ہم چو آب نماید ؛ ہندوی چہاچہوہ -
 سرخاب : چکوا چکوی -
 سرشک : درختے است ؛ ہندوی سرس گویند -
 سرند : کیا ہے است کہ در آب روید و در ہائے آویزد -
 سلاہتہ : سنگ کہ بدان دارو و جز آن شکند ، ہندوی
 پتہ گویند -
 سلق : چندر یعنی گونگو -
 سلطہ : تلسی -
 ساخچہ : سینہ بند زنان کہ آن را دوالی گویند -
 سہان : برگ شمال پتر -
 سمط : ہار -
 ۱ - سونٹہ مراد ہے - (مرتب)

- سنبیل : چہرہ -
 سنج : دو قطعہ مس کہ ہم زندہ ! ہندوی کتبہال -
 سنگ پشت : کچھہ -
 سوینی : ہست یعنی سانو -
 سیمائہ : بعضے ہم و بعضے یکاں را گویند -
 سیہ : گیاه یعنی گھاس -
 شا افروش : زلیہاں یعنی جلائی -
 شانہ : کتہ در سر کنند ! ہندوی کنگسی گویند -
 شاہ ترہ : ہندوی دوتہ -
 شاہ دانہ : تخم پھنگ -
 شبخون : ہندوی ربتوا -
 شبہ : مانند (کذا) -
 شبہ بمانی : پھنگڑی -
 شتر خوار : گیا ہے خار دار ، جوانہ (کذا) گویند -
 شش : پورہ پورہ -
 شفاقل : مونہہ -
 شلکک : موری -
 شنبلیہ : میتھی -
 شورہ : کھار را نیز گویند کہ برائے آتش بازی بکڑ آید -
 شوشک : کیک یعنی ایہو (پسو) -
 صعوہ : سرجہ کہ اہل ہند آن را بولا گویند -
 صمغ : شیرہ درخت یعنی گوند -
 صندل : چندن و چندن صندل -
 ضرب : سرایے درم ، تنگسال -
 طاس : جام یعنی پیالہ و کٹورہ -
 طبرزد : شکریست سپید بورہ مثل نبات -
 طلق : تالک ہندوی ابھرک -
 ۱ - یعنی بالچھڑ (مرتب) -

- طوطی : گیاہست ، طوطی سپید سنگھاولی (محیط اعظم)
 سنگھا ہولی و طوطی اندھاولی اندھا ہولی ۔
 نظرا لطیب : ننگہ ۔
 ہنس : غلہ است کہ آن را دال می سازند ؛ اہل ہند مسور گویند ۔
 عزب الکلاو : گیاہ است ، منڈی گویند ۔
 عطر : خوشبوئی ۔
 عقیقہ : گو سپندے کہ بعد تولد پسر قربانی می دهند ۔ اہل ہند
 آن را مونڈن می گویند ۔
 عناب : منجاو چندان ۔
 عنب الثعلب : ہندوی کتاہی ۔
 عنصر : بیاز دشتی ؛ ہندوی کائلمہ ۔
 عود الثعلب : عود سیاہ وام مثل تیلیا ۔
 عیرب : تتری ۔
 غار : اہل ہند آن را لرو لورو کوتر میخوانند ۔
 غصہ : غضب ۔
 خلغلچ : گد گدی کردن ۔
 خلواو : چہل ۔
 غمازک : چوبیس کہ بالائے شست می بندند تا معلوم شود
 کہ ماہی طعمہ خورد ؛ اہل ہند آن را برند گویند ۔
 غارہ : جنبہائی ۔
 غامیہ : گلی چنہ ۔
 قبیلہ : پایتہ ۔
 فرخج : سرین ، چوٹڑ ۔
 فرفرہ : بھری کہ آواز او سون سون می آید ۔ بیشترے
 کودکان آن را سوسہ می خوانند ۔
 فرفر : بھری چوبیس بیشتر آواز او سرو سرو می آید و فرفر
 لورو ہم گویند ۔
 فصیل : صفیل ۔

- نگار : ریش کہ از جراحت پر اندام مردم می افتد ، ہندوی جالندی ۔
- قبیرہ : ماتورک ۔
- قرو : کہی یعنی بوزنہ ، ہندوی ہنوت ۔
- قزغان : کزراہی ۔
- قسط : داروست کہ کوئہ گویند ۔
- قلندہ : کلندہ ۔
- قوت الصباغین : ارویان کہ منجیثہ گویند ۔
- کازی : کل کیوڑہ ۔
- کاز و کاڑ : سنداسی ۔
- کاورس : غلہ باریک چون کانک و چیتہ ۔
- کہان : ترازوے یک ہلہ کہ لبان ہم گویند ؛ ہندوی کتہان ۔
- کہی : بوزنہ یعنی ماتور ۔
- کت : تخت ہندوی میانہ ہاتھ ۔
- کثیرا : صبح است کثیرا گویند ۔
- کخ : بد آنچ کودکان را ترسانند ؛ ہندوی گھوکھر بہتہ گویند ۔
- کرس البحر : نوعی از صدف ، گونگہ (گھونگا ؟) ۔
- کرک : یعنی گیتہ ۔
- کرگس : اہل ہند کرچہن گویند ۔
- کرفاے : بوق یعنی بھیر ۔
- گردنائے : لتو ۔
- کل : بھول ۔
- کلات : یعنی کوکری ریسبان ۔
- کلفہ : داغ سیاہ کہ در روے افتد ، ہندوئہ چہانہ ۔
- کان کروہ : یعنی غول کہان ۔
- کمین : اہل ہند ذریبہ خوانند ۔
- کمشاب : اہل ہند کشاب گویند ۔
- کنداولہ : کوٹھی ۔
- کور مولش : چھہوندری ۔

- کوکب الارض : یعنی ابر که -
 گوگرد سرخ : و آن تاپاب است و گوشتی هم گویند -
 کبید : درم گزین پادشاه یعنی تنگسالی -
 کپکپون : لبیان -
 کپاه سیر : داروئیست ستارو گویند -
 کیک : بیهو -
 لسان النور : لکرونده (لکرونده) -
 لسان العصفیر : اندر جو -
 لک لک : که آن را ذهینک گویند -
 لویاج : یعنی جوله -
 لوج : سنداسی تعلبدان -
 ماشوره : کوکری -
 مار : سرب که هندوی ناگ تهاگ گویند -
 مار قشپا : داروئیست ؟ هندوی سودرمکھی -
 مام : بلطف پهلوی ماتا را گویند -
 ماوی : سرگ یعنی پشت -
 منچ : منگ -
 مچک : یعنی چیتی -
 محور : یعنی بیان -
 محافه : مانند سجوالی است که بر گردون راست می کنند -
 مرغ عیسی : هندوی باگلی -
 مست : یعنی موته -
 مشکک : موته -
 مکیدن : یعنی جوسیدن -
 ملبخ : که او را تیشر گویند -
 موری : ناودان -
 موز : میوه است شیرین که تخم ندارد ؛ انگور شاهی هم گویند ،
 اهل هند آن را کپله خوانند -

مولو : سکه -

مهار : رهنه که در بینی ستور و شتر می اندازند : هندوی ناتو -

میو : قومی اند در ملک هند قریب دهل -

مین : ماهی و نام برج است -

نار و شک : سنبل و ناگس -

ناز : صنوبر؛ هندوی چیره -

نداف : یعنی پنجاه -

نعم : بودنه -

نوره : چونه -

نوشادر : یعنی سهاگه -

نیلوفر : کتول -

و حل : دلدل -

ودع : کوئه -

هل لبک : یعنی بر رهن نشسته جیو جیوی بل پشکوی
می نوازند -

هن : مهر زری در هند باشد -

اردو کے فقرے اور دہرے آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فارسی تصنیفات سے

(از "اورینٹل کالج میگزین" بابت ماہ اگست ۱۹۳۰ء)

اردو زبان کی قدامت کے سلسلے میں ایک گزشتہ مضمون میں ہم نے اس عہد کی فارسی تصنیفات میں اردو زبان کے الفاظ کے اس ذخیرے پر نظر ڈالی تھی جو فارسی مصنفین نے ضرورتاً ہندوستان میں استعمال کیا ہے۔ ساتھ ہی ہندی زبان کے ان محاورات پر روشنی ڈالی تھی جو بنا بر کثرت استعمال ترجمہ ہو کر فارسی میں چمکے یا چکے ہیں۔ ان الفاظ اور محاورات کا وجود ہمارے خیال میں اردو زبان کی قدامت کا کافی ثبوت ہے، اور یہی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ زبان ان ایام میں عام طور پر مسلمانوں میں بولی جاتی تھی۔ آج ہم اس سلسلے میں خود اردو کے اصل فقرے اور دہرے پیش کرتے ہیں جو ہمیں فارسی مآخذ سے دستیاب ہوئے ہیں۔ اردو کی قدیم تحریری دستاویزوں کی عدم موجودگی میں ان قرون اور اشعار سے ہم اس عہد کی زبان کا اور مسلمانوں میں اس کی وسعت اور شاعری کا کسی قدر اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان اقوام نے ہندوستان میں اپنے لیے ایک زبان مخصوص کر لی ہے اور جوں جوں ان کے مقبوضات فتوحات کے ذریعے سے وسیع تر ہوتے جاتے ہیں، یہ زبان بھی ان کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں پھیلی جاتی ہے۔

ان فقرات اور دھروں کے مطالعے کے لیے ہمارے پاس دو بڑے ذرائع ہیں۔ اولاً ہندوستان کی تاریخیں جن میں بعض اوقات اس قسم کے فقرے ہماری نظر سے گزرتے ہیں۔ ثانیاً مشائخ کے تذکرے اور ان کے ملفوظات۔ ہندوستان میں فن تصوف کی یہ شاخ بہ لحاظ کمیت و مقدار نہایت مالا مال ہے۔ قدما میں تصوف کی اشاعت اور مقبولیت بدرجہ اتم تھی۔ ہر مشہور اور بڑے شیخ کی ملفوظات اس کے مریدوں نے تیار کی ہیں۔ ان ملفوظات میں خود اس شیخ کے اقوال و کردار اور مواظبات کا ذکر کیا گیا ہے۔ بعض نہایت مشہور مشائخ کی کئی کئی ملفوظات موجود ہیں۔ ملفوظاتی ادب کی کثرت و وسعت ہے جہاں بحث کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے، صرف اس قدر اشارہ کافی ہے کہ ہندوستان میں تصوف کی یہ فروغ بے حساب ذخیرے کی حامل ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ شیخ نظام الدین اولیا (متوفی ۷۴۲ھ) کے متعلق متعدد ملفوظات تیار کی گئی ہیں۔ ذیل میں ان میں سے بعض کے نام دیے جاتے ہیں:

- ۱۔ ”فوائد الفوائد“ مرتبہ حسن دہلوی شاعر مشہور۔ یہ ملفوظات ۱۰۰۰ھ سے لے کر ۱۲۲۲ھ تک کے واقعات پر حاوی ہے۔
- ۲۔ ”افضل الفوائد“ جس کو امیر خسرو دہلوی نے ترتیب دیا ہے۔

۳۔ ”انوارالمجالس“ از خواجہ محمد بن بدرالدین اسحاقی۔

۴۔ ”شفق الاہرار“ از خواجہ عزیزالدین صولی۔

۵۔ ”سیر الاولیا“ از سید محمد بن سید مبارک کرمانی۔

اس تالیف میں شیخ نظام الدین کے اعمال و اقوال کے علاوہ ان کے مریدوں اور ان کے سلسلے کے اسلاف کا تفصیلی ذکر ہے۔

یہ فہرست ابھی نامکمل ہے، مزید تفحص و تلاش سے شیخ نظام الدین پر اور تالیفات دریافت ہو سکتی ہیں۔ اس سلسلے کی کتابوں میں بعضی اوقات اردو کے فقرات ہماری نظر سے گزرتے ہیں جن کا وجود ان

تصنیفات میں بظاہر موجب حیرت ہے ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان مافوقیات کی ترتیب و تحفظ میں ارادت و عقیدت کا زبردست ہاتھ کام کر رہا تھا ۔ مافوقیات کے مؤلفین اپنے مرشد کے اقوال و گفتار کو جس طرح اس کی زبان سے افہویں نے سنے ، محفوظ رکھنے کے لیے خواہش مند تھے ۔ یہی عقیدت ہندی ان اشعار و فقرات کے تحفظ کا ، جو گائے گائے ان مشائخ کی زبان سے ادا ہوئے ، موجب بنی ہے ۔ ہندوستان کے صوفی ہر زمانے میں ملکی زبان سے قریبی تعلق رکھتے تھے ۔ وہ ہلا لحاظ مذہب و ملت عام طبقات الناس کے مرجع و مآب تھے اس لیے ملکی زبان سے واقفیت رکھنا ان کے لیے نہایت ضروری تھا ۔ طبقہ صوفیہ کے متعلق یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ ان بزرگوں نے ارباب سب و قلم کے مقابلے میں ابتدا ہی سے اردو یا ملکی زبان کی طرف بہت توجہ کی ہے اور اس زبان میں ادب کو روشناس کرائے والی درحقیقت یہی جماعت ہے ۔

ان فقرات کے سلسلے میں جو بعض حکایات درج ہوں گی ، خرق و کرامت کے عنصر کی بنا پر ان کا انداز ہوالعجائزہ بن گیا ہے ۔ تصوف کی یہ ایک خصوصی شان ہے اور دنیا کے ہر حصے میں جہاں تصوف نے نشو و نما پائی ہے ، یہ خصوصیت ہمیشہ اس کے ساتھ قائم رہی ہے ، مگر ان صفحات سے ہم نے حتی الامکان اس عنصر کو خارج کر دیا ہے اور قہصے کے اسی حصے کو بیان کیا ہے جو ان فقرات سے ضروری تعلق رکھتا ہے ۔

سب سے بیشتر ہم ایک واقعے کا ذکر کرتے ہیں جو ہندی لفظ 'آم' سے تعلق رکھتا ہے ۔ چوتھی صدی کے عرب سیاح اس میوے کو 'انبج' کی شکل میں لکھتے ہیں ، جس سے ظاہر ہے کہ یہ لفظ فارسی سے عربی میں پہنچا ہے کیوں کہ فارسی میں انبہ ہے ۔ عربی میں ایسی 'ہے' 'جیم' سے بدل جاتی ہے ۔ فارسی کا 'انبہ' پنجابی 'انب' سے ماخوذ ہے اور عامے معنی آخر میں محض اظہار حرکت کے لیے اضافہ کر دی گئی ہے۔ فارسی میں اس میوے کا دوسرا نام 'لمزک' ہے جس کی وجہ تسمیہ جیسا کہ ذیل ہے :

سلطان شمس الدین التتمش (متوفی ۷۴۳ھ) اپنے عہد سلطنت میں ایک مرتبہ ہداویں گیا۔ وہاں کے آم نہایت خوش ذائقہ اور لذیذ ہوئے ہیں۔ بادشاہ کے لیے یہ آم بطور تحفہ لائے گئے۔ التتمش نے کچھ آم کھائے اور انہیں بہت پسند کیا۔ پوچھا اس میوے کا کیا نام ہے؟ لوگوں نے عرض کی 'آم'۔ چون کہ ترکی زبان میں آم ایک مکروہ حبہ جسم کا نام ہے اس لیے سلطان نے کہا کہ اس کا نام 'نمزک' رکھنا چاہیے۔ چنانچہ اس کا نام بعد میں نمزک ہو گیا۔ امیر خسرو :

نمزک خوش میوہ ہندوستان

یہ حکایت 'فوائد الفواد' میں بالفاظ ذیل درج ہے :

"از آن سلطان شمس الدین فرمود کہ او وقتی در ہداویں آمد ، نمزکے چند پیش او آوردند و آنجا نمزک نیک شیریں باشد۔ چون ضرورت گفت این را چہ گویند ؟ گفتند این را 'آم' گویند ؛ مگر بزبان ترکی آم چیزے قبیحے را گویند ، سلطان فرمود این را نمزک باید گفت ، چون این نام بر لفظ مبارک او رفت ہمیں نام شد۔"

(فوائد الفواد ، صفحہ ۲۲۵ فخر المطابع ، دہلی)

ناظرین مسجد گلے ہوں گے کہ اس حکایت کے راوی شیخ نظام الدین اولیا ہیں۔

دہلی میں آباد ہونے کے بعد سب سے پہلا جگہ جو مسلمانوں میں پیدا ہوتا ہے وہ شیخ حمید الدین صوفی ناگپور ہیں۔ اخبارالآخبار میں یہ بیان خود شیخ کے اپنے الفاظ میں مذکور ہے :

"اول مولودیکہ بعد از فتح دہلی در خانہ مسلمانان آمد ، من۔"

(اخبارالآخبار ، صفحہ ۱۳۵)

شیخ حمید الدین شیخ معین الدین چشتی کے مرید ہیں۔ ان کا اکثر حصہ عمر ناگپور میں یہ حالت فقر و افلاس بسر ہوا اور ۷۶۳ھ میں وہیں وفات پائی۔ ان کے مزار پر سنگ زود کی ایک عالی شان عمارت اب تک موجود ہے۔

شیخ باجن اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں کہ شیخ کے فرزند جو فاقوں کی کثرت سے نہایت لاغر و ناتواں ہو گئے تھے ، بھوک کی تاب نہ لا کر شیخ کی غلست میں کشائش رزق کے واسطے دعا کی خاطر حاضر ہوئے۔ شیخ کے پاس پہنچنے تک کمزوری کی وجہ سے ان کو تنگے آنے لگے ، آخر ایک جگہ گر گئے ۔ شیخ حمید الدین حسب معمول آنکھ بند کئے ہاد حق میں مشغول تھے ۔ گرنے کی آواز سے آنکھ کھول دیتے ہیں اور فرزند سے گرنے کا سبب پوچھتے ہیں ۔ وہ عرض کرتے ہیں کہ تنگات کے سبب سے میں گر گیا تھا ۔ شیخ ان کا مطلب سمجھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں :

”ہاں بابا کچھ کچھ“۔

جس سے یہ مطلب تھا کہ تم کو آئندہ کسی قدر فلاح نصیب ہو گی ۔

سرود و شعر کے سلسلے میں شیخ احمد نبروتی کا نام قابل ذکر ہے ۔ یہ ذات کے جولاہے اپنے ہم مشرب و ہم پیشہ شاہ کبیر سے دوسری اقدم ہیں ۔ ”اخبارالانخبار“ میں ان کو قاضی حمید الدین ناگوری کا مرید مانا گیا ہے اور یہ قصہ درج ہے کہ ایک روز قاضی حمید الدین شیخ احمد کے مکان پر گئے ، دیکھا کہ شیخ کھڑا بننے میں مصروف ہیں ۔ قاضی نے ملاحت کے لہجے میں کہا ”احمد ! تم کب تک اس پیشے کے بیچھے پڑے رہو گے ؟“ قاضی یہ فقرہ کہہ کر چلے بنے ۔ ادھر شیخ احمد ایک کھوٹی کے ٹھونکنے کے لیے جو ڈھیل ہو گئی تھی اٹھے ؛ بدقسمتی سے ان کا ہاتھ پھسلا اور گرے ، ہاتھ کھوٹی پر پڑا اور ٹوٹ گیا ۔ شیخ احمد نے اس وقت ہندی زبان میں کچھ الفاظ کہے جن کا مطلب تھا کہ اس بوڑھے نے میرا ہاتھ توڑ ڈالا :

”شیخ احمد بزبان ہندی گفت ایں ہر یعنی قاضی حمید الدین دست من بشکست ۔“ (اخبارالانخبار، صفحہ ۵۶ ، ۵۷)

اس کے بعد شیخ احمد نے اپنا پیشہ ترک کر دیا ، لیکن شیخ احمد کے متعلق ایک قدیم روایت ہے جو فوائد الفوائد میں

درج ہے ، معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیخ قطب الدین بختیار کاکی (متوفی ۷۶۳ھ) کے معاصر ہیں اور اس مجلس میں حاضر تھے جس میں شیخ قطب الدین کا یہ حالت سیاح انتقال ہوا ہے ۔ یہ امر محقق نہیں کہ وہ کس کے مرید ہیں ؛ البتہ ان کو یہ نعمت ، فقیر مادھو امام جامع مسجد اجمیر سے ملی ہے ۔ شیخ احمد جو ان کے زمانے میں خوش صوت تھے اور ہندی سرود کا ان کو بڑا چسکا تھا ، ایک روز فقیر مادھو نے انہیں ہندوی گانے سنا ، کہنے لگے ”افسوس ہے کہ ایسی اچھی آواز کو ہندوی نغمات میں برباد کرتے ہو ، قرآن کہوں نہیں حفظ کرتے؟“ شیخ احمد نے اس کے بعد قرآن یاد کر لیا ۔ ’نوائدالغواد‘ کی اصل عبارت یہ ہے :

”چنین گویند کہ او نعمت از فقیر مادھو یافتہ بود و این فقیر مادھو امام جامع مسجد اجمیر بود ۔ روزے شیخ احمد نہروانی ہندوی میگفت ؛ در اوان جوانی آواز خوب داشت ، ہندویا خوش گفتے ۔ چون فقیر مادھو شنید گفت چنین آوازے کہ تو داری دریغ باشد کہ در سرود ہندی خرج کنی ۔ فقیر مادھو گفت کہ قرآن یاد کن ۔ شیخ احمد قرآن یاد گرفت ۔“

(صفحہ ۱۸۷ ، نوائدالغواد ، نغزاللطایع ۱۲۷۲ھ)

اس حکایت سے واضح ہوتا ہے کہ ۷۶۳ھ کے قریب مسلمانوں کا ہندی موسیقی سے تعلق قائم تھا ۔

شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر پنجاب کے مشہور و معروف شیخ ہیں ۔ ان کے جد امجد کابل کے شاہی خاندان سے علاقت رکھتے تھے ۔ ۷۶۱ھ میں یہ زمانہ فترت مغول ان کو ترک وطن کرنا پڑا اور ہندوستان میں ہجرت کر آئے ۔ کچھ عرصہ قصور میں قیام کیا ، زان بعد وہ کھنڈوال کے قاضی بنا دیے گئے ۔ شیخ فرید الدین اسی قصبے میں پیدا ہوئے ، ملتان میں تعلیم پائی ، علمی نصاب ختم کرنے کے بعد ایک عرصے تک ممالک اسلام میں سیاحت کرتے رہے ۔ ہندوستان واپس آنے پر شیخ قطب الدین بختیار کاکی (متوفی ۷۶۳ھ) کے دست مبارک پر

بیعت کی؟ بعد میں ہانسی چلے آئے اور کچھ عرصے کے بعد قصیدہ اجودہن (ہاک پٹن) میں آکر مستقل قیام پزیر ہو گئے اور ۱۹۶۸ء میں اسی مقام پر وفات پائی۔

نقل ہے کہ ایک مرتبہ شیخ فرید الدین اپنے مرشد شیخ قطب الدین کو وضو کرا رہے تھے؛ آپ کی آنکھ دکھنے آئی تھی، اس لیے اس پر ہٹی باندھ رکھی تھی۔ وضو کرتے کرتے یکایک شیخ قطب الدین کی نگاہ آپ کے چہرے پر پڑی؛ دیکھا ہٹی بندھی ہے؛ صہب دریافت کیا۔ آپ نے ہندی زبان میں عرض کی ”آنکھ آئی ہے۔“ شیخ قطب الدین نے فرمایا ”اگر آنکھ آئی ہے اپنی را چرا ہستہ اید؟“

(جواہر فریدی، صفحہ ۲۰۸، وکتوریہ پریس، لاہور ۱۳۰۱ھ)

ایک موقع پر شیخ فرید الدین سرسے میں منیم تھے اور اکثر اوقات شیخ عبدالشکور کے مزار پر تشریف لے جاتے تھے۔ قصے کے بعض لوگ اس امر کے ٹھیس کے لیے کہ شیخ اس مزار پر جا کر کیا کرتے ہیں، ایک دن گہات میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ شیخ فرید کاڑ گئے اور آپ نے سرسے کے حق میں یہ قعرہ کہا:

”سرسہ کبھی سرسہ کبھی ترسہ۔“ (جواہر الفریدی، صفحہ ۲۵۵)

شیخ فرید الدین کے مرید شیخ جلال الدین ہانسیوی نے ۱۹۵۹ء میں وفات پائی۔ ان کے فرزند شیخ برہان الدین اس وقت خورد سال تھے۔ مرحوم کی ملازمہ مادر مومنات شیخ مرحوم کی وصیت کے مطابق شیخ زادہ برہان الدین کو لے کر شیخ فرید کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ شیخ نے بڑے تہاک سے ان کا غیر مقسم کپا اور شیخ زایدے کو اپنی دیمت میں لے لیا۔ کچھ دن اپنی خدمت میں رکھا اور خدمت کے وقت مرحوم جلال الدین کے تمام تحائف یعنی مصالک وغصا وغیرہ شیخ زادے کے حوالے کر دیے اور فرمایا کہ جس طرح جلال الدین ہماری طرف سے بجا کرتے تھے ہم بھی بجا کر دو۔ اس موقع پر مادر مومنات نے جو ساتھ تھیں، عرض کی ”خواجہ برہان الدین بالا ہے“ یعنی ابھی بچے ہیں۔ شیخ فرید الدین نے ہندی میں جواب دہے ہوئے فرمایا ”مادر مومنات! بیویوں کا چاند

بھی بالا ہوتا ہے۔“ یعنی جودھویں کا چاند بچہ نہیں ہوتا۔ اس میں اشارہ ہے شیخ زادہ برہان الدین کی عمر کی طرف۔ یہ حکایت ’سیرالاولیاء‘ سے ماخوذ ہے جس کی اصل عبارت حسب ذیل ہے :

”چوں شیخ جمال الدین قتل کو در مادر مومنان کہ خادیم شیخ جمال الدین بود رحمة اللہ علیہا مصلیٰ و عصاء شیخ جمال الدین کہ از شیخ شیوخ العالم یافتہ بود و مولانا برہان الدین صوفی پسر خورد شیخ جمال الدین کہ پدر شیخ قطب الدین مشور بود و در عالم صغر بود یہ خدمت شیخ شیوخ العالم برد۔ شیخ شیوخ العالم بہ مرحمت مولانا برہان الدین مذکور را تعظیم و تکریم بخودہ بشرف ارادت و بیعت خود مشرف گردانید و چند روز بر خود داشت و بوقت مراجعت خلایف نامہ و آن مصلیٰ و عصا ہا نعتی کہ مولانا شیخ جمال الدین روانہ کردہ بود بہ مولانا برہان الدین صوفی بخشید و فرمود چنان کہ جمال الدین از جہت ما مجاز بود تو ہم مجازی و این ہم فرمود باید کہ چند گیسے در صحبت مولانا نظام الدین یاضی یعنی سلطان المشائخ۔ دریں محل مادر مومنان خدمت شیخ شیوخ العالم عرضداشت کرد بزبان ہندوی کہ ”خوجہ برہان الدین بالا ہے“ یعنی خورد است، این ہار گراں را طاقت نتواند آورد۔ شیخ شیوخ العالم قدس سرہ العزیز فرمود بزبان ہندوی کہ ”مادر مومنان! ہونیوں کا چاند بھی بالا ہوتا ہے“ یعنی ماہ شب چہار دہم در اول شب خورد می باشد کہ بتدریج بکمال می رسد۔“

(سیرالاولیاء، صفحہ ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، مطبع محب ہند، دہلی)

شیخ علاؤ الدین علی احمد صابری کو شیخ فرید الدین نے قصبہ کلیر میں قیام کرنے کا حکم دیا، لیکن شیخ علاؤ الدین اس قصبے کے لوگوں کے ہاتھوں نالایق تھے اور شیخ کی خدمت میں اہل کلیر کی متواتر شکایت کیا کرتے اور شیخ برابر ان کو برداشت و تحمل کی مشاہت کرتے۔ بالآخر جب شکایات کا سلسلہ بند نہیں ہوا، شیخ فرید نے انہیں لکھ بھیجا کہ کلیر تمہارے قبضے میں ہے :

”خواہ کھوہ کھاہ خواہ دوہ کھاہ“

یعنی خواہ یہ جبر و اکراہ اس سے تقع الٹاؤ یا بلطف و مرحمت -

ایک مرتبہ ایک عورت شیخ فرید الدین کی خدمت میں حاضر ہوئی اور سوال کیا کہ میرے کتنے لڑکے ہوں گے؟ آپ نے جواب دیا :

”ایک دو تین چار پنج چھ ہفت -“

(جواہر فریدی ، صفحہ ۲۶۰ ، وکتوریہ پریس ، لاہور)

یہ روایت شیخ بدرالدین معلوم ہوتا ہے کہ شیخ فرید الدین اکثر اوقات لوگوں کو ’ہیہا‘ کے لفظ سے مخاطب کرتے تھے -

(اردوی قدیم تاج نمبر ۲۱)

ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک موقع پر کسی سوال کے جواب میں شیخ نے فرمایا ”بیچ سر کے“ اور یہ آید کریمہ پڑھی:

و تلک الامثال نضرہا للناس وما یعقلہا الا العالمون^۱

(اردوی قدیم ، صفحہ ۲۱)

شیخ ہاجن نے آپ کا ایک ہندی دودھ اپنی تصنیف میں نقل کیا ہے - وهو هذا :

مائیں سیوت گل (گہل) کئی ماس نرہا دیہ

تب لک مائیں سیوساں جب لک ہوسوں کچھ

’جواہر فریدی‘ سے ایک اور دودھ درج کیا جاتا ہے :

فریدا دھر سولی پنجرہ تیلیاں تھوکن کاگ

رب اجیوں باہورے تو دھن ہارے ہواگ

(صفحہ ۱۸۷)

شیخ فرید الدین کی طرف ایک ریختہ بھی منسوب ہے ، جس کا ہتا ہم کو دو مختلف ریاضوں سے ملتا ہے - پہلی ریاض دستہ لائبریری جہار کی ملوک ہے ، دوسری ریاض راقم العروف کی ملک ہے - وہ ریختہ یہ ہے:

وقت سحر وقت مناجات ہے

خیز در آن وقت کہ برکات ہے

۱ - آیت نمبر ۴۴ سورۃ عنکبوت (مرتب)

نفس مہاذا کہہ بگوید ترا
 غیب چہ غیزی کہ ابھی رات ہے
 بادم خود عمرہ اصرار ہاش
 صحبت اصرار ہری بات ہے
 باتن تنہا چہ روی زمین جہاں
 نیک عمل کن کہ وہی سات ہے
 ہند شکر گنج بجان گوش کن
 ضائع مکن عمر کہ ہیبت ہے

شیخ فرید الدین گنج شکر کی طرف اور بھی متفرق دوہرے اور نظمیں بہ زبان ہندی و پنجابی منسوب ہیں۔ مگر ایک امر موجب اثناء ہے یعنی انہی کی اولاد اور سجادہ نشینوں میں دسویں صدی ہجری میں حضرت دیوان ابراہیم (متوفی ۹۹۰ھ) گزرے ہیں جن کو ثانی فرید و ثالث فرید بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بزرگ بھی فرید تخلص کرتے ہیں، اس لیے ہمارے لیے یہ معلوم کرنا بالفعل دشوار ہے کہ یہ کلام آیا فرید اول سے تعلق رکھتا ہے یا فرید ثانی سے۔ سکھوں کے گرو تھ صاحب میں جو مجموعہ کلام ہے وہ فرید ثانی کا مانا جاتا ہے۔

شیخ بہاء الدین ذکر کیا نے ایک مقام حضرت گنج شکر کی خدمت میں بھیجا تھا جس میں آپ کو 'چندرہ' کے خطاب سے یاد کیا تھا۔ (سراج السالکین یعنی ملفوظات مخدوم جہانیاں، قلمی)۔

شیخ شرف الدین بو علی المنذر (متوفی ۷۴۳ھ) فارسی کے علاوہ ہندی زبان میں بھی اشعار کہتے تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاء کے دوہرے کے جواب میں انہوں نے یہ دوہرہ لکھا تھا :

ساہرے نہ مانیوں پیو کے نہیں تہانو
 کنبہ نہ بوجھی بات اوی دھنی سہاگن تانو

(مجمع الاولیاء، قلمی، ورق ۲۷۷ ب)

ذیل کا دوہرہ مع شعر فارسی انہوں نے مبارز خاں کے نام بھیجا تھا

جن سکڑے جائیں گے اور لہن مرئیں گے رونے
بدھنا ایسی رہن کر بھور کدھی نہ ہونے

من شنیدم یار من فردا رود راہ شتاب
یا الہی تا قیامت بر نیاید آفتاب

(دیباچہ فرہنگ آصفیہ)

شیخ نظام الدین اولیاء ہندی موسیقی سے بے حد شغف رکھتے تھے اور پوری راک کے ٹو گویا عاشق تھے۔ صاحب 'کتاب چشتیہ' کا قول ہے :
"سلطان الاولیاء را بردہ پوری خوش آمدے ... میفرمودند کہ ما
بر شہدیم و پوری میر نشد۔" (ورق ۶۷ - کتاب چشتیہ ، ثلثی)

نوال ایک روز مولانا وجیہ الدین کی جگری "بنیان بیاجی ایسا
سکھ میں ہاسوں" بزم سرود میں گارھا تھا ، سلطان الاولیاء کو اس
جگری پر حال آگیا۔ صاحب 'سیر الاولیاء' کے الفاظ ہیں :

"نوال جگری از مولانا وجیہ الدین بصرے مرق میخواند و غالب
ظن من آست کہ این جگری بود 'بنیان بیاجی ایسا سکھ میں ہاسوں'
حضرت سلطان المثنیٰ را این ہندوی اثر کرد۔"

(سیر الاولیاء ، صفحہ ۵۱۲)

امیر خسرو کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کے ہندی اشعار کی
تعداد ان کے فارسی کلام سے بہت زیادہ ہے ، لیکن میں خیال کرتا ہوں
کہ یہ بیان مبالغی سے خالی نہیں ؛ لہذا الکمال کے دیباچے میں خود
امیر خسرو فرماتے ہیں :

"جزوے چند نظم ہندوی نذر دوستان کردہ شدہ است۔"
(صفحہ ۶۶ ، قصیدہ ، دہلی)

جس کا مطلب ہے کہ ہندی نظم میں چند جزو دوستوں کے لیے
شائع ہوئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کے ہندی کلام کی تعداد
چند جزو سے زائد نہیں ہے۔ اس ذہل میں ان کے دوہرے ، دو سطریے ،
چستان ، مکرئیاں ، اور ریختے شامل ہیں اور چوں کہ یہ چیزیں

عام طور پر مشہور ہیں اس لیے میں ان کے نقل کرنے سے امتراز کرتا ہوں۔
 علاوہ ازیں امیر خسرو نے ملک غازی (جو بعد میں غیاث الدین
 تغلق ۵۷۴ء - ۵۷۵ء کے نام سے تخت دہلی پر بیٹھا ہے) اور خسرو خان
 بہک حرام کی جنگ کے حالات بہ زبان پنجابی لکھے ہیں۔ ایسی رزمیہ
 نظمیں 'وار' کہلاتی ہیں۔ یہ نظم حضرت امیر نے غیاث الدین اور اس
 کے درباریوں کے سامنے سنائی ہے۔ مشہور مؤرخ سجان رائے اس واقعے
 کے ذکر میں لکھتا ہے :

"بعد ازاں غازی الملک در کوشک ہزار ستون رسیدہ بہ تعزیت
 سلطان قطب الدین و برادرانش گریہ و زاری نمودہ قاصدہ خواند ، چنان چہ
 امیر خسرو بہ زبان پنجاب بہ عبارات مرعوبہ مقدمہ جنگ غازی الملک
 تغلق شاہ و ناصر الدین خسرو خان گفتہ کہ آنرا بہ زبان ہند 'وار'
 گویند۔" (خلاصۃ التواریخ ، صفحہ ۲۳۵ ، جے اینڈ سنز ، دہلی)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم سجان رائے کے عہد تک باقی تھی اور
 ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوگا اگر آج بھی کہیں موجود ہو۔ خسرو نے
 ہندی الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا ہے ؛ بعض موقعوں پر ہندی
 انعام بھی ان کے اشعار میں ملتے ہیں ، مثلاً :

منکہ بر سر بھی نہادم کل تویرہ بر نہاد و گلنا چل !
 (منتخب التواریخ ، ہدایوں ، صفحہ ۲۶ ، نولکشور)

از چل چل تو کل من زار شد کچل
 من خود بھی چلم تو اگر می چلی بہ چل
 (رسالہ عبدالواسع صفحہ ۲۶ مسیح الزمان)

اس موقع پر ایک تاریخی واقعے کا ذکر کیا جاتا ہے جو فیروز شاہ
 تغلق (۵۵۲ء و ۵۹۰ء) کے ایک ناکام حملہ سندھ سے تعلق رکھتا ہے۔
 سلطان بہ بن تغلق (۵۷۵ء و ۵۵۲ء) ٹوٹھے پر حملے کے موقع پر چند

و۔ ملتان زبان کے مصدر چلنا بہ معنی چلنا کا امر ہے ؛ اردو کے
 محاورے 'ہلنا چلنا' میں بھی مصدر موجود ہے۔

ہوم سرپس رہ کر وفات پاتا ہے۔ اس کا جانشین فیروز شاہ تغلق شاہ مرحوم کی آخری آرزو پر لانے کے خیال سے کچھ عرصے کے بعد سندھ پر از سر نو حملہ کرتا ہے۔ اس حملے میں اس کے ساتھ نوے ہزار سوار اور ہانسو ہاتھی تھے۔ ٹھٹھے پہنچنے پر غلے کی رسد بند ہو جانے سے شاہی لشکر میں قحط نمودار ہو گیا۔ ادھر لشکر کے گھوڑوں میں وبا پھیل گئی۔ فیروز شاہ بغیر کوئی فیصلہ کن جنگ کیے براہِ ریگستان گجرات کی طرف لوٹ گیا۔ اہل ٹھٹھہ جو دو مرتبہ دہلی کے لشکر سے بال بال بچ گئے تھے، اس واقعے کو اپنی سوزمیں کے شیخؑ کی کرامت کی طرف منسوب کرنے اور ذہل کا ہندی جملہ ان کے ہاں ضرب المثل بن گیا :

”برکت شیخ پلھا اک موا اک ٹھا“

(تاریخ فیروز شاہی، من شمس سراج، عقیقہ ص ۲۳۱)

شیخ اخی سراج پروانہ شیخ نظام الدین اولیا کے مرید تھے؛ وہ اپنے مرشد کے حکم سے ہنگالے چلے گئے مگر نظام العشائخ کے انتقال پر واپس دہلی آ گئے اور شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی (متوفی ۷۵۵ھ) کے مرید بن گئے۔ جب کمال حاصل ہو گیا چراغ دہلی نے انہیں پھر ہنگالے جانے کا حکم دیا۔ اخی سراج نے عرض کی کہ وہاں شیخ علاؤ الدین قل چلے سے موجود ہیں اور تمام ہنگالے میں مقبول ہیں اس لیے میرا قیام وہاں مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ مورخ فرشتہ کا بیان ہے :

”شیخ بہ زبان ہندی فرمود، تم اوپر وے تل، یعنی تو پالائی و او زیر“۔ (صفحہ ۳۹۹، تاریخ فرشتہ، نولکشور)

شیخ اخی سراج ان الفاظ سے اپنی کلمبائی کی ٹیک فال سمجھ کر پروانہ ہو گئے۔

۱۔ اصل نام شیخ حسین، عوام میں شیخ پلھا کے نام سے معروف تھے؛ ۶۰۹ھ میں فوت ہوئے۔ مزار ٹھٹھے کے قریب ہے (مرتب)

یہاں شیخ شرف الدین احمد پھولی میری (متوفی ۱۷۸۲ء) کے ایک کچ مندرے سے دو دوہرے نقل کیے جاتے ہیں۔ یہ شرف تخلص کرتے ہیں :

کالا ہنسا نرملہ ہے سمندر تیر
ہنکے ہمارے ہنکے ہرے نرمل کرے مرہر

درد رہے نہ پیڑ

شرف حرف مایل کہیں درد کچھونہ بساے
گرد چھوہیں دربارگی سو درد دور ہو جاے
(از ریاضی مملوکہ مولوی محبوب عالم اڈیٹر پستہ اخبار)
شیخ زین الدین خلد آبادی (متوفی ۱۷۷۵ء) کا ذکر ہے کہ جب ان کا زمانہ وصال قریب آیا ، مریدوں نے ان سے اپنا جانشین مقرر کرنے کے لیے درخواست کی ! شیخ نے منہ پھیر لیا اور کہا :

”منجہ مت بلاوو“ یعنی مجھے نہ چھیڑو

(ذکن میں اردو ، صفحہ ۱۰۱)

شیخ صدرالدین کلیم ، شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کے مرید اور کتاب ’صحائف السلوک‘ کے مصنف ہیں۔ اس میں ذہل کا دوہرہ مرقوم ہے :

سب سے سود نگر اوہے ہاتھ بکسے
جس ہوں لوڑوں نہ لبوں او جہر میری چاہی

(صحائف السلوک ، صفحہ ۱۶۲ ، مسلم پریس ، جھجھر)

اسی تصنیف میں ایک جوگی کا قول درج ہے :

”دھندھا لوک بجائے اندھا“ (صفحہ ۱۷۷)

اور فارسی کا شعر :

در چشم در آرمست بسپوشم دیدہ
بے من نگریم بغیر نے ترا بگزارد

نقل کرنے کے بعد مصنف لکھتا ہے :

بکے ہندوئے ہم خوش گشتہ است :

دوہرہ

نہں بہتر باہ کر آنکھیں بیچ دھڑلوں

ناں ہوں دیکھوں اور دھڑا تہبہ دیکھن دون

(صفحہ ۱۸۱ ، صحائف السلوک)

اردو کا کلمہ 'کھڑا کھڑی' تاریخ میں ایک مرتبہ بنگالیوں ، یورپیوں اور دلی والوں کی تفریق و شناخت کے لیے استعمال ہوا ہے ۔ بہت سے بے گناہ جو اس کلمے کو صحیح طریق پر ادا نہیں کر سکے تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے :

سلطان فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۲ء ، ۱۳۹۰ء) اپنے عہد سلطنت میں غلاموں کے جمع کرنے کا از حد شائق تھا ۔ وہ انہیں خریدنے کے علاوہ تحفہ تحائف میں بھی قبول کرنا ۔ اس کے عہدے دار شاہی اشتیاق سے واقف ہو کر اکثر اوقات غلام نذرانے میں پیش کرتے ؟ بادشاہ ان کی تعلیم و تربیت میں بے حد دلچسپی لیتا ، اور پھر سلطنت کے دفتروں میں ان کو جگہ دیتا ؟ حتیٰ کہ فیروز شاہ کی وفات کے وقت ان کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار سے تجاوز کر گئی تھی اور ملک میں ان کا رسوخ اور اقتدار بہت بڑھ گیا تھا ۔ فیروز شاہ کے جانشینوں کے زمانے میں یہ جماعت ملکی سیاسیات پر کامل طور پر قابض تھی ۔ بادشاہوں کا متواتر عزل و نصب اور ملک میں عام فتنہ و شورش کا سلسلہ جو کئی سال تک جاری رہا ، زیادہ تر اسی گروہ کے غلطیے اور تسلط کا نتیجہ تھا ۔ ناصر الدین محمد شاہ جس کو خود فیروز شاہ نے اپنے زمانہ حیات یعنی ۱۳۸۹ء میں بادشاہ تسلیم کر لیا تھا ، اس جماعت کی مخالفت کی بنا پر اپنا تخت کھو دیتا ہے لیکن جب ۱۳۹۲ء میں دوبارہ تخت پر قابض ہو جاتا ہے تو سب سے پہلے اس جماعت کے اجتماع کی فکر کرتا ہے ۔ وہ ایک فرمان کی رو سے ہاہے تخت دہلی سے ان کا اخراج لازمی قرار دیتا ہے ، اور شہر خالی کرنے کے لیے تین ہوم کی سہلت مقرر کرتا ہے ۔ یہ صورت عدم تعمیل سزائے قتل و ضبطی اسلاک

کا مستوجب ٹھہراتا ہے۔ اس فرمان کے شائع ہونے پر اکثر غلام شہر سے نکل گئے، تاہم ایک بڑی تعداد وجود رہی۔ یہاں یہ ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان غلاموں کی اکثریت ہندوستان کے مشرقی صوبوں یعنی بنگالہ اور بھوپ سے تعلق رکھتی تھی۔ محمد شاہ نے یہ دیکھ کر کہ اس کے حکم کی قراو واقعی تعمیل نہیں ہوئی ہے، اس گروہ کی گرفتاری کا فرمان شائع کیا۔ جب یہ لوگ پکڑے گئے انہوں نے اپنی بے گناہی کے اظہار میں یہ بیان دیا کہ ہم اسیل یعنی دہلی کے باشندے ہیں اور شاہی ملازموں سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔

ناصر الدین شاہ نے ان کے بیانات کی صداقت کا امتحان لینے کے لیے یہ طریقہ نکالا کہ قیدیوں میں سے ایک ایک کو اپنے سامنے بلاتا اور کلمہ 'کھڑا کھڑی' کہلاتا؛ اگر قیدی یہ لفظ دہلویوں کے لہجے کے مطابق ادا کر دیتا، آزاد ہو جاتا، ورنہ جلاد کے سپرد کر دیا جاتا۔ اس داروگیر میں متعدد بے گناہوں کی جانیں ضائع ہوئیں، خصوصاً ان اسیل بنگالیوں کی جو ضرورتاً دہلی میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ اس موقع پر فرشتہ کی اصل عبارت نقل کر دی جاتی ہے :

”ناصر الدین شاہ فرمود کہ از غلامان فیروز شاہی ہر کہ زیادہ برسہ روز در شہر بمائد جان و مالش سبیل باشد۔ پس بیشترے از ایشان درین سہ روز از شہر بدر رفتند و آنها کہ نرفتند بقتل افتادہ بقتل رسیدند و بعضے از ترس جان میگفتند کہ ما اسیلیم۔ ناصر الدین شاہ فرمود کہ ہر کہ از شاہ 'کھڑا کھڑی' بگوید اسیل است و چون بطوریکہ پادشاہ میخواستند نمی توانستند نمود و بزبان بھوپ و بنگالہ ادا میکردند کشتہ می شدند چنانکہ بسیاری از مردم بھوپ کہ اسیل بودند و زبان ایشان نمی گشت نیز بقتل رسیدند۔“ (تاریخ فرشتہ، صفحہ ۱۵۳)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشرق صوبوں کے باشندے ہندی 'کھ' اور 'ڑ' کا تلفظ دہلویوں کے مقابلے میں تکلف سے ادا کرتے ہیں۔ 'کھڑا کھڑی' اگرچہ اس قسم کی روشنی میں جلاد کی تلوار اور انسانی

قتل کے شکنجے سے کم خون خوار ثابت نہیں ہوتا لیکن اس سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ان ایام میں اردو زبان دہلی شہر اور شاہی دربار میں برابر بولی جاتی تھی ۔

کتاب 'عشق نامہ' عبداللہ بن عبدالرحمان مرید حضرت سید بہار گیسو دواڑ کی تصنیف ہے ، اس میں فقرۂ آہندہ مصنف نے اپنے مرشد کی طرف منسوب کیا ہے :

"بہو کون مومے سوں خدا کجہ ایڑتا" ہے ۔ خدا کون انیڑنے کی استعداد ہو رہے ۔" (اردو قدیم ، تاج نمبر ۲۲)

محمود بن سعید امروہی کی 'لحنۃ المجالس' کے ایک اقتباس سے جو 'اخبار الاخبار' میں منقول ہے ، معلوم ہوتا ہے کہ شیخ احمد کھٹو (متوفی ۹۰۸ھ) اپنے مرشد شیخ اسحاق مغربی کو 'بابا جیو' اور 'بابو جیو' کے الفاظ سے یاد کرتے تھے ۔

شیخ احمد عبدالحق (متوفی ۸۴۷ھ) نصیبہ ردول ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے اور شیخ جلال الدین ہانی پتی کے مرید ہیں ۔ ان کے بعض دوسرے شیخ عبدالقدوس گنگوہی (متوفی ۹۳۲ھ) نے اپنی تصنیفات 'رشد نامہ' اور 'انوار العیون' میں نقل کیے ہیں ؛ ان میں سے دو دوسرے یہاں فوج کیے جاتے ہیں :

کتواں ہوئی تو ہائوں سمند کہ ہائیں جاے

بازا ہوئی تو برجوں چہیل کہ برج جاے

(انوار العیون ، صفحہ ۴۴)

۱ ۔ حکیم شمس اللہ قادری صاحب اپنی تصنیف 'اردو قدیم' میں 'انیڑنا' کے معنی پکڑنا تحریر فرمائے ہیں ، لیکن مولانا عبدالحق مرحوم کی مرتبہ 'سب رس' کی فرہنگ الفاظ میں انیڑنا = پہنچنا ، دیا ہوا ہے اور یہی قرین قیاس ہے ۔ 'پہنچنا' کے معنی میں قریباً یہی لفظ پنجابی زبان میں آج بھی استعمال ہوتا ہے ۔ (مرتب)

ایک گائیں سیٹھا سو جو لکھن بجای
جو اس میں نہ ٹاٹھے نس مانتھن لکھن جای

(رشد نامہ قلمی)

’فرہنگ ہر الفضائل‘ میں جو محمد بن قوام کڑی شارح ’تخزن اسرار‘
نے ۵۸۳ء میں تالیف کی ہے ، ’اسم اللہ‘ کا ترجمہ ’خدا کا نام‘ ’ایک‘ کا
’ایک دیکھی‘ اور ’ترجم‘ کا ترجمہ ’بکھان کرئیں‘ دیا ہے ۔ اس کتاب
میں ایک موقع پر ذیل کا شعر ہندی ملتا ہے :

دیکھ دیکھ یہ ہر گھر جاوے
نس نس نیسو نید نہ آوے

جہاں میں شیخ پیارے کے بعض ہندی اشعار درج کرتا ہوں ،
یہ بزرگ شیخ عارف بن عبدالحق (متوفی ۵۸۵ء) کے مرید ہیں :

پت ہونے بد جانتوں ڈھک جیون تیرا
سائیں نہیں نول کی پرا دیکھ کتب گھنیرا
ایکو کام نہ آوسی جب ہرسی ہرا
چھوڈ پاتا سائیاں تون جانھن کیرا

(رشد نامہ قلمی)

’اخبار الاخبار‘ اور ’خزینۃ الامنیاء‘ میں شیخ پیارے کو سید پداتھ
کا مرید بتایا ہے اور سال وفات ۵۸۶ء دیا ہے ، لیکن شیخ کے اشعار آہندہ
ہے ثابت ہوتا ہے کہ وہ احمد عبدالحق کے سلسلے کے مرید ہیں :

محمد جگ کے چمنبھے نا کوی
احمد ہم گنوائیا کہو کیوں پہوجا ہوی
محمد پھول اتاد کا پھل بھسی آپیں سوی
سو کیوں جانیں یا براجن نہن چاکھیا ہوے
محمد عارف ہو رہا عارف احمد سوی
اکتہ کنھا یہ لدھن کی ہرلا ہوجھے کوی

(رشد نامہ)

یہاں اشارہ ہے شیخ احمد عبدالعزیز (متوفی ۱۲۸۵ھ) ، ان کے فرزند شیخ عارف (متوفی ۱۲۵۹ھ) اور ان کے فرزند محمد کی طرف جو لدھی بھی کہلاتے تھے ۔

شیخ لطیف شیخ نظام الدین اولیا کے مرید ہیں ؛ ان کے فرزند شیخ یحییٰ گجراتی مشہور شیخ عزیز اللہ منوگل کے والد ہیں ۔ گجرات میں بقول شیخ یاجن شیخ یحییٰ کی نسبت یہ ضرب المثل مشہور تھی :

”وقت شیخ یحییٰ جیسا بڑے تیسرا ہے ، اپنی پٹن کسی نکمے“۔

سید برہان الدین عبداللہ قطب عالم (متوفی ۱۲۵۵ھ) مخدوم جہانیاں کے نیرہ ہیں ۔ ان کے متعلق یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شب آپ نماز تہجد ادا کرنے کے لیے اٹھے ؛ رات کی تاریکی میں ان کو گھر کے صحن میں سے گزرنا پڑا ؛ چلتے میں کسی چیز کی ٹھوکر لگی جس سے ہاتھ زخمی ہو گیا ؛ آپ کی زبان پر اس حالت میں یہ الفاظ جاری ہوئے :

”کیا ہے ؟ لوہا ہے کہ لکڑی ہے کہ پتھر ہے ؟“ (صفحہ ۱۷ ، مرآت احمدی ، جلد دوم)

اور مرآت احمدی کی عبارت یہ ہے :

”قطبوا پای ایشان بہ آنجوب خورد افتاد ؛ چنانچہ بحروح گشت و خون آلود گردید بر زبان مبارک گزشت “کہ کیا ہے لوہا ہے کہ لکڑی ہے کہ پتھر ہے۔“

(صفحہ ۱۷ ، مرآت احمدی، جلد دوم) و تحفۃ الکرام، جلد اول ، صفحہ ۱۷)

قطب عالم کے فرزند سراج الدین ابوالبرکات شاہ عالم عرف شاہ منجھن (متوفی ۱۲۸۸ھ) ایک روز شاہ بارک اللہ چشتی کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔

۱۔ ’مرآت احمدی‘ جلد دوم طبع فتح الکرم ۱۳۰۷ھ اور ’تحفۃ الکرام‘ جلد اول صفحات ۸۵ ، ۸۶ تک بعینہ ایک دوسرے کی نقل ہیں اور ان کی عبارت حرف بہ حرف مل رہی ہے ۔ دونوں کتابیں بمبئی کی مطبوعہ ہیں ۔ مرآت احمدی کی جلد دوم جو پروفیسر نواب علی نے بڑودے سے شائع کی ہے بالکل مختلف چیز ہے ۔

شاہ نے انہیں شاہ عالم کے خطاب سے یاد کیا ؛ شاہ عالم نے واپس آ کر اس ملاقات کا ذکر اپنے والد قطب عالم سے کیا ، قطب عالم نے فرمایا :

”چشتیوں نے پکائی اے! بخاریوں نے کھائی۔“

یہ فقرہ بعد میں ضرب المثل بن گیا ۔ چنان چہ ’تحفة الکرام‘ و ’مرآت احمدی‘ میں مرقوم ہے :

”و مثل مشہور کہ چشتیوں نے پکائی اے بخاریوں نے کھائی ، یعنی چشتیاں پختہ و بخاریاں خوردند اصلش اہمت۔“

(مرآت احمدی صفحہ ۸۴ ، جلد دوم ، تحفة الکرام ، جلد اول صفحہ ۸۸)

قطب عالم دراصل پنجاب کے باشندے ہیں ؛ تیموری حملہ ہند کے وقت جب کہ آپ کی عمر صرف بارہ سال کی تھی ، تارک وطن ہو کر گجرات میں آباد ہو گئے ۔ آپ کے بعض فقرے ایسے بھی ہیں جو بہ زبان پنجابی آپ نے کہے ہیں ؛ میں اپنے پنجابی دوستوں کی دلچسپی کے خیال سے وہ فقرے بیان درج کرتا ہوں :

جام جانوہ والی سندھ کے دو لڑکیاں تھیں ؛ بڑی کا نام بی بی مغلی تھا جس کی نسبت قطب عالم کے فرزند شاہ عالم سے ٹھہری تھی اور چھوٹی کا نام بی بی مرکی تھا جو سلطان محمد شاہ والی گجرات (۸۴۵ھ و ۸۵۵ھ) سے منسوب تھی ۔ جب شاہ گجرات کو علم ہوا کہ بڑی بی بی مغلی بہت حسین ہے ، اس نے کوشش کر کے جام کو اس امر پر رضا مند کر لیا کہ بی بی مغلی سلطان سے بیاہ دی جائے اور بی بی مرکی شاہ عالم سے ۔ جب اس واقعے کی اطلاع شاہ عالم کو پہنچی بے حد آزدہ ہوئے اور اپنے والد قطب عالم کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کرنے لگے ؛ قطب عالم نے انہیں تسلی دی اور بہ زبان پنجابی کہا :

”نساڈ (۱) نصیب دو ہوں ویج۔“ (کذا)

(مرآت سکندری ، صفحہ ۶۶ ، فتح الکرم)

۱۔ ’اے‘ بہ معنی ’اور‘ ، گجراتی زبان کا حرف عطف ہے ۔

(مراتب) ۔

جب قطب عالم کے فرزند سید محمود المعروف بہ شاہ بدھ کے ہاں
۸۵۳ھ میں شاہ شیخ جو پیدا ہوئے تھے ، مولود کی خوش خبری حضرت کی
خدمت میں پہنچائی گئی ؛ آپ بے حد مسرور ہوئے اور اپنے ایک مرید
کو خطاب کر کے مسرت کے لہجے میں کہنے لگے :
”بھائی محمود خوش ہو اماں تیں وڈا تسان تیں وڈا سانڈے
گھر جلال جہانیاں آیا ۔“ (مرآت احمدی جلد دوم صفحہ ۱۸)

شیخ بدھ جو گجرات کے ولی ہیں دراصل قصبہ ٹڑباد کے متوطن
تھے ۔ ایک روز شیخ موصوف اپنے گھر کے آگے بیٹھے ہوئے سبزی دھو
رہے تھے ، اتفاقاً حضرت شاہ عالم نمودار ہوئے ۔ شیخ بدھ نے انہیں آنا
دیکھ کر دل میں کہا کہ آج جب تک شاہ عالم مجھے کوئی خطاب
نہیں دیں گے میں ان کی کسی بات کا جواب نہیں دوں گا ۔ یہ ٹھان کر
انہوں نے شاہ عالم کی طرف سے منہ موڑ لیا ۔ شاہ عالم نے آواز دی ۔
شیخ بدھ نے جواب نہیں دیا ؛ دوبارہ آواز دی لیکن عدائے برخاست ؛
سہ بارہ پکارا ، شیخ بدھ شس سے سس نہیں ہوئے ۔ اس وقت شاہ عالم مسکرائے
اور بولے :

”ارے میان الولک بولتے کیوں نہیں؟“

میں چان اصل اقتباس درج کرتا ہوں :

”چون دیدند کہ حضرت شاہیہ دام اجلالہ تشریف می آرند
بدانصوب پشت کردہ نشستند و در دل آوردند کہ باید امروز مرا
خطائے عنایت فرمایند ۔ الفصد چون حضرت شاہیہ نزدیک رسیدند
توقف فرمودہ ایشان را بنام ایشان خواندند ، جواب نداد و بار دوم
خواندند ، جواب نداد ؛ بار سوم خواندند ، جواب نداد ؛ تبسم کفان
فرمودند ”ارے میان الولک بولتے کیوں نہیں“ یعنی اے مست تاز
جواب چرا نمی دہید ؟“

(صفحہ ۸۱ ، جلد دوم ، مرآت احمدی - تحفۃ الکرام ، جلد اول صفحہ ۸۱)

سلطان محمود بیگزہ بادشاہ گجرات (۵۸۶۳ و ۵۹۱۷) مجھے میں
فتح خان کے نام سے مشہور تھا ۔ ان ایام میں اس کا سوتیلا بھائی

سلطان قطب الدین (۸۵۵ھ و ۸۶۳ھ) تخت کجرات پر متمکن تھا۔ قطب الدین شہزادہ فتح خان کے قتل کے درپے تھا اور ہر وقت موقع کا منتظر رہتا۔ فتح خان کی ماں بی بی مغلی نے جس کا اس سے قبل ذکر ہو چکا ہے، اپنے بچے کی جان بچانے کے لیے آخر کار اپنی بی بی مرکی کے گھر جو حضرت شاہ عالم سے بیاہی گئی تھی، پناہ لی۔ ایک روز فتح خان حضرت شاہ عالم سے سبق لیے رہا تھا، مخبر نے اس امر کی اطلاع سلطان قطب الدین کے گوش گزار کر دی۔ قطب الدین اپنے بیٹائی کے قتل کی نیت سے اٹھا اور کھوڑا سر پٹ دوڑاتا ہوا شاہ عالم کی خانقاہ پر آدھکا لیکن خانقاہ کے دربان نے جس کا نام مقبول تھا بادشاہ کو دروازے پر روک لیا۔ سلطان نے کہا تم مجھے 'باب جیو' کی زیارت سے کیوں روم رکھتے ہو؟ شاہ عالم نے جو قریب کے کمرے میں بیٹھے تھے، بادشاہ کی آواز پہچان لی اور مقبول کو آواز دی کہ آئے دو؛ بادشاہ تیزی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور شاہ عالم نے فتح خان سے کہا 'ہڈہ ڈو کرے'۔ اب جو سلطان نے کمرے میں نگاہ ڈالی تو ایسا معلوم ہوا کہ شاہ عالم کے سامنے ایک دروازہ ریش اور سفید ابرو کپڑا بیٹھا پڑا رہا ہے؛ مورخ کے اصل الفاظ یہ ہیں :

"چوں آواز سلطان بگوش مباد کہ ایشاں رسید فرمودند مقبول بگزار تا یامد و بہ فتح خان گفت 'ہڈہ ڈو کرے' یعنی بخوان اے ویرک کہ صورت فتح خان دو نظر سلطان مرد درواز ریش، ابرو سید، کوز پشت نمود۔"

ملک سیف الدین کا فرزند فخر الدین ابھی کم عمر ہی تھا کہ فضائے الہی سے فوت ہو گیا۔ سوگوار باب حضرت شاہ عالم کی خلعت میں آیا اور مردہ بچے کی زندگی کے لیے حضرت سے دعاے خیر کا طالب ہوا۔ شاہ عالم نے ملک کو تسلی دینے کے لہجے میں کہا مجھے کی اتنی ہی عمر تھی اور میں مثبت ایزدی پر حابر و شاکر رہنا چاہیے۔ ملک سیف الدین کو اس نصیحت سے کوئی تسکین نہیں ہوئی؛ وہ مایوس ہو کر اٹھا اور حضرت کے چہیتے فرزند شاہ بھیکہ کے پاس جو متوفی بچے کے ہم سال تھے، گیا اور التماس کی کہ تم جا کر حضرت شاہ کی

خلعت میں میرے بچے کی حیات کے لیے کوشش کرو۔ شاہ بیگہ ملک حنف الدین کی زاری اور بے فراوی دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور سیدھے اپنے والد بزرگ وار کی خلعت میں حاضر ہوئے اور مردہ نضر الدین کی زندگی کے واسطے طالب دعا ہوئے۔ شاہ عالم نے کہا میرے فرزند ! اگر تم اپنی جان اس بچے کی زندگی کے عوض قربان کرنے کے لیے تیار ہو تو میں دعا کر سکتا ہوں۔ شاہ بیگہ نے یہ شرط منظور کر لی۔ شاہ عالم انہیں اپنے حجرے میں لے گئے اور ہوں دعا کی :

”راجن جی بکروئے بدل بکروٹا۔“

یعنی اے مولیٰ ! بکری کے بچے کے عوض بکری کا بیج قبول ہو۔
 حضرت شاہیہ اہشان را در حجرۃ مبارک خود بردہ بزبان ہندی
 مناجات نمود کہ ”راجن جی بکروئے بدل بکروٹا۔“
 (تحفۃ الکرام ، صفحہ ۳۶ ، جلد اول ، مرآت احمدی ، جلد دوم ، صفحہ ۲۶)

سلطان شاہ غزنی سلاطین گجرات کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھے اور جوانی کے زمانے میں انتہا درجے کے ظالم اور قند خو واقع ہوئے تھے۔ لوگوں کا رویہ اور اجناس وغیرہ زبردستی چھین لیا کرتے؟ اس پر طرہ یہ کہ ہرلے درجے کے مفرور و متکبر تھے۔ ایک روز حضرت شاہ عالم کے مرید شیخ احمد اپنے مرشد کا کچھ رویہ بعض اشیاء کی خریداری کے لیے رسول پورے سے لے کر احمد آباد کی طرف چلے۔ راستے میں شاہ غزنی سے ملا بیٹھ ہو گئی۔ شاہ غزنی نے سب رویہ چھین لیا۔ شیخ احمد واپس رسول پورے چلے آئے اور اپنی سرگزشت حضرت شاہیہ سے عرض کر دی۔ شاہ عالم مسکرائے اور بولے شیخ احمد ! تم نے شاہ غزنی کے دل میں اہل اللہ کی محبت کی تم ریزی کر دی ہے۔ کچھ عرصے بعد ایسا اتفاق ہوا کہ شاہ عالم ایک روز ”گھوڑ پل“^۱ پر سوار جا رہے تھے، ساتھ میں شیخ احمد بیٹھے ہوئے

۱۔ گھڑ پل : یعنی ایسی رتہ جسے بیلوں کی بجائے گھوڑے کھینچتے ہیں۔ (مرتب)

تھے ؟ سامنے سے شاہ غزنویں نمودار ہوئے اور شاہ عالم کو سلام کیے بغیر برابر سے گزر گئے ۔ شیخ احمد نے عرش کی حضرت آپ دیکھنے ہیں یہ لوجوان کسی قدر مغرور ہے کہ آپ کو سلام تک نہیں کیا اور پاس سے نکل گیا ۔ شاہ عالم نے جواب میں کہا :

”جو راجن جی کا اوفہ پایا ہووے تو تہہ جیسے ققروں کی برسوں تیں کٹاسی کرے۔“ (تخلہ الکرام ، جلد اول ، صفحہ ۳۱)

ان الفاظ میں گویا بھلی کا اثر تھا ؛ مغرور شاہ غزنویں کا قلب الٹ گیا ، وہ فوراً لوٹا اور حضرت شاہیہ کے قدموں میں گر گیا اور نائب ہو کر درگاہ شاہیہ کے باوجودی خانے میں دیگ شوقی پر مل رہا ہوا ۔

سکندر بن منجھو اپنی تاریخ مرآت سکندروی میں قصہ ذہل بیان کرتے ہیں :

سلطان محمود یگڑہ (۵۸۶ھ و ۵۹۱ھ) نے ایک مرتبہ کسی سنار سے ایک مربع رباب تیار کرنے کی فرمائش کی ۔ کئی ماہ کی محنت کے بعد وہ رباب تیار ہوا اور سنار اسے لیے کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے کی غرض سے شاہی محل کی طرف روانہ ہوا ؛ راستے میں قاضی نجم الدین قاضی شہر احمد آباد آ رہے تھے ؛ قاضی نے سنار سے دریافت کیا کہ تیرے پاس کیا چیز ہے اور کسی کی ہے ؟ اس نے جواب دیا شاہی رباب ہے اور بادشاہ کی خدمت میں لے جا رہا ہوں ۔ قاضی نے خادموں کو اشارہ کیا ، رباب سنار سے لے لیا گیا اور قاضی نے ہکڑ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے ، حتیٰ کہ قیمتی جواہرات جو اس پر لکھے تھے زمین پر کر کر مٹی میں مل گئے ۔ سنار با حال تباہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور رباب کے تلف کر دینے کا قصہ سنایا ۔ بادشاہ نے تمام کیفیت سن لی لیکن دم نہ مارا ؛ بعد میں اٹھ کر اپنے خلوت خانے میں چلا گیا ، ایک آہ بھری اور کہا :

”لیجی پیری سیکونی چہوڑے۔“

قاضی صاحب ہم پر امر بالمعروف کرتے ہیں اور رسول پورے چا کر میان منجھالے کو کچھ نہیں کہتے جو ریشمی کپڑے پہنتے ہیں

اور سرود سنتے ہیں۔ سکندر منجھو کی اصل عبارت یہ ہے :

”زورگرے رہاے مرصع بہ تکلف ساختہ بہ خدمت سلطان می آورد ؛
در اتناہی راہ شریعت پناہ قاضی نجم الدین کہ منسوب بقضای شہر
احمد آباد بودند پیش آمد۔ چون نظر قاضی بر رہاب افتاد پرسید کہ این
چیست و از آن کہست ؟ گفت رہاب سلطان است۔ فرمود بیارید ،
مناضیان دویدہ آوردند ، قاضی گرفتہ بارہ بارہ کرد ، جواہرش از ہم
پاشیدہ بہ خاک یکساں گردید۔ زورگر خاکہ بر سر کردہ فریاد کثان پیش
سلطان آمد و عرض کرد کہ مدت چند ماہ است کہ حسب الحکم
در ترصیع رہاب اوقات صرف کردہ بودم ، امروز بہ خدمت می آوردم ،
قاضی نجم الدین از دست من گرفتہ چٹن خائج و نابود کرد۔ سلطان
دم نژد ؛ بعد ازان برخاست و در خلوت نشست ، گفت فیجی بیری
سب کوئی جھوڑے ، یعنی درخت کنار کہ پست است دست ہمہ کسی
بالوے میرسد۔ ہما امر معروف می کنند چرا بہ رسول آباد رفتہ
بر میان منجھلہ یعنی شاہ عالم امر معروف نمی کنند کہ ایشان جامہ
اہریشی می پوشند و استاج سرود می نمایند۔“
(صفحہ ۱۱۱ ، مرآت سکندری)

ہم بالفعل انہی کمونوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ مضمون مزید
تلاش و تحقیقات کا متقاضی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس
کام سلسلہ ادب میں جو ہندوستان میں آٹھویں اور نویں صدی ہجری
میں بہ ذیل تصوف تالیف ہوا ہے ، اگر باقاعدہ تفحص و تلاش سے کام
لیا جائے تو بے شمار اور ایسے قمرات حدیث نظر آئیں گے۔ منقولہ بالا
مکتوبہ دہلی ، پنجاب ، اودھ ، گجرات اور دکن سے تعلق رکھتے ہیں۔
دہلی جس طرح مسلمان سیاسیات کا مرکز رہا ہے اسی طرح اس زبان کا
بھی جس مرکز ہے۔ اردو یا ہندی ، جیسا کہ ان ایام میں اس زبان کو
کہا جاتا تھا ، ایک سوئی اور اکھڑ زبان کے مشابہ ہے جو اب تک ہی
صرف و محوی نظام کے ماتحت ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بولی
جا رہی ہے اور ہر صوبے میں صوبے کی مقامی زبان سے بھی اثر پذیر ہے
اور مسلمانوں کی قومی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔

دہلی کے مسلمان آباد کاروں میں شیخ حمید الدین صوفی پہلے مولود ہیں جو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان سے فقہ 'ہاں بابا کچھ کچھ' تعلق رکھتا ہے۔ یہ فقہ آج بھی اردو دکان طبعے میں وہی مفہوم ادا کر رہا ہے جو ان ایام میں اس سے مقصود تھا۔ مادر مومن اور کعب شکر میں جو گفتگو ہوئی اس سے واضح ہوتا ہے کہ اردو ان ایام میں اپنے خصوصی خط و خال کی مالک تھی جس سے یہ آسانی دوسری زبانوں سے تمیز ہو سکتی ہے۔ 'کا' اضافت اور 'ہوتا ہے' فعل حال اردو کے ساتھ خاص ہیں؛ لفظ 'گھڑا کھڑی' کے تلفظ کو ناصر الدین مجددی اصل باشندہ دہلی کو غیر دہلویوں سے شناخت کرنے کے لیے ذریعہ امتحان بناتا ہے۔ یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ ان ایام میں مسلمان لوگ مختلف طریق کے لمحوں سے جو مختلف صوبوں میں بولے جاتے تھے، یہ درجہ نام آشنا تھے۔

مسلمانوں کے ساتھ ہندی موسیقی کا تعلق اگرچہ شیخ احمد نیروانی کے زمانے سے اقدم معلوم ہوتا ہے، تاہم اس سلسلے میں شیخ احمد پہلے شخص ہیں جو ہمیں معلوم ہیں۔ 'مخزنۃ الاصناف' میں ان کی تاریخ وفات ۹۶۱ ہجری گنتی ہے مگر وہ روایت زیادہ معتبر اور قدیم ہے جو ان کو قطب الدین بختیار کاکی کا معاصر تسلیم کرتی ہے۔ صوفی حلقوں خصوصاً سلسلہ چشتیہ میں موسیقی کی حلت و جواز کا مسئلہ ہندی سرود کو مسلمان اقوام میں مقبول بنانے کے لیے بڑا کامیاب وسیلہ ثابت ہوا ہے۔ اکثر مشہور مشائخ، مثلاً بہا الدین زکریا اور شیخ نظام الدین اولیا اس ملک کی موسیقی سے خصوصیت کے ساتھ وابستگی رکھتے تھے۔ جکری جو دراصل مسلمانوں کی چیز ہے اور خیال و تہی سے زیادہ قدیم ہے۔ اس میں توحید و نعت اور بزرگان دین کی مدح کے مضامین ہوتے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ شیخ نظام الدین اولیا کے دور میں رائج تھی۔ یہی صوفی مسلمانوں میں ہندی شعر کی اشاعت کے معاون ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس مضمون کے دوران میں دیکھا جا چکا ہے کہ شیخ فرید الدین گنج شکر، نظام الدین اولیا، شرف الدین بوعلی ہانی ہتی، شرف الدین احمد یحییٰ منیری، احمد عبدالحق اور شیخ یار

وغیر ہم کم و بیش شعر کہتے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر دھڑوں کے وزن میں لکھتے تھے جس کو ان ایام میں قبول عام کا خلعت حاصل تھا۔ اس دور میں شعر کے میدان میں اردو زبان کا دوسری زبانوں سے تمیز کرنا ایک مشکل امر ہے۔ سوائے اس کے کہ اس کے نائل مسلمان ہیں یا اس میں اسلامی الفاظ استعمال ہوتے ہیں یا بعض اوقات اسلامی جذبات کی پیروی کی گئی ہے اور کوئی وجہ امتیاز نہیں، لیکن یہ مابہ الامتیاز بھی نہایت ہلکے رنگ میں نظر آتا ہے، مثلاً مصرع :

”سجن سکڑے جائیں گے اور نین مرے گے روی“

میں نارسا لفظ ”شکر“ کو ہندی بنا کر ”سکارے“ کی شکل میں تبدیل کر لیا گیا ہے۔ نیز یہ احتمال کہ شکر کا جذبہ مسلمانوں میں زیادہ غالب ہے، اس کے سوا اس مصرع میں کوئی ایسی بات نہیں جس کی رو سے اس کو مسلمان کہا جاسکے۔ لیکن اکثر مثالیں ایسی ملتی ہیں جن میں یہ احتمال بھی مفقود ہے، مثلاً یہ شعر لکھیے :

ہنکھا ہو کسرمیں ڈولے ساتھ تیرے جاؤ
ڈولنے ہجکوں چم گیا تیرے لہکنے باؤ

اب اس شعر سے ہر قسم کی اسلامی خصوصیت غیر حاضر ہے ؛ اگرچہ یہ روئے روایت امیر خسرو کا ہے کیوں کہ وجہ الدین وجہی نے اپنی کتاب ”سب رس“ میں (تالیف ۱۰۴۵) اس کو امیر خسرو کے نام پر درج کیا ہے۔ درحقیقت یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مسلمان عام طور پر ہندی اوزان و جذبات و خیالات کا نتج کر رہے تھے۔ اردو نظم کا وہ دور جس میں وہ دوسری زبانوں کی شاعری سے تمیز ہوتی ہے، دسویں صدی ہجری سے قبل شروع نہیں ہوتا جب گجرات اور بالخصوص دکن میں اردو شاعری یہ تقلید نارسا، روشناس ہوتی ہے اور نارسا جذبات و خیالات و عروض کا ہر نو قبول کر لیتی ہے۔

آخر میں اس قدر اور اضافہ کیا جاتا ہے کہ اردو زبان لشکر اور دربار کے مقابلے میں زیادہ تر خاتواں سے تعلق رکھتی ہے اور شاعروں سے بہت پہلے مشائخ اس کو ادبی شکل دیتے ہیں۔ اور غالباً یہ سرزمین گجرات ہے جہاں سب سے پہلے اس زبان میں تالیفات شروع ہوتی ہیں، جیسا کہ ہم آئندہ مضموں میں واضح کریں گے۔

گوجری یا گجراتی اردو دسویں صدی ہجری میں

یہ مضمون دو قسطوں میں ”اورینٹل کالج میگزین“ بہت ماہ نومبر ۱۹۳۰ء و فروری ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا ”گوجری یا گجراتی اردو سولہویں صدی عیسوی میں“ میں نے اس میں اتنی تبدیلی کی ہے کہ عیسوی صدی کو اس سے قریب ترین مطابقت رکھنے والی اور مضمون کے مواد کے لحاظ سے مناسب ترین ہجری صدی میں بدل دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے قبل بعض مضامین کے عنوانات میں ہجری صدیاں دی گئی ہیں۔ چنانچہ حسن ترتیب کے لیے یہ تبدیلی ناگزیر تھی۔ یوں بھی تمام مضامین میں اکثر و بیشتر اور اس مضمون میں تمام تر ہجری سنیں استعمال کئے گئے ہیں اس لیے عنوان میں عیسوی صدی کی شمولیت ہے جوڑ نظر آتی تھی۔ (مرتب)

اس سے بیشتر ایک مضمون میں واضح کیا جا چکا ہے کہ مسلمان ہندی زبان میں شعر گوئی دہلی میں آباد ہونے کے بہت جلد بعد اختیار کر لیتے ہیں۔ ہندی شعر گوئی کے ہر کہیں میں ہم کو بزرگان ذیل کے اسمائے گرامس ملتے ہیں :

شیخ احمد نیروائی ، شیخ فرید الدین مسعود شکر گنج ، نظام الدین اولیا ، بوعلی شرف تاندور پانی پتی اور امیر خسرو دہلوی ۔

اس شاعری کا مدار زیادہ تر دھرموں پر تھا۔ اردو شاعری ان ایام میں بہ لحاظ جذبات و زبان و اوزان ہندوستان کی دوسری زبانوں سے کچھ مختلف نہیں تھی اور کہا جاسکتا ہے کہ یہ زبان ان خصوصی غلط و خال سے جو دسویں صدی کے اواخر میں اس میں نمایاں ہوئے تھے اور جو حقیقت میں فارسی اوزان و جذبات کا برکتو تھے، اس وقت تک بیکانہً محض تھی۔

اردو اس حالت میں بھی جب وہ خلیجیوں اور تغلقوں کی فتوحات کی پنا پر ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اپنا قدم جما لیتی ہے۔ نویں صدی کی ابتدا میں تیموری حملے اور سلطنت دہلی کی کمزوری کی وجہ سے ملوانب الملوکی کا دور شروع ہو جاتا ہے اور مختلف صوبے، مثلاً گجرات، مالوہ اور جونپور اپنی اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیتے ہیں۔ قرائن اس قسم کے موجود ہیں کہ ان صوبوں میں بھی اس زبان کا جس کو ان ایام میں ہندی کے نام سے پکارا جاتا تھا، کافی چرچا تھا۔ مثلاً مالوے کے مشہور بادشاہ سلطان علاؤ الدین محمود خلجی (۷۸۳۹ء و ۷۸۸۰ء) کے ذکر میں مؤرخ فرشتہ نے لکھا ہے کہ اس نے ایک قصیدہ جو ہندی زبان میں تھا، سلطان ابوسعید میرزا (۷۸۵۵ء و ۷۸۷۲ء) بادشاہ ایران کی مدح میں لکھ کر بھیجا تھا۔ فرشتہ کی عبارت یہ ہے :

”و قصیدۂ غرا کہ در مدح سلطان ایران گفته بود، ظاہراً بزبان ہندی بود معصوب شیخ علاؤ الدین همراه خواجہ جلال الدین فرستاد و شہنشاہ ایران ازان قصیدہ کہ زادۂ طبع بادشاہ مالوہ بود، چنداں مغلوط شد کہ از ہدایای دیگر آنقدر خوشحال نہ شد۔“

اس مختصر بیان سے سلطنت مالوہ میں نہ صرف اردو کے وجود بلکہ اس کی شاعری کا بھی پتا چلتا ہے۔

موجودہ معلومات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان کو ادبی شکل سب سے پہلے صوبۂ گجرات میں ملتی ہے۔ یہ صوبہ ۷۶۹۹ء میں سلطنت دہلی کے زیر نگین آتا ہے اور مسلمان آبادکار اس میں داخل ہوئے ہیں۔ تقریباً ایک صدی تک گجرات دہلی کے تابع رہا، بعد

میں آزاد ہو گیا۔ ہم اور واقعات سے اعراض کر کے امیر تیمور کے حملہ ہند کا ذکر کرتے ہیں جس سے سرزمین گجرات میں اردو کو بالواسطہ تقویت پہنچتی ہے۔ تیموری تخت کی بنا پر لوگوں کی ایک کثیر تعداد صوبہ دہلی سے ہجرت کر کے گجرات میں جا کر آباد ہو جاتی ہے۔ چنانچہ مرآت احمدی میں مرقوم ہے :

”ہم درین اثنا خبر رسید کہ حضرت (صلی علیہ وسلم) قرآن امیر تیمور گورکن در دہلی نزول اجلال فرمودند و فتور عظیم فوان دیار راہ یافت و خلق کثیر از ان حادثہ گریختہ بہ گجرات آمد۔ بقارن این حال سلطان ناصرالدین محمود شاہ از دہلی فرار نمودہ بہ گجرات رسید و از آنجا مایوس شدہ بہمانوہ رفت۔“

(صفحہ ۷۴ ، مرآت احمدی ، جلد اول ، بمبئی)

گویا حملہ تیمور سے دو امر متعلق ہیں : پہلے لوگوں کی مہاجرت جس میں بعض مشاہیر اولیاء کے نام بھی ملتے ہیں ، مثلاً شیخ احمد کھٹو شیخ برہان الدین قطب عالم اور مولانا خواجگی۔ اس ہجرت سے گجرات میں اردو بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ دوسرے شاہان گجرات کی سلطنت کا قیام ، یہ واقعہ بھی اس صوبے میں اردو کی آئندہ ترقی کے لیے ایک زبردست محرک ثابت ہوا۔ مسلمان جو مختلف مقاصد سے گجرات میں آباد ہو گئے تھے ، دہلی کی زبان کو اپنے ساتھ لائے اور قومی زبان کی حیثیت سے اس پر نظر ڈالتے رہے۔ گجرات کی زبان اگرچہ گجراتی ہے لیکن مسلمانوں نے من حیث القوم اردو کو اپنی زبان تسلیم کر لیا۔

عام طور پر اقلیتوں کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنی قومیت کو غیر اکثریت سے محفوظ رکھنے کی غرض سے اپنی زبان ، مذہب اور رسوم کی سختی کے ساتھ پابند ہو جاتی ہیں۔ یہی حالت گجرات میں مسلمانوں کی ہوئی جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔

ترائی اور آثار سے پایا جاتا ہے کہ گجرات میں شروع ہی سے مسلمان اردو بولتے رہے ہیں۔ بعض مورخین و مصنفین نے مشائخ و سلاطین گجرات کے ایسے ہندی قمرے اور جملے نقل کیے ہیں جو یقیناً

اردو زبان سے علاقہ رکھتے ہیں۔ چونکہ ان قزوں کا ذکر گزشتہ مضامین میں کیا جا چکا ہے، میں یہاں صرف ان کی ایک مختصر تکرار پر قناعت کرتا ہوں۔

بقول شیخ باجن یہ فقرہ شیخ یحییٰ کے متعلق کجرات میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا تھا: "وقت شیخ یحییٰ جیسا پڑے ایسا سے اپنی پیلن کسے نکسے۔" یعنی اگرچہ تمہارا شیخ وقت شیخ یحییٰ کی طرح مستجاب الدعوات ہو پھر بھی مناسب یہی ہے کہ جو تکلیف انسان پر آئے اسے خود جھیلے اور دوسروں سے اس کا تذکرہ نہ کرے۔ شیخ یحییٰ شیخ لطیف کے فرزند ہیں اور شیخ عزیز اللہ متوکل کے والد۔

سید برہان الدین ابو محمد عبد اللہ قطب عالم (متوفی ۸۵۵ھ) کی طرف فقرات ذیل منسوب ہیں:

- (۱) چشتیوں نے پکڑ لے بناریوں نے کھائی^۱۔
 - (۲) کیا ہے لوہا ہے کہ لکڑی ہے کہ پتھر ہے^۲۔
- ان کے فرزند شاہ عالم عرف شاہ منجھن (متوفی ۸۸۸ھ) سے یہ فقرے تعلق رکھتے ہیں:

- (۱) اوے میاں الولک بولے کیوں نہیں^۳۔
- (۲) ہلہ ڈوکرے^۴۔
- (۳) راجن جی بکروٹے بدل بکروٹا^۵۔
- (۴) جو راجن جی کا اونہ بھایا ہووے تو تھہ جیسے فقیروں کی برسوں تیں کناسی کرے^۶۔

۱۔ تحفۃ الکرام، صفحہ ۸۸، جلد اول۔

۲۔ تحفۃ الکرام، صفحہ ۷۱، جلد اول۔

۳۔ تحفۃ الکرام، صفحہ ۸۹، جلد اول۔

۴۔ مرآت سکندری، صفحہ ۶۵۔

۵۔ تحفۃ الکرام، صفحہ ۶۶، جلد اول۔

۶۔ تحفۃ الکرام، صفحہ ۳۱، جلد اول۔

ذیل کی ضرب المثل محمود شاہ یکڑہ (۱۸۶۳ء و ۱۸۹۳ء) سے علاقہ رکھتی ہے :

لیچی بری سب کوئی جھوڑے^۱۔

یہ نمونے زیادہ تر نویں صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اردو میں اعلیٰ گجرات کی دلچسپی کا ایک قدیم تر ثبوت مولانا فضل الدین محمد بن قوام بلخی کی تصنیفات سے بھی ملتا ہے جو قصیدہ کڑی واقع گجرات کے باشندے ہیں ۔ مولانا فضل الدین اپنی تصنیف "شرح مخزن اسرار" میں جو ۱۰۹۵ھ کے بعد لکھی گئی ہے ، فارسی کے بعض الفاظ کے اردو مرادف بتلاتے ہیں ۔ ان کی فرہنگ "بہر الفضائل" میں جو ۱۲۴۸ھ میں تالیف ہوئی ہے ، تین سو سے زیادہ اردو الفاظ ملتے ہیں جو مختلف فارسی و عربی الفاظ کی تشریح کی غرض سے بیان ہوئے ہیں ۔ اس کے علاوہ مؤلف ہندوستان کے جغرافیے ، نجوم ، ماہ و سال ، موسیقی ، اوزان اور پھولوں پر بھی مختصر مختصر اطلاع دے رہا ہے ۔ سب سے آخر میں ایک باب دیا ہے ، جس میں بعض ایسے ہندی الفاظ کا ذکر کیا ہے جو ہندی شاعری میں کارآمد ہیں ۔ مولانا کے اصل الفاظ یہ ہیں :

"باب چہارم در بعض الفاظ ہندی کہ در نظم ہندی استعمال کنند ۔"

ان امور سے واضح ہے کہ گجرات میں ان ایام میں یعنی فرہنگ بہر الفضائل کی تالیف کے وقت ہندی یعنی اردو میں عام طور پر کافی دلچسپی کا اظہار کیا جاتا تھا ۔

گجرات میں ہندی نظم کے ابتدائی حامیوں کے نام اور حالات سے ہم قطعاً تاریکی میں ہیں ، اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ نظم وہاں موجود تھی ۔ چنانچہ بہر الفضائل میں ایک شعر ملتا ہے :

دیکھ دیکھ پیہر گھر جاوے

تس تس تسو تسو تسو تسو

۱ ۔ مرآۃ سکندری ، صفحہ ۱۱۱ ۔

۲ ۔ دیکھئے مقالہ گزشتہ بہ عنوان فارسی زبان کی ایک قدیم فرہنگ میں اردو زبان کا عنصر ۔

شیخ باجن کے ایک مختصر بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عطاء اللہ الملقب بہ شیخ رتن جو شیخ رکن الدین کل شکر (متوفی ۸۵۲ھ) کے مرید ہیں ، ہندی نغمے اور موسیقی کے لیے مشہور تھے ۔ باجن کہتے ہیں :

”وہ سر شیخ نصر اللہ ہندگی شیخ عطاء اللہ ہندگی الملقب بہ شیخ رتن کہ ایشان در علم موسیقی و در جمیع علومہا دانشمند بودند کہ برود عالم ایشان در عالم خدا ظہور مشہور و ملبول اند۔“

شیخ رتن کے والد شیخ نصر اللہ ، شیخ عزیز اللہ متوکل کے بڑے بھائی ہیں ۔ رتن شیخ عطاء اللہ کا تخلص معلوم ہوتا ہے ۔ مسلمان ہندی گو شعرا اکثر اوقات ہندی تخلص بھی رکھ لیا کرتے تھے ۔

شیخ بہاء الدین باجن

شیخ باجن نویں صدی ہجری کے متصف دوم سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ان کا نام بہاؤ الدین بن معزال دین اور تخلص باجن ہے ۔ باجن کا ترجمہ موسیقی ساز یا ہاجہ ہے ۔ شیخ باجن ایک رسالے کے مصنف ہیں جو ان کے پیر شیخ رحمت اللہ بن شیخ عزیز اللہ متوکل اور ان کے اسلاف کے حالات نیز فقر و تصوف کے بیانات پر شامل ہے ۔ یہ رسالہ بد قسمتی سے ناقص الطرفین ہے اس لیے مجھ کو اس کا نام معلوم نہیں ہو سکا ۔

مختلف کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ باجن اپنے زمانے میں کسی قدر شہرت کے مالک تھے ۔ صاحب ’خزینۃ الاصفیاء‘ کے نزدیک شیخ عزیز اللہ متوکل شیخ باجن کے پیر ہیں ۔ چنانچہ لکھا ہے :

”شیخ عزیز اللہ متوکل قدس سرہ پیر شیخ باجن است کہ پیر شیخ علی متقی است۔“ (صفحہ ۱۱۱ ، جلد اول)

لیکن شیخ باجن بار بار اپنے رسالے میں شیخ رحمت اللہ کو اپنا پیر بیان کرتے ہیں جس سے کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں رہتی ۔ شیخ باجن کے حالات بد قسمتی سے کسی تذکرے میں نہیں ملتے ۔

۱۔ شیخ عزیز اللہ متوکل کے فرزند تھے ۔ ۸۹۷ھ میں فوت ہوئے ۔ (مراتب)

ان کی تصنیف سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک نہایت ہی مشہور اور متقی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد معز الدین سات مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے ہیں، جن میں سے پہلے تین حج انہوں نے تنہا ادا کیے ہیں، باقی چار حج اپنی والدہ ماجدہ کی معیت میں کیے ہیں۔ اس کے علاوہ بیت المقدس و دیگر مقامات متبرکہ کی بھی زیارت کی ہے اور آخر میں شہادت پائی۔

اجن فرماتے ہیں :

”ہذا ابن فقیر ہفت بار حج کردہ بود (تہ)۔ سہ حج اول تنہا رفتہ بودند، چون باز آمدند دوم بار برکاب خدمت والدہ خود رفتند و چہار حج دیگر کردند و یک حج اکبر یافتند و در مدینہ مبارکہ زیارت سلطان المرسا بن و در قنس و خلیل زیارت پیغامبران پیادہ رفتند و (بہ) برکت آن حجیہا موت شہادت یافتند۔“

شیخ ہاجن نے اپنے ایک بھائی کا بھی ذکر کیا ہے؛ ان کا نام شیخ میناں تھا اور شیخ رحمت اللہ سے ارادت رکھتے تھے۔ ہاجن کے ایک اتفاقہ جملے سے اس قدر اور معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے جنوب میں جزیرۂ میلان تک اور شمال میں سرحد ایران تک سفر کیا؛ کہتے ہیں :

”ابن فقیر تا طرف سندہ قریب خراسان و طرف دکن تا قریب سرحد میلان مسافر بود۔“

وہ شادی آباد (متڈو) بھی گئے ہیں اور شیخ عزیز اللہ متوکل کے مزار کی زیارت کر آئے ہیں۔ صاحب مرآت احمدی نے شیخ علی متقی کے ذکر میں دو مرتبہ شیخ ہاجن کا ذکر کیا ہے۔ پہلے فقرے کا مطلب یہ ہے کہ علی متقی کو بہ عمر ہشت سالگی ان کے والد شیخ ہاجن کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے اور انہیں شیخ کی بیعت کرائی۔

”پھر او دو اوان ہفت ہشت سالگی بہ خدمت شیخ ہاجن چشتی بردہ مرید ساخت۔“

(صفحہ ۵۵، جلد دوم)

دوسری بار اس موقع پر ذکر کیا ہے جب شیخ علی متقی

جا کر شیخ باجن کے فرزند شیخ عبدالحکیم کے مرید ہوئے ہیں ۔

”ہمد ازان جاذبہ عنايت اللہی در وسيد و حقارت دنیا در نظر آمد ،
در خدمت شیخ عبدالحکیم بن شاه باجن وسیلہ خرقہ خلافت چشتیہ
پوشیدہ بجانب دیار ملتان سفر کردہ ۔“ (صفحہ ۵۶ ، جلد دوم)

تحفۃ الکرام سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ شیخ باجن کا مزار
برہان پور میں ہے ۔ شیخ قطب محمد بن شیخ حسن محمد چشتی کے ذکر میں
مرقوم ہوا ہے کہ :

”شیخ قطب محمد طرف برہان پور سکونت ورزیدہ بدایچا برحمت حق
پیوستہ قبر نزدیک روضہ شیخ باجن واقع است۔“

(صفحہ ۹۴ ، جلد اول)

حسب روایت تذکرہ گلزار ابرار باجن ۱۰۲۰ھ میں وفات پاتے ہیں ؛
جیسا کہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی فہرست فارسی مخطوطات^۱ مرتبہ
آئیو ناک میں درج ہے ۔

شیخ باجن کی تصنیف پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی
زبان ان کے ہاں زیادہ تر ہندی طرز تخیل و تکلم کے تابع بنا دی
گئی ہے ۔ وہ ہندی میں سوچنے اور بولنے میں اور اسی لیے ان کی
تحریر میں ہندی محاورات اور اسلوب کا ہر تو موجود ہے ۔ ہندوستانی
فارسی اسی چیز کا نام ہے ۔ اس عہد کے اکثر ہندوستانی بالخصوص
جماعت صوفیہ کے ہاں اسی قسم کی فارسی لکھی جاتی تھی ۔ ان کی تحریر
تہایت صاف ، سلیس اور سادہ ہے ۔

اردو کا قاعدہ ہے کہ تعظیماً و تکریماً ایک شخص کا ذکر یہ صیغہ
جمع لاتے ہیں ، باجن کے ہاں یہ قاعدہ بالکل عام ہے ، مثلاً :

(۱) ”ہندگی شیخ عبداللطیف عرضداشت کردند کہ ہم ازین معنی
یعنی ازین درخواست کردہ بودیم کہ شاہ راست بداند کہ ما راست
میگوئیم ۔“

(۲) ”شیخ نظام الدین اولیا بخوش شدند؛ آپ وضو کہ در طشت بود عطا فرمودند و بر هر دو گوش شیخ عبداللطیف ماربن گرفتند۔“

ان کے ہاں بعض بالکل ہندی محاورے استعمال ہوئے ہیں، مثلاً ’دب کردن‘ بہ معنی دفن کردن مثال :

”بعد مردن گاؤ را فرمایند کہ در زمین دب کنند۔“

آئندہ جملے میں رعائش بہ معنی رعائی استعمال ہوا ہے :

”سبب دختران رعائشی خود میکنند۔“

بہ حیثیت فارسی نگار شیخ باجن کسی بلند رتیبے کے مستحق نہیں ہیں، مگر وہ دونوں زبانوں یعنی اودو اور فارسی میں شعر کہتے ہیں، نہ ان کی شاعری بلند پایہ ہے؛ تا ہم دیگر شعرائے مصوفین کی طرح انہوں نے شعر کو اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کا آلہ بنا لیا ہے۔ ہندی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کثرت سے شعر کہے ہیں۔ اسی فارسی تالیف میں جس کا کئی بار ذکر آچکا ہے، موضع بہ موقع ۵۔۶ سے زیادہ ہندی دوسرے اور نظمیں منقول ہیں جو سب انہی کی طبع زاد ہیں۔ ہم ان کی فارسی سے قطع نظر کر کے ان کے ہندی کلام کی طرف توجہ دیتے ہیں۔

ان ایام میں قاعدہ تھا کہ ملکی زبانوں کو مختلف صوبوں کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، چنانچہ امیر خسرو دہلوی نے اسی طرح ان کا ذکر کیا ہے، یعنی زبان سندھ، لاہور، کشمیر، ڈوگر، دھور، سنٹر، تلنگ، کجرات، معبر، گوڑ، بنگالہ، اودھ، دہلی۔ اس لحاظ سے دہلی اور اس کے علاقے کی زبان دہلوی کہلائی۔ یہ نام ہمارے عہد تک باقی رہا ہے۔ نواب میرزا داغ دہلوی کا شعر ہے :

احمد پاک کی خاطر تھی خدا کو منظور

ورنہ قرآن اترتا بہ زبان دہلی

ابوالفضل بھی آئین اکبری میں دہلی کی زبان کو اسی نام سے یاد کرتا ہے لیکن شیخ باجن پہلے شخص ہیں جو زبان دہلوی کا

کونہ دیتے ہیں۔ وہ اس کو ہندوی کے نام سے بھی پکارتے ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک ہندی اور زبان دھلوی ایک ہی چیز ہے۔ ان کی تصنیف میں دنیا کی مذمت میں ایک جھوٹی سی نظم ہے جو اس عنوان سے شروع ہوتی ہے :

”مذمت دنیا بہ زبان دھلوی گنتہ“

اور نظم حسب ذیل ہے :

یہ فنی کیا کسے یہ ملتی ہے جب ملتی ہے تب چھلتی ہے
اول آن چھل بہت چھلائے آن چھوہری بہتی کھلائے
آن رو کر بہت رولاے

یہ فنی کیا کسے یہ ملتی ہے جب ملتی ہے تب چھلتی ہے
[پہلے دوم]

آن بہت گھبرے ہمارے ہے اس ہلکے وے اٹھ چھارے
جے رے اس تھہے تارے وے نجانے اس تھے ہارے
جے اس کلونہ تہنہ تروسنہ ہے چکھ ملے تو اس سنہ ہاسنہ
یہ فنی انہوں تہاوتے چکھ ہاس انہوں نہ آوتے
جے اس کدھی نہ لوریں ہے چکھ ملے تو بھی اس چھورلہ
جے دیکھ اس تھے بھاگے یہ تیلج ان سنہ لاگے
[مخلص] دیکھ باجن یہ تو جھوٹی مکھ میٹھی چت نیٹھی
یہ اے ایسی دھمکتی یہ کیا کسے یہ ملتی ہے

اس زبان کو شیخ باجن زبان دھلوی کہتے ہیں۔ میں اسی تالیف سے ایک اور مثال دیتا ہوں۔ اصحاب صفہ کے متعلق شیخ باجن روایت کرتے ہیں کہ جنگ میں جاتے وقت یہ لوگ لشکر اسلام سے آگے آگے چلتے تھے لیکن لڑائی سے واپسی کے وقت سب سے پیچھے پیچھے آتے تھے۔ ان کی تعریف میں فرماتے ہیں :

”بنائب حضرت اہشان بہ زبان دھلوی نیشہ شدہ امت“ عقد

جب راوت جھوچھن چاونہ تب توں آ گئی ہوا جائی

جھوچہ کر باہر نہ [آوہ] تب توں پچھیں عورا آئیں
 باجن پرووھی جو خدا فرمایا پچھ کی کار نہ سوں دلدلایا
 ایک مناجات لکھتے وقت اسی زبان کو ہندوی کے نام سے یاد
 کرتے ہیں۔ چنانچہ :

”و این مناجات بہ زبان ہندوی گفتہ شدہ است۔“

توڑے پتہ کوئی چل نہکھے	جو چلے سو چل چل تھکے
پڑہ پنڈت پونہی دھویاں	سب جان سہہ بہہ کھویاں
سب جوگیوں جوگ بھارے	سبہ تپشی تب بھکڑے
ایک درستی درستی بھولی	سر نالکے بانوہ کھلے
ایک سیوری ہوئے سیو کر نہ	ہوئی تپئی گیا دکہ دھرنہ
ایک درویشی ہوئی کر آئے	ہوئی قلندر روپ بھرائے
ایک ابدال ہوئے اب دھوئی	ایک ہاندہ ماہا ہوتی
ایک کھلی ہوئی دواں	ایک بادل ہند راقی
ایک راق ماتی ہوئے اوراوں	[ہن] پی بے سہہ ہو ہو جاوہ
ایک چنگم جشا دھاری	ہور ہندونس اندھیاری
ایک کاہری ہوئی کر گنہ	منہہ سیو بھہے چنہہ
ایک اباسی راتہہ جاگنہ	ہوئے بھکاری بھہے مانگنہ
یوں ٹولی ٹولی ہوئے کدے	سہہ رل رل کھل کھل کھوی کرے
دے مکت منے ابوئے دیکھے	آرے باجن توں کس لکھے

اب ظاہر ہے کہ دھلوی اور ہندوی شیخ باجن کے نزدیک ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ وہ اس امر سے بہ خوبی واقف معلوم ہوتے ہیں کہ یہ زبان جس میں وہ طبع آزمائی کر رہے ہیں، اسکا دھلی سے علاقہ رکھتی ہے۔

باجن ایک موقع پر ایک ریختہ بھی دیتے ہیں جو حسب ذیل ہے۔

ریختہ

یہ صوفی سر الہمی اس مرتبہ دلداد شاہی
 یہ مظہر عین خلای

دران مجلس کہ مظہر عین خدا باشد آنجا عین عین خدا باشد
 آنجا ببارد رحمۃ اللہ

آنجا ساقی رسول اللہ آنجا روی تو شین اللہ
 آنجا عین اللہ باشد نہ غیر اللہ

یہ وضو زیادہ تر گیت کے مشابہ ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ
 یہاں اصطلاح کا استعمال نہایت قدیم ہے ۔

یہاں بعض اور مثالیں باجن کے کلام کی دی جاتی ہیں :

جد سرور ہزم کا رحمۃ اللہ بھریا
 باجن جیوڑا وار کر سر آگئی دھریا

دیگر

باجن جو کسی کے عیب ڈھانکے
 اس سے درجن تھر تھر کانہے
 نعمت علی اس تھے پائی
 میں چیاں (کذا) انکھیاں چاری نکھائی

دوہرہ

باجن وہ کسی سریکھا نہیں اور اس سریکھا نہیں کوئے
 جیسا کوئی من منہ چنت دے ویسا بھی نہوئے

دوہرہ

نچہ ایک روپ اور بھانت چت دیکھ عاشق شیدا ہوئے
 باجن اپنی ایک سریکھا تاہیں سہ گئے جوئے جوئے

دیگر

نہ اٹھ چنانہ وہ جاہا نہ وہ مای پاپ کیلایا
 باجن سہ اٹھ آپ نہ پایا برگھٹ ہوا پر آپ لکایا

دوہرہ

بھونرا لیوے بھول رس رسا لیوے پاس
 مائی سچے آس کر بھونرا کھڑا اداس

دوہرہ

باجن میت پھوڑا جس کون ہووے
ہائی رووے سبہ کون وہ لوہو رووے

دیگر

جب میل منہ منہ دھمکے یہ رباب رنگ میں کھمکے
یہ صوفی انا پر رقصے

دیگر

روزے دھر دھر نماز گزاری دہی فرض زکاوۃ
بن فضل نیرے چھوٹک باہیں آگیں پکھمن بات

دیگر

نقدہ در پردہ کنارا :

مصطفیٰ جگ کا سون رے

کاندھے سوئے^۱ کالی سہر پر سوئے تاج
لت کت آوے نی پھد ممہ کارن معراج

دوہرہ

باجن پرتہ درویش کی جس دیوے کرتار
اس جگ میاے راج کرے اس جگ اترے ہار

دوہرہ

گور اندھیاری ڈریڈا باجن کھڑا مفلس
ہیڑا^۲ کانھے جیو ڈرے یہ دکھ آکھوں کس

دوہرہ

باجن ناندہ تلھرا بندھیا پتی بہار
آگیں دریا ڈراونا کبوں اتریسی ہار

۱ - ہندی مصدر سوہنا یہ معنی سنا و پھینا - (مرتب)

۲ - جسم - (مرتب)

دنگر

ہاجن جنہ روی روی اپنے ہاپ دھوے
نہہ ہانی نا رہا تب لو ہو رووے

دنگر

روح جو آے ہاپنہ دھونا
ہس ہس رووے ایسا رونا

دنگر

کھر انکن جنگل ڈونگرا ہاجن من یکساں
کھر باہرتو ہی رکھوالا نکدوان [تیرا نالو سپراتروے پری]

سبہ ہاتوں کا رکھوال اوگھٹ کھٹ اتارن ہار
[تیرا نالو] مسرا تروے ری

بکت دونگر پگھیں کانٹیاں اگ ہسیں جسی ٹھاڑوں
سبہ بن کھنڈ کا توں ہی واجا واری تیرے جانوں

۱۔ ڈونگر راجستھانی زبان میں چاڑ کو کہا جاتا ہے ! کیرات
میں بھی راج ہے۔ گوئی زمانتا ملتان زبان میں نہیں ملتا لیکن
خواجہ غلام فرید کے دیوان میں جایجا نظر آتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔
میرے پیش نظر ان کا وہ دیوان ہے جو ۱۳۴۳ء میں لاہور ہرنگنگ پریس
میں چھپا تھا :

- | | |
|----------------------------------|--------------------|
| ”رہتی روہ ڈونگر وج“ | (کافی نمبر ۲۷، ۲۸) |
| ”ڈونگر او کھیا گھٹیاں“ | (کافی نمبر ۱۱۶) |
| ”روہ ڈونگر دیاں او کھیاں گھٹیاں“ | (کافی نمبر ۱۵۰) |
| ”لکھ ڈونگر او کھیاں گھٹیاں“ | (کافی نمبر ۱۷۲) |
| ”او کھیاں گھٹیاں ڈونگر کالے“ | (کافی نمبر ۲۲۰) |
| ”ڈونگر کالے پیریں چھالے“ | (کافی نمبر ۲۳۰) |
| | (مہتاب) |

دیگر

کن کن ابھرن موندری دے ہریم پیلا پیا
 باجن جے کچھ کھٹیا سبہ کلان لیا

دیگر

راول دیول ہم نجانا پھانٹا چنہ روکھا کھانہ
 ہم درویشہ ایہی ویت پانی لوڑیں^۱ ہور مسیت
 دھنھے آچویں ٹھنڈی چھانو جو کچھ دیوے سو ہی کھانو

دوہرہ

باجن کوئی تھانے وہ کد تھا او کد تھے برگت^۲ حروا
 وہی جانے آب کون جب تھے برگت حروا

عقدہ

یہ جیو دیسوں پہ جیو دیسوں
 سبہ^۳ پر ہر گمہ سوں بھوگ کریسوں

پہن اول

یہ جیو پیارا آھے منجد تیرے نائیں
 جیت بھارے کروں گسائیں
 باجن جیو بھارے نائیں
 جیو جیوا ھے توہیں گسائیں

دیگر

باجن زہد وہائی کچھ کام نہ آوے
 جب وہ بچے ہات منہ اک جونیاوے

-
- ۱ - لوڑنا یہ معنی ضرورت و کھنا ؛ پنجابی میں اب بھی رائج ہے ؛
 حاصل مصدر لوڑ ہے - ہندی میں اس کی شکل لوڑھنا ہے جس کے معنی
 چاہنے اور خواہش کرنے کے ہیں - (مرتب)
 ۲ - برگت یا برگٹ یہ معنی ظاہر و آشکار - (مرتب)
 ۳ -

دیگر

ہاجن چہو آس رہے سووا نکھو کٹوے
جے کوئی سووا کھے وہی سووا ہوے

عقدہ

راجے کے دوبار سنگ رات چہرے پر نہ
منور منور دیوڑے بللہ رن بن پتکھڑی کرل کرلہ

عقدہ

ایک آپس چاکنہ اور نہ بھی چکاو نہ
چہرے چہرے سید ستاونا
انک انک بیٹھی ہیں چوکیاں
جاگو لوکا جاتی رات

دوہرہ

سبہ رس ہانی نیچے جیوں جانے سبہ کٹوے
جس رس نیچے ہانی وہ رس کیسا ہوے

اس موقع پر ان اشعار کی زبان کی بعض خصوصیات کا تذکرہ
کے موقع نہیں ہوگا۔ ان ایام میں اردو زبان کے امتیازی خط و خال
جو دوسری زبانوں سے اسے تمیز کر سکیں، صرف محدودے چند ہیں
یعنی یہ کہ اس زبان میں مسلمان جذبات و خیالات ہوں، اس میں ایک
حد تک عربی و فارسی الفاظ کا عنصر موجود ہو، اس کی صرف و نحو
ایک خاص اصول و قواعد کی پابند ہو۔ یہ امور ہاجن کی زبان میں
موجود ہیں۔

اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض عربی و فارسی الفاظ اس
زبان میں ہندوستانی صرف کے طریق پر لانے گئے ہیں، مثلاً کافر،
عاشق و درویش یہ حالت جمع کافرنہ، عاشقنہ اور درویشنہ بنائے
گئے ہیں جو برج کے مطابق ہے۔ عربی رقص سے ہندی مضارع رقصے
بنائے گئے ہیں۔ فارسی لفظ مہاں (درمیاں) سے یہ قاعدہ صرف مہانے

کر لیا گیا ہے۔ اسی طرح مسجد اور نکہیاں کو مسیت اور نگہواں لکھا گیا ہے۔ روزے دھرتا اور نماز گزارتا فارسی روزہ داشتن اور نماز گزاردن کا ترجمہ ہے۔

جمع مضارع میں راجع الوقت شکل کے علاوہ ایک اور جمع ہے جو اب اردو سے بالکل متروک ہے ؛ یعنی دھرنہ (دھریں) ، کونہ (کریں) ، ہلستہ (ہلسیں) ، ترستہ (ترسیں) ، تبتہ (تبیں) ، ہرنہ (ہریں) ، جاگنہ (جاگیں) اور مانگنہ (مانگیں) جو پنجابی جمع سے مطابقت ہے۔

مستقبل میں صیغہ واحد متکلم کریسوں (کروں گا) ، دیسوں (دون گا) اور واحد غائب اترسی (اترے گا) اکثر مستعمل تھا۔ پنجابی طرز کی جمع کالہیاں (کالٹے) ، انکھیاں (آنکھیں) کے ساتھ ساتھ برج کی جمع کلالہ (کلالوں) ، درویشنہ (درویشوں) پانہ (پاہوں) راتنہ (راتوں) اورنہ (اوروں) کثرت کے ساتھ آ رہی ہے۔

بعض الفاظ کی قدیم شکلیں یہ ہیں :

جے = جو ، تھے = ہے ، آہے^۱ = ہے ، منہ یا منیں = میں (ظرفیہ) ، آپس = آپ ، چکھ = کچھ ، آگیں = آگے ، سرنکھا = سریکا ، لپٹا = لینا ، چھوٹک = چھٹکرا ، پھلوں = چلے ، منجھ = مجھ ، اب دھوت = اب دھوت ، لیلج = نرلیج ۔

باجن کے ہاں برج کی تمام جمع مثلاً کلان ، لوکن اور تمام جمع مضارع یعنی دھرن ، کون وغیرہ ، نیز اکثر مصدر اور ایسے الفاظ مثلاً کم ، ان ، جن ، نین ، باتوں ، لین ، دین وغیرہ بالعموم ایک ہائے مختتمہ پر ختم ہوتے ہیں۔ ہندی اصوات کے لیے اس نسخے میں خاص علامات موجود نہیں ، البتہ حرف شدد کو دوبار لکھا گیا ہے۔ مثلاً لیا ، میرا ، میرا ، اڑانا ، اڑانا وغیرہ ۔

یہ خصوصیت بحر الفضائل کے نسخے میں بھی موجود ہے جو بہ ظاہر نویں صدی ہجری کا نوشتہ ہے۔

۱۔ سندھی زبان میں اب بھی ”آہے“ استعمال ہوتا ہے۔ (مرتب)

ہاجن کا کلام ہندی اوزان میں ہے۔ دوسرے جو چوبیس ماترے پر ختم ہوتے ہیں، نہایت عام ہیں۔ دوسرے اوزان بھی موجود ہیں۔ زائد اشعار کی صورت میں ابتدائی شعر جو متحد القافیہ ہوتا ہے، عقدہ کہلاتا ہے۔ بعد کے بند تین تین یا چار چار ہم قافیہ مصرعوں پر شامل ہوتے ہیں اور پین کہلاتے ہیں۔ آخری بند جس میں تخلص لایا جاتا ہے، تخلص کہلاتا ہے۔ نظم کی اس قسم کی تقسیم صوبہ گجرات میں دیر تک رہی ہے۔

قاضی محمود دریائی

قاضی صاحب گجرات کے مشاہیر صوفیہ سے ہیں۔ ہندی شعر گوئی میں ان کی شہرت نہ صرف گجرات تک محدود رہی ہے بلکہ ہندوستان میں بھی پھیل چکی ہے۔ ایک خاص طرز کی نظم کے سلسلے میں جس کو 'چکری' کہا جاتا تھا، ان کا نام خصوصیت سے زبان زد عام ہے۔ 'چکری' مجالسِ حال و قال و عرس میں قوال پڑھا کرتے تھے۔ ایک زمانے میں قاضی صاحب کی چکریاں تمام گجرات میں مقبول تھیں۔ اخبارالآخبار میں منقول ہے :

"چکرچانے وے کہ بزبانِ ہندی دارد دستورِ قوالان آن دیار است بغایت مطبوع و موثر و بے تکلف و آثارِ عشق و وجد از سخنانِ وے لاج است۔" (اخبارالآخبار، صفحہ ۱۸۷)

علاؤالدین ثانی بریلوی اپنی تصنیف 'کتاب چشتیہ' میں شیخ علاؤالدین کی 'علائوں' کے ذکر میں (جو ایک خاص قسم کی مثنویانہ و عاشقانہ نظم ہوتی تھی) مثلاً قاضی صاحب کی چکری کا بھی ذکر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں :

"کلام مقبول او بہ مثل چکری قاضی محمود ہر کہ می شنود برحمت او آفرین می شود۔" (ورنی، ۳۶)

نقطۃالکرام میں مذکور ہے :

"از غلباتِ عدن پیوستہ بسببِ حالِ عاشقانہ ہندی بہ طرزِ دلہندی می بست۔" (صفحہ ۸۰، جلد اول)

صاحب خزینۃ الاسفیا لکھتے ہیں :

”اشعار عاشقانہ بزبان ہندی فرمودے کہ تو الان آن دیار بوقت
ساح اشعار آفتاب مجلس اسفیا میخوانند و بغایت موثر می باشند۔“
(صفحہ ۸۰ ، جلد دوم)

یہاں ’جکری‘ کے متعلق چند الفاظ لکھنے مناسب معلوم
ہوتے ہیں ۔ ’جکری‘ دراصل ’ذکر‘ کی بگڑی شکل ہے ۔ اس کا اطلاق
ایسی نظموں پر ہوتا ہے جن میں اور مضامین کے علاوہ سلسلے کا
شجرہ اور مشائخ کی مدح ہوتی تھی ۔ نظام الدین اولیا (متوفی ۷۲۳ھ)
کے عہد میں بھی جکری کا رواج تھا اور ان کو مولانا وجیہ الدین کی
جکری پر حال آیا تھا جو حسب ذیل ہے :

”بینا بن بیا جی ایسا سکھ سے پاسوں ۔“

اس سے ظاہر ہے کہ جکری بھی قدیم سے ہے ۔

یہ قول صاحب کتاب چشتیہ بعض راگ جکری کے سانچہ مخصوص ہیں ،
یعنی لٹ ، ہلاول ، دہساکھ ، ٹوڈی ، سیام پیرازی ، دھنسری ،
اساوری ، دیوگیری ، پوری ، کلیان ، کاتھڑا ، بھاکرہ اور گنڈ ۔

قاضی محمود پیر پور کے باشندے ہیں ؛ خرقہ انہیں اپنے والد سے
ملا تھا ۔ ایک عرصے تک احمد آباد میں رہے ۔ ۵۹۲۰ میں یہ قول
مرآت احمدی وہ اپنے وطن پیر پور لوٹ گئے جہاں ۵۹۳۰ میں انتقال
کیا ، لیکن مجمع الاولیا اور خزینۃ الاسفیا میں ان کی تاریخ وفات
۵۹۲۰ درج ہے ۔

قاضی محمود کی طرف مختلف کرامات منسوب ہیں ۔ ان کو دریا کے
مسافروں کا ولی مانا جاتا ہے اور اسی لیے ان کو بھری کہا جاتا ہے ۔
ان کے ماننے والوں کا اعتقاد ہے کہ تباہی زدہ جہاز و کشتی کے لوگ
ان کا نام لے کر سمندر کی تباہی سے بچ جاتے ہیں اور یہ خیر و عافیت
ساحل پر پہنچ جاتے ہیں ۔

مجھے افسوس ہے کہ میں سردست قاضی صاحب کا نمونہ کلام
جہاں درج کرنے سے قاصر ہوں ۔

شاہ علی محمد جیو گام دھنی (متوفی ۸۹۷ھ)

سید احمد کبیر رفاعی کی اولاد میں ہیں اور تطلب عالم شاہ
ابراہیم بن شاہ عمر الحسنی الاحمدی کے نرزند ہیں۔ ۱۴ جہادی الاول
۵۹۷ھ کو وفات پاتے ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ جو زیادہ تر
تصوف کے رنگ میں ہے، ”جواہر اسرار اللہ“ کہلاتا ہے اور اسی
مجموعے کی بنا پر ان کی شہرت باقی ہے۔ مرآت احمدی کے مصنف
محمد حسن شاہ صاحب کی تصنیف کا بابہ شیخ مغربی^۱ کے دیوان فارسی کے
برابر مانتے ہیں؛ ان کے الفاظ ہیں :

”دیوانے دارد بہ زبان ہندوی در روش و معنی برابر دیوان
مغربی است۔“ (صفحہ ۱۴، جلد دوم، مرآت احمدی)

جب شیخ بہاء الدین برناوی گجرات تشریف لے جاتے ہیں،
احمد آباد میں شاہ علی جیو کے سپان ٹھہرتے ہیں۔ شاہ صاحب نے ایک
روز انہیں اپنا ہندی کلام جو مختلف بحور و اوزان میں تھا، سنایا؛
شیخ نے بہت پسند کیا۔ اس پر شاہ علی جیو نے اس دیوان کا ایک نسخہ تحفہ
شیخ کی خدمت میں پیش کیا جو آیات کلام پاک و احادیث رسول
سے بھٹی و مزین تھا۔ شیخ علاء الدین ثانی جو شیخ بہاء الدین برناوی
۱۔ سید احمد کبیر ابن سید ابوالحسن علی ابن سید یحییٰ ابن سید
ثابت ابن سید حازم ابن سید احمد ابن سید حسن اپنے جد کی نسبت
سے رفاعی مشہور ہیں۔ ۵۵۱۲ھ میں شہر واسط میں پیدا ہوئے اور
ام عیادہ میں ۵۵۵۸ھ میں وفات پائی۔ تاریخ ولادت (جاوید سرالرب)
سے برآمد ہوئی ہے اور تاریخ وفات (فقہ جاوید سرالرب) سے۔ (صفحہ ۶۷)
”ترجمہ حکیم رفاعیہ“ مترجمہ گیلانی زادہ السید محمد سیف الدین طبع
استنبول ۱۳۰۲ھ)

۲۔ نام محمد شیرین ہے، فائن کے رہنے والے ہیں، ۸۸۰۹ھ میں
وفات پائی۔ تقی اوحدی نے سال وفات ۸۸۰۷ھ بیان کیا ہے۔
آپ شیخ اسماعیل سیسی کے مرید ہیں اور فارسی کے نہایت مشہور
صوفی شاعر ہیں۔

کے جانشین ہیں ، اپنی تالیف ”کتاب چشتیہ“ میں جو ۱۰۶۵ھ و ۱۰۶۶ھ کی تصنیف ہے ، تحریر کرتے ہیں کہ یہ نسخہ اب تک ہمارے کتب خانے میں محفوظ ہے ۔ ان کے الفاظ ہیں :

”اں متصرف صادق شمار اشعار وائی مندوبہ خود را کہ بہ زبان کجرات و در بحر عجیب پر لذات جمع کردہ بود ، بہ حضور آں مخدوم با شعور از سر حیور پر خواندہ و انصاف طلبید ۔ این تمام تمام کلام لثائد انجام شیریں کام را بہ وجہ احسن بہ پسندید و آں رسالہ مجلد کہ در وئے تمام چھولنہ و نکات موحمانہ مندرج بودند و آیات و احادیث موافق ساختہ بخشی کردہ نسخہٴ مندوبہ باین قدوۃ چشتیہ گزرایدند کہ تا امروز آں رسالہ یادگار ازان بزرگوار در اجزائے اوراق آں سہرغیای صاحب وقایہ باقی است ۔“

(کتاب چشتیہ ، ورق ۳۳۵)

شاہ علی ہمدانی کا نقش نگین ’اللہ ہائی ہمدانی‘ تھا جس کو بہ شکل برگ تبدیل کنندہ کرایا گیا تھا ۔ جب مریدوں کو شجرہ عنایت ہوتا تھا اس پر اس کی سہرا لگائی جاتی تھی ۔

”جواہر اسرار اللہ“ کی دو اشاعتیں ہیں ؛ پہلی اشاعت جو غالباً مصنف کی زندگی میں تیار ہو چکی تھی ، ان کے مرید شیخ حبیب اللہ ابن عبدالرحمان التریسی الاحمدی نے کی ہے ۔ اس اشاعت پر ذہل کا مختصر دیباچہ درج ہے :

”..... میکویہ بندہ فقیر حفر کہ یکے از کمینہ مریدان و خاکرویان حضرت رب العالمین ہندکی حضرت قطب الاقطاب العالم تاج الافراد سلطان العارفین غوث الاعظم الشریف سلطان سیدی معشوق اللہ الحسینی الرقاعی رضی اللہ عنہ المسمی بہ شیخ حبیب اللہ ابن عبدالرحمان التریسی الاحمدی کان اللہ لہ کہ چند مکاشفات حضرت ہندکی سیدالمادات سیدی و شیخی شیخ العالم الشریف شاہ علی جیو معشوق اللہ منغللہ ابن شاہ ابراہیم ابن شاہ عمر

الحسینی الاحمدی رضی اللہ عنہم کہہ اُن حضرت یکبہ لسان لسان
دوبار جوہر نثار یزبان مبارک فرمودہ بود ، دریں مختصر آوردہ و جمع
کردہ و اُن مافوق حضرت سلطان العالم شاہ علی محمد معشوق اللہ
العبادت جوہر اسرار اللہ را بکتاب جوہر اسرار اللہ نام داشتہ . . . ۱۱

دوسری اشاعت کے مالک مصنف کے فیبرہ سید ابراہیم ابن شاہ
مصطفیٰ حبیب اللہ ابن شاہ علی محمد ہیں جو آپ کے مرید بھی ہیں ۔
اس اشاعت کا دیباچہ ایک طویل الذیل عربی عبارت سے شروع ہوتا ہے ،
اس کے بعد فارسی دیباچہ آتا ہے جس میں سید ابراہیم کہتے ہیں
کہ مجھ سے بعض دوستوں نے کہا کہ جوہر اسرار اللہ کا دیباچہ
جو ابوالحسن^۱ شیخ محمد القریشی الاحمدی نے لکھا ہے ، نہایت مختصر ہے ،
آپ اس پر نہا دیباچہ لکھیے ۔ میں نے اس فرمائش کی تعمیل کردی ہے
اور اُن حضرت کے حکم سے اس کو ابواب میں مرتب کر دیا ہے
اور وہ قصیدہ^۲ بھی درج کر دیا ہے جو ابوالحسن شیخ محمد ابن عبدالرحمان
نے اُن حضرت کی مدح میں لکھا ہے ۔

۱ ۔ مولوی عبدالحنی الاثر رسالہ اردو نے ان کا نام ابن الحسن
شیخ محمد ابن عبدالرحمان القریشی الاحمدی دیا ہے (دیکھو رسالہ اردو
صفحہ ۱۵۴ ، بابت ماہ جولائی ۱۹۲۸ء) لیکن "ابوالحسن" بجائے
"ابن الحسن" زیادہ صحیح ہے کیوں کہ اشاعت دوم میں سید ابراہیم
نے دو مرتبہ ابوالحسن لکھا ہے ۔ اس کے علاوہ ابوالحسن نے اپنے
قصیدے میں بھی یہی کثرت دی ہے ۔ چنانچہ :

گرچہ شعرائے دگر مستند از جام خضر
بوالحسن خواہد ز لہضت بادۂ کو غم ریاست

۲ ۔ قصیدے کا ابتدائی شعر یہ ہے :

آن ولی اللہ کہ ذاتی مطہر اسم خداست
قلب عالم در جہاں گفتن کنوں او را سزا ست

اور شاہ صاحب کا نام اس شعر میں درج ہے :

شاہ من شاہ علی است ابن ابراہیم شاہ خاتم ختم ولایت انتظار اولیاست

ذیل میں اس دیباچے کے بعض ضروری اجزا نقل کر دیے جاتے ہیں :

”قول العبد الفقیر بکے از کلمہ مریدان خاکروہان و فرزندان حضرت سلطان العارفین شاہ علی ہمد معشوق اللہ المسمی سید ابراہیم ابن سلطان الصالحین شاہ مصطفیٰ حبیب اللہ ابن غوث الاعظم سلطان العارفین شاہ علی ہمد معشوق اللہ الحسینی الاحمدی کہ آنحضرت و نیز مرشدی و شیخی شیخ العالم در بحر حقیقت الحقائق و معانی خواصی فرمود دل خود را بجواهر و مرجان و لؤلؤ لالائی حقیقی پر کردہ آنرا دو سلک شعر ساختہ مکشفات و نکات اسم کردہ پس آنرا باسان دورباب و جواهر تار بطریق نظم بہ الفاظ کوجری بزبان حنی و گشہ حق باسان اہشان بہ وقت مکشفات و مشاہدات و مغایبات فرمودہ در بیان اسرار اللہ کہ اثبات توحید و وجود واحد و وجود مطلق با دلائل و براہین عقلی و نقلی و وجدانی و تشہلات آن درس مختصر آوردہ و جمع کردہ و آنرا ’جواهر الاسرار اللہ نام‘ دانستہ کہ این درج محفوظ پر از جواهر اسرار است و وقتی بعضی طلاب وجود واحد این فقیر را گفتہ کہ دیباچہ جواهر اسرار اللہ کہ ابوالحسن شیخ ہمد الفریشی الاحمدی فرمودہ بغایت مختصر ، است تو دیباچہ دیگر املاکن ۔ بعد از تامل بسیار فرمودہ اہشان قبول کردہ بمقدار حضور خویش افشا کردہ عرض نمود“

ابن جواهر اسرار اللہ را ہاذن آنحضرت سلطان العارفین بہ طریق باب ساختہ تا طالب مکاشفہ را مطاہر فی الحال در نظر آید و این نصیحت کہ در مقابل آنحضرت سلطان العارفین مرشد آنحضرت سلطان ابوالحسن شیخ ہمد ابن عبدالرحمان الفریشی الاحمدی فرمودہ بود آن ہم آوردہ ۔“

ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ دونوں دیباچہ نگار جواهر اسرار اللہ کی زبان کو ’کوجری‘ کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ یہ اصطلاح غالباً اس زبان کو گجرات کی زبان سے بھیڑ کرنے کے لیے وضع کی گئی ہے ، جس سے یہ الفاظ دیگر گجراتی اردو مراد ہے ۔ ابوالحسن ہمد یا

شیخ حبیب اللہ کے ہاں یہ اصطلاح جہاں تک ہمیں معلوم ہے ، سب سے پہلی مرتبہ استعمال ہوئی ہے لیکن بہت جلد بعد قبول عام کا خلعت اس کو مل جاتا ہے اور گجرات سے نکل کر دکن پہنچ جاتی ہے ۔ مولوی عبدالحق کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ برہان الدین جام (متوفی ۸۹۹ھ) جو اولیائے بیجا پور (دکن) سے تعلق رکھتے ہیں ، اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں ، مثلاً کتاب 'حجت البقا' میں انہوں نے لکھا ہے :

جسے ہونیں گیان بھاری نہ دیکھیں بھاکا گجری
اور کتاب 'ارشاد نامہ' میں کہا :

یہ سب گجری کیا زبان کر یہ آئندہ دیا بہا

علاوہ بریں ایک نثر کے رسالے موسوم بہ کلمۃ العقائق میں لکھا ہے :

"سب 'پو زبان گجری' نام اس کتاب کلمۃ العقائق" ۱

ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ بیجا پور کے اہل اللہ شیخ برہان الدین جام جو یہ ظاہر حالات دکنی ہیں اور دکنی زبان میں لکھ رہے ہیں ، اپنی زبان کو گجری کیوں کہتے ہیں ۔ اس کی کوئی تسلی بخشی توجیہ نہیں بتائی جا سکتی ۔ مولوی عبدالحق کہتے ہیں :

"لیکن خصوصیت کے ساتھ گجری کہنے سے ان کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ وہ زبان جس میں ان کا کلام ہے ، 'ہندی' ہے لیکن گجری ہندی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے ۔ کلام کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زبان پر گجرات کا اثر ہے" ۲

میں یہاں ڈاکٹر محی الدین مصنف 'اردو شہسپارے' جلد اول کی رائے بھی درج کرتا ہوں ! ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں :

"اس عہد کی تواریخ دکن سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ

۱ ۔ رسالہ اردو ، اورنگ آباد ، صفحہ ۵۳۱ - ۵۳۲ ، اپریل ماہ جولائی

۱۹۲۷ء ، جلد ہفتم ، حصہ ہست و ہفتم ۔

۲ ۔ رسالہ اردو ، صفحہ ۵۳۱ ، اپریل ماہ جولائی ۱۹۲۷ء ۔

گجرات سے بہت سے ادیب اور عالم بیجا پور آیا کرتے تھے ۔ وہاں کی سلطنت کے زوال پر ابراہیم عادل شاہ نے وہاں کے تمام ادیبوں کو اپنے دربار میں بلا لیا ؛ چنانچہ گجرات کے ان پناہ گزینوں نے دکن میں اردو کا ادبی ذوق بڑھانے میں بڑا حصہ لیا ہے ، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ بیجا پور کے بعض اردو مصنفین جیسے شاہ برہان اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ گجرات کے اثر سے دکن کی ادبی زبان بڑی حد تک بدل گئی ہو اور جو لوگ اس متبدلہ زبان میں لکھتے تھے وہ اپنی زبان کو گجری کہنے لگے اور پرانی زبان دکنی کہلانے لگی ۔ مگر یہ فرق زبانہ عرصے تک قائم نہیں آتا کیوں کہ متاخر اہل قلم ہمیشہ اپنی زبان کو دکنی کہتے رہے ۔“

ان دونوں بیاناتوں سے دکن پر گجرات کا لسانی اثر صاف واضح ہے ، لیکن بعض برہانے اثر گجراتی آمیز دکنی زبان کا گجری کہلایا جانا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے ۔ دکن میں گجراتیوں کی اور گجرات میں دکنیوں کی آمد و رفت ہر عہد میں رہی ہے ؛ لوگ نقل مکان و ترک سکونت کرتے رہے ہیں ۔ ہمارا خیال ہے کہ جو لوگ اپنی زبان کو گوجری یا گجری کہتے ہیں وہ درحقیقت گجرات سے تعلق رکھتے ہیں ، اور ہم نے اس اصطلاح کو گجرات و دکن کی عام اصطلاح مان کر درحقیقت اپنے آپ کو مغالطے کا شکار بنا لیا ہے ، ورنہ موزوں یہ معلوم ہوتا ہے کہ گوجری کو گجرات کے لیے مخصوص مانا جائے ۔ اگر دکن میں یہ اصطلاح کسی مصنف کے ہاں ملتی ہے تو ہم سمجھ لیں کہ دراصل وہ مصنف گجرات کا باشندہ ہے اور اسی لیے اپنی زبان کو گجری کہہ رہا ہے ۔ اگر شیخ برہان الدین چانم اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں تو اس سے یہ مقصد ہے کہ وہ اپنے آپ کو گجراتی الاصل تسلیم کرتے ہیں ۔ مختصر یہ کہ گوجری سے مراد مسلمانان گجرات کی اودو ہے ۔

گوجری یا گجری کی اصطلاح دیر تک استعمال ہوتی رہی ہے حتیٰ کہ بارہویں صدی ہجری کی ابتدا میں بھی اس کا رواج پایا جاتا ہے ۔

چنان چہ مجد امین نے اپنی مثنوی 'یوسف زلیخا' میں جو ۱۱۰۹ھ میں بہ عہد اورنگ زیب عالم گیر ختم ہوئی ہے، اپنی زبان کو گوجری کہا ہے۔

آدم پر سر مطلب ، جواہر اسرار اللہ مختصر نظموں کا ایک مختصر دیوان ہے جو عشق و معرفت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ دیوان کی اکثر و بیشتر نظموں کا موضوع مسئلہ وحدت وجود ہے جس کو شاہ صاحب سینکڑوں طرح سے بیان کر جاتے ہیں۔ اسی بنا پر ان کے ہم وطن اس دیوان کو دیوان مغربی کا ہم پلہ مانتے ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ صفت سے گزر کر عین ذات میں محو ہیں ؛ قلب پر وصالی کیفیت طاری ہے ؛ بشر، شجر، حجر، پھول ، کٹی ، غنچہ غرض تمام مظاہر قدرت میں محبوب حقیقی جلوہ نما ہے اور یہ اس کے نشہ محبت میں سرشار ہیں ، اس سے رنگ رلیاں کرتے ہیں اور محفوظ ہوتے ہیں ، کبھی محبتوں بتتے ہیں ، کبھی لیلوں ، کبھی شیریں ہیں ، کبھی خسرو ، کبھی دولہا ہیں اور کبھی دلہن۔ محبوب ان کا بھیس بھرتا ہے اور یہ محبوب کا بہرہ اختیار کرتے ہیں ؛ وہ ان پر ناز کرتا ہے اور یہ اس پر ناز کرتے ہیں ؛ رنگ اڑاتے ہیں اور ہولی کھیلتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ اپنی محبت میں مگن ہیں۔

جوں کہ ان نظموں میں شاہ صاحب نے اپنی قلبی کیفیات اور وجدانی احساسات کا ذکر کیا ہے ، اس تقریب سے ان کا نام مکشفات رکھا ہے۔ صرف چند ایسی نقلیں ہیں جن میں فارسی مضامین روشناس ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک نظم آفرین سے تعلق رکھتی ہے ، ایک میلاد نبی پر ہے ، ایک میں نماز کے مسائل مذکور ہیں ، ایک نظم شاہ صاحب نے اپنے جد امجد شاہ احمد کبیر کی مدح میں لکھی ہے۔

جواہر اسرار اللہ کی زبان ہارے لیے خاص طور پر مشکل ہے۔ اول تو اب سے چار سو برس پہلے کی زبان ہے اور وہ بھی گجرات کی ، اس کے علاوہ اس میں گجراتی الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ ان امور نے شاہ صاحب کی زبان کو دقیق بنا دیا ہے۔ طرز بیان صاف و سادہ ہے ، خیالات و جذبات زیادہ تر ہندی ہیں۔ اگرچہ فارسی جذبات بھی موجود ہیں ؛ فارسی عربی الفاظ کافی تعداد میں موجود ہیں۔

ابوالحسن شیخ مجد کی اشاعت میں نظموں میں ہر قسم کی ترتیب

مفقود ہے ، البتہ سید ابراہیم نے اپنی اشاعت میں ان نظموں کو ابواب میں مرتب کر دیا ہے اور اجنبی ترتیب کا لحاظ رکھا ہے ، لیکن نہ اس طرح پر جس طرح ہمارے ہاں عام دستور ہے ۔ مرتب کا التزام صرف نظم کے اجنبی مصرع کے پہلے حرف پر منحصر ہے ، یعنی اگر نظم کا پہلا لفظ الف سے شروع ہوتا ہے تو وہ نظم باب الف میں داخل کر دی گئی ہے ، اگر 'ے' سے شروع ہوا تو ردیف ہا میں ، باقی علیٰ ہذا القیاس ۔ اس قسم کی ہر ردیف ایک باب مان لی گئی ہے ، یعنی باب الالف ، باب الباء ، باب النانہ وغیرہ ۔ نظمیں چھوٹی بڑی سب طرح کی ہیں ، اوزان بھی مختلف ہیں ۔ ہر نظم ایک مکشوفہ کہلاتی ہے اور مختلف بندوں میں منقسم ہے ۔ ہر بند نکتہ کہلاتا ہے اور عدد شمار کا حامل ہے ۔ نکتہ دو دو تین تین اور چار چار متحد التاقید مصرعوں پر شامل ہے ۔ پہلا نکتہ "نکتہ اول در عقدہ" کہلاتا ہے ، اور آخری نکتہ "نکتہ در تخلص" کہلاتا ہے ۔ چون کہ غزل کے مطلع کی طرح اس بند میں بھی تخلص کے لانے کا التزام ہے ، اس لیے یہ نام دیا گیا ہے ۔

باب اللام میں ایک سی حرفی ملتی ہے ، چون کہ پنجاب میں اب تک یہ صنف رائج ہے اس لیے میں اس کی تشریح سے اعراض کرتا ہوں ۔ معلوم ہوتا ہے بارہ ماہ کی طرح سی حرفی بھی ہندی نظم کی ایک ہرانی شاخ ہے ۔

یہاں میں ان کی ایک نظم سے جو معراج نہی پر ہے ، کچھ اشعار کہنے کے طور پر نقل کرتا ہوں :

آدم آدمیں ہو رہن سارے اے نور ابی تھے کہتے
 بیس بھرا کر آپ دکھایا ہم تم اوپر بول سو دیتے
 ڈونگر حیوان ہو نباتات اے سب نور ابی کا جانوں
 احمد ہد نانوں احد کے دو جامن منہ کوئی نہ آئوں
 تو رہت مان خدا میں کہیا مہتر موسیٰ ہاتھ
 ہد رسول حبیب خدا کا ساروں کہہ یہ بات

احمد بھی ہے توریت مانویں ۱ ہند کیرا ناندو
اجمل میں بھی احمد کہیا مکے تھیں تیں مولد تہانوں

احدیت تھیں وہ ہووا ظاہر حضرت نبی ہند میرا
آنے صلب عبداللہ کے سکے ۲ تہانوں کرتے بھیرا

باجت گلیت سیلی گانویں رے غبہ روپ اجاگل کیرے
آج ہماری عید جی ہے تین سلونے دیکھے تیرے

حبیب خدا کا خاتم انیا ساووں کا سرتاج
جس کے مولود باجت گاؤ عید ہماری آج

علی ہند ایکس نور ہے بکھر گیا ہے چونہ دیس سونے
بہس انہڑے آپیں لیا یا رہیا آپیں آپیں جونے

نظم آیتہ شیخ احمد کپڑ کی مدح میں ہے :

سلطان سید احمد میرے اے سب نور نوازے تیرے

جد بھارے امت شاہ نبی اپن معراج کی رات

امت سنگلی بھکوں بخش مرید کیے سب تیرے ہاتھ

شاہ شہاں ہیں جے جگہاں سیوا کریں سوچہ ذربارا

غوث قطب سب عالم کیرے واریں جانویں تجہ پر ہارا

سانچا شاہ حسینی راجا نو کھنڈ تیری آن

سارے مرید بھارے پیار نہ کریں بکھان

سلطان انیا کل چکھ داتا شاہ علی تن میسو

سلطان سید احمد راجے ساووں کانیں جیسو

ذیل کی مختصر نظم پھولوں اور مالی پڑ ہے جو جذبات کے لحاظ

۱ - یعنی 'میں' یا 'اندرا' راجستھانی کا حرف چار ہے ، گجراتی میں

بھی رائج ہے (مرتب)

۲ - راجستھانی و گجراتی میں یہ معنی 'سب' یا 'تمام' مستعمل ہے ۔

(مرتب)

یہ بالکل مذاق حال کے مطابق ہے :

جس بولوں سونگھن جاؤں تس پاس کھارا پاؤں
کراہونہ کیٹیوں گل لاؤں

یہ کرنے اور کللاں ہور کہاں جسے ات لااں
سب دیویں تیریاں بھالاں

توں موگر چانیں چانگھے دھن بیدی کیتا سانگھے
کیٹیوں تان نہ لاکل راکھے

یہ جوہی بھی نورماں ہور پاس کھاری لپائی
تو ہیڑے میں لے باہی

ان ہار حیلوں سارے سب کلیوں بھول ہمارے
ہنس کرے سوتوں مہکارے

تجہ مائی جسے ہوں پاؤں لے چوری ما نہ چہپاؤں
میں تیتوں نا نہ دکھاؤں

توں گھر گھر شد ہو آوے ہوا لیل کلیوں راوے
جگ تیرا سہاک کھنداوے

شاہ علی پد ان بزرگوں میں سے ہیں جنہوں نے فارسی اوزان کو
ہندی زبان میں روشناس کرنے کی ابتدائی کوشش کی ہے۔ ان کے ہاں
ہزج مربع سالم و رجز مربع سالم میں دو ظلمیں موجود ہیں۔ یہاں
ان بحرؤں کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں :

وجز مربع سالم

یہ جیو تو رہتا نہیں ہور من دوکھ سہتا نہیں
کو جائے یو کہتا نہیں رے بھائیو ہوں سوں کروں

۱۔ 'ہوں سوں کروں' یعنی 'میں کیا کروں'۔ 'ہوں'
واجستہائی کا اسم ضمیر ہے اور 'سوں' گجراتی کا حرف استفہام۔
(مرتب)۔

مجھ جگ کہے جتنا نہیں ہو باج مجھ کھٹا نہیں
 من مانہ نہ سمٹا نہیں رہے بھائیو ہوں سون کروں
 کچھ بات ہے بن کیوں کہوں من مانہ کی من لے رہوں
 توں سکھ کرے ہوں دوکھ سہوں رہے بھائیو ہوں سون کروں
 کے لوگ مجھکو دکھ دھیں جانو جو ایسا کو سپیں
 مجھ باج علیجو کے کہیں رہے بھائیو ہوں سون کروں

ہزج مربع سالم

جو جیوڑا پیوسوں لاکا ہنئے جس نہ کی آکا
 تہنوں کا لوجہ سب بھاکا
 جو لوٹیں تو پھرین ناکہیں رونویں ہور دوکھ سکھ چاکہیں
 تہنوں اے ناچتے آ کہیں
 نبولو بول کچھ کا جو جو لاکے پیار تم سانجو
 کسہ ہی ایتوہیں ناچو
 جو لوٹیں تر پھرین ناکہیں رونویں ہور دوکھ سکھ چاکہیں
 تہنوں اے ناچتے آ کہیں
 جنہوں من ہم کا بھٹکا تلیں تل نہ کا کھٹکا
 سو جانے مرہم کا لٹکا
 الہی اٹکھ کہیں لاکے سونا بہ جیوڑا جاگے
 جوان کا بوکھ بن بھاگے
 جو ایسے یو کوں ہانویں الہیں ہور بوڑ گل لاویں
 پھرین ہور وارنیں جاویں
 سو لٹکن لٹکنا آوے لٹک گل بانہ جب ہاوے
 علی تب چانپ گل لاوے

ذیل میں چند اور اشعار مختلف نظموں سے دیے جاتے ہیں :
 ساندہ الہے یوں بیان منجکوں بھیس کر پکر آپس راؤں
 کہیں سو نوشہ ہو کر آؤں کہیں سو آرس آپ کہاؤں
 پکڑی بانہ قبا لٹکاؤں پھروں ہانسی زربنہ سارا
 سپرا ہار حیلان پھروں دل بادل لے ہوؤں اسارا

ڈھول دہلیں اوٹوں پر سات یہ سب راجت جانویں
سب جنگ کی رے خوشیوں لوگ سب بھر بھر لیاویں
دلہا اور دلہن

اس بستی کا کیا پتارا آج تمہوں کل دوجوں مارا
سو کہوں تسکوں دھرے پارا

یہ جنگ باندی اس جنگ کی رے جہاں نہ بڑے کھیل سویرے
جانوں بات سہی کر میری

لیلٰی اور شیریں

چھوڑو لوکا چہ لڑائی کان کرو یہ برم کہانیں
تمہوں تمہاری شیریں بہاؤے متجکوں میری لیلٰی سہانیں
جسے ہم لیلٰی جوہا لوڑو منجہ مجنوں کی نیتوں دیکھو
تمہوں تمہاری شیریں جوڑ لیلٰی کون کیوں پیکھو

چندبات و خیالات کے لحاظ سے ان کا کلام اگرچہ زیادہ تر ہندی ہے
تاہم فارسی اثر بھی موجود ہے۔ مصرع 'جسے ہم لیلٰی جوہا لوڑو
منجہ مجنوں کی نیتوں دیکھو' سعدی کے مشہور فقرے 'لیلٰی را چشم
مجنوں باید دید' سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح مصرع 'ساجن گھر میں کرے
سو لٹکے اے گگن پر ڈھونڈن جانویں' فارسی کی ضرب المثل مصرع
'ہار درخانہ و من گرد جہاں میگردد' کا ہرتو ہے۔

کان کرو یہ برم کہانی ، میں 'کان کرو' فارسی 'گوش کن'
کا ترجمہ ہے ، اور مصرع 'دھن تہہ ہر لٹکے کیوں نکمرے تہہ
جیسا حاتھی یار دھرے' میں 'لٹکے کرنا' ناز کردن کا اور یار دھرنا ،
محبت داشتن کا ترجمہ ہے۔

فارسی و عربی الفاظ بعض اوقات ہندی بنا لیے گئے ہیں۔ اوپر کے
اشعار میں الفاظ ذیل ہمیں نظر آتے ہیں۔

نوازے (نواختن سے) ، نرمائی (نرمی) ، اسوار (سوار) ، خوشیوں
(خوشیوں) ، حیل (حائل) ، باندی (بندہ) ، سہی (صحیح) ، لیکن سب

سے زیادہ جو لفظ بگاڑا گیا ہے وہ 'عروس' ہے جس کی شکل شاہ صاحب کے ہاں 'اُرس' ہے ۔

ان اہام میں اردو زبان کی یہ ایک خصوصی شان ہے کہ اس میں ہر زبان کے الفاظ داخل ہو کر کم و بیش اپنی اصلی حالت سے تبدیل کر لیے گئے ہیں اور بالعموم دیکھا جاتا ہے کہ سخت ہندی اور عربی اصوات میں ترمیم کر دی گئی ، مثلاً 'ڑیں' 'ہیں' اور 'حائے حطی' کی اصل صوت اڑادی گئی ہے ۔

میاں خوب محمد چشتی

گجرات کے مورخ صاحب صفت احمدی نے انہیں صوفی کامل اور شاعر صاحب سخن بیان کیا ہے ۔ تصوف کے میدان میں ان کا مرتبہ بلند ہے ۔ جام جہاں نما پر ایک شرح لکھی ہے ۔ 'امواج خوبی' اور 'خوب ترنگ' ان کی مشہور و معروف تصنیفات ہیں ۔ مرآت احمدی کی عبارت ہے :

"درویش کامل و صاحب لسان و صاحب سخن بودند ۔ در تصوف دست رسا داشتند و پر جام جہاں نما شرح نوشتہ ۔ 'امواج خوبی' و 'خوب ترنگ' از ایشان یادگار مشہور و معروف است ۔"

(صفحہ ۶۷ ، مرآت احمدی)

ان کے ذہنی کارنامے تصوف کے میدان تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ دیگر فروع علوم پر بھی شامل ہیں ۔ ہندی اور فارسی عروض پر ان کی ایک تصنیف کا ذکر آئندہ سطور میں آئے گا ۔

ان کے واقعات زندگی پر تاریخی کا پردہ بڑا ہوا ہے ؛ یہیں صرف اس قدر علم ہے کہ ان کا انتقال شوال کی ۲ کو ۱۰۲۳ھ میں ہوا اور چوک احمد آباد میں مسجد فرحت الدلک کے پاس خان پور دروازے کے قریب مدفون ہیں ۔ ان کی وفات کی تاریخ 'خوب ترنگ' سے برآمد ہوتی ہے ۔

خوب چمد کا نام ان کی ہندی مثنوی خوب ترنگ تصنیف ۹۸۶ھ

ور اس کی فارسی شرح تالیف ۱۰۰۰ھ کی بنا پر اب تک زندہ ہے۔
 بعض وجوہ کی بنا پر میں ان کی فارسی شرح 'امواج خوی' کا ذکر پہلے
 مناسب سمجھا ہوں۔ اس کی تاریخ تالیف شعر ذہل سے نکلتی ہے :

عدد شمار ز تاریخ 'شرح نعمت ہد'
 ہزار سال مکمل ز 'مکرم خوب ہد'

'شرح نعمت ہد' اور 'مکرم خوب ہد' اس کے مادۂ تاریخ ہیں۔

ایک اور شعر جس میں مصنف نے ایک نہایت اچھوتے طریقے سے
 تاریخ تصنیف نکالی ہے ، حسب ذیل ہے :

شہارم سال شرح نعمت احمد
 دہم سال از دہم عشر از دہم صد

یعنی دسویں صدی کے دسویں عشر کا دسواں اہد۔ اس سے وہی سال
 'ایک ہزار ہجری مقصود ہے۔

اس شرح پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ
 مصنف فارسی زبان کا ایک قابل منشی ، اعلیٰ شاعر اور عمدہ
 تاریخ گو تھا۔

اس کا انداز تحریر نہایت سلیس ، سادہ اور روان تھا۔ ایک مصنف
 کی حیثیت سے اس کا رتبہ ان تمام بزرگوں سے جن کا ذکر ان اور ان میں
 ہو چکا ہے ، بہت بلند ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ خوب ہد
 اپنی زبان کو عربی فارسی آمیز گجراتی کہتے ہیں ؛ چنانچہ کہتے ہیں :

"ہر یک شعر بزبان خود تصنیف کردہ اند و میکنند و من بزبان
 گجراتی کہ الفاظ عجمی و عربی آمیز است۔"

(امواج خوی ، صفحہ ۷ ، قلمی)

یہ عبارت ان کی متنوی 'خوب ترنگ' کے اس شعر کی تشریح ہے :

چون میری بولی منہ بہات
 عرب عجم مل ایک سنگت

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ اس عہد کے گجراتی مصنفین دہلی سے اپنے لسانی تعلقات کو بالکل فراموش کر چکے ہیں اور اپنی زبان کو نئے نئے نام دے رہے ہیں۔ اگرچہ اس عہد سے ایک صدی پیشتر تک دہلی کے ساتھ وہ اپنے تعلقات کے معترف تھے، جیسا کہ شیخ باجن کے ہاں ہم دیکھ چکے ہیں۔

’امواج خرویں‘ حلیات میں شرح کہلانے کی مستعمل نہیں ہے، کیوں کہ اس میں مصنف نے اپنی مثنوی کے متن کی بابتی کا بہت کم لحاظ رکھا ہے، نہ ہر شعر کی علیحدہ علیحدہ تشریح کی ہے، البتہ مطالب وہی ہیں جن کو مصنف نے یہاں فارسی نثر میں منتقل کر دیا ہے۔ تاہم یہ نثر اصل مثنوی کے مطالب کے سمجھنے میں بڑی حد تک امداد کرتی ہے۔

مثنوی خوب ترنگ ایک طویل الذیل مثنوی ہے جو چھوٹے ہندی وزن میں لکھی گئی ہے۔ اس میں مسائل تصوف کا تفصیلاً مذکور ہے۔ اکثر اوقات اس میں تازہ اور جدید تشبیہات و حکایات درج کی ہیں۔ یہ تصنیف اس عہد کے اودو ادبیات میں ایک ممتاز پیداوار مانی جا سکتی ہے۔ خوب بھد شیخ کمال بھد سیستانی کے مرید ہیں اور یہ مثنوی حقیقت میں ان کے مقالات اور ارشادات پر مبنی ہے۔ جس کے متعلق مصنف کا بیان ہے :

میں مرشد تھیں سنیایاں	وے مرشد صاحب عرفان
جنہوں منجھے سکھایا دین	جنہ تھیں منجہ دل ہوا بھین
وارث بھدی ہر ٹھاتوں	شیخ کمال بھد ناسوں
اون تھیں میں سنیا دنرات	اوس منہ یاد رہی کچھ بات
وہ جیوں منجکوں آئی ترنگ	جمع کئے نے نس نس ڈھنگ
خوب ترنگ اس دیا خطاب	مدح رسول اللہ باب

خوب ترنگ دو شنیے کے دن دوم شعبان ۹۸۶ھ کو ختم ہوتی ہے چنان چہ :

نسخہ کی تاریخ اس تہانہ پائے عدد ہر مصرعے ماہہ
خوب ہند گئے بچار چودہ گھاٹ اوس برس ہزار
دوجا چاند جو تھا شعبان دیس دو شبہ کیا بیان

دوسرے شعر کا ہر مصرع الگ الگ مادہ تاریخ ہے ، بلکہ مصرع
"چودہ گھاٹ اوس برس ہزار" سے ملفوظی اور سکوی دونوں تاریخیں
نکلتی ہیں ۔ اردو زبان میں یہ ایک قدیم تاریخ ہے جو ہمیں معلوم ہے ۔
اس تصنیف میں متعدد فارسی و عربی الفاظ بگڑی حالت میں ملتے ہیں ۔
ان میں سے بعض اس قدر مسخ ہو گئے ہیں کہ ان کی شناخت بھی
مشکل ہے ۔ میں بعض جہاں درج کرتا ہوں :

مصرعے = مصرع ، مثال : 'پائے عدد ہر مصرعے ماہہ'

سہی = صحیح ، مثال : 'ایسے سہی کو برائے خدا'

درس = درست ، مثال : 'دوس کہوں وے توں من آن'

داندانوں = جمع دندانہ ، مثال : 'جان داندانوں سوں تس سین'
درے = دریا ، مثال :

'نہی بھلے درے میں جد' 'بھی بھر دریا کہوں تد'

نیشان = نشان ، مثال : 'بے نشان اوس کا نشان'

کاگل = کاغذ ، مثال : 'کھڑیا لیکھن کاگل ذات'

ٹانبا = طعمہ ، مثال :

'ٹیل ٹانجے کی تھی تب' 'ٹانبا کھاتے تھے وے سب'

زلیجہ = زیلوجہ ، مثال :

'ٹوٹا یوں زلیجہ سوی' 'جون پوتلا چتریا ہوئی'

اسی طرح جانور کو جناور ، ذہن کو ڈھنی ، غوی (ہسینہ) کو
'غور' اور نام کو نانو لکھا ہے ۔

مثنوی اگرچہ بروئے قواعد اردو میں لکھی گئی ہے تاہم گجراتی
زبان کے الفاظ جو حروف جارہ و اسمائے صفات و دیگر اسما کی صورت
میں اس تصنیف میں یہاں ملتے ہیں ، اس کا سمجھنا ایک اردو خوان محض

کے لیے مشکل کر دیتے ہیں۔ میں نے ذیل میں ایسی مثالیں انتخاب کی ہیں جو حکایات کی شکل میں ہیں۔ سب سے پیشتر میں حکایت کا غلامہ ناظرین کے سامنے پیش کروں گا اور بعد میں اصل انتخاب دوں گا۔ اس طریق سے مجھے امید ہے کہ ناظرین کرام کو اصل عبارت کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔

حالت محویت و استغراق کی مثال دینے وقت مصنف نے شیخ چلی کی جس کو 'شیخ چلی' لکھا گیا ہے، ایک کہانی دی ہے۔ شیخ چلی جیسا کہ سب جانتے ہیں، ہماری کہانیوں میں ایک مشہور و معروف ہستی ہے جو اپنی بے بدل حیا اور بے وقوفی کے لیے غیر فانی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ وہ بہ ظاہر حالات ایک تارضی شخصیت ہونے کی بہ نسبت ایک افسانوی شہرت کی شخصیت معلوم ہوتا ہے! اگرچہ ضلع کرنال میں ایک عالی شان گنبد کی نسبت عام طور پر بتایا جاتا ہے کہ وہ شیخ چلی کے مزار پر ہے۔

شیخ کے متعلق مصنف نے جو کہانی دی ہے حسب ذیل ہے :

شیخ چلی کے چار مکان تھے جو ایک ہی صحن میں واقع تھے۔ مرمت کی ضرورت سے شیخ ایک مکان پر چڑھا؛ چھت پر پہنچ کر دیکھا تو تین مکان نظر آئے اور چوتھا مکان جس پر شیخ چڑھا تھا، نظر نہیں آیا۔ شیخ اس مکان کی پک لغت کم شدگی سے سخت پریشان ہوا اور سوچا کہ اس مکان کی مرمت پہلے نہ ہونے کی وجہ سے وہ روٹ کر کہیں چل دیا ہے۔ دل میں کہا کہ اس کی تلاشی میں جاؤں اور مناکر لاؤں۔ یہ ٹھان کر وہ جلد جلد اترا اور گلی میں پہنچ کر لوگوں سے پوچھنا شروع کیا کہ اس قسم کا مکان تم نے ادھر سے جاتا ہوا تو نہیں دیکھا؟ سننے والے اس سوال پر مسکراتے اور دل لگی کی غرض سے کہنے لگے کہ ہاں فلاں سمت جاتے دیکھا ہے؛ تم بھرتی کرو اور دوڑو، ابھی کوئی دم میں آئے جا لو گے۔ شیخ دوڑنے لگا اور بار لوگ اسے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر دوڑاتے رہے، مگر مکان نہیں ملا۔ بالآخر مکان سے چور اور ہسینے

میں شرابور شیخ سستانے کے لیے ایک مسجد میں گھس گیا۔ مسجد میں قلندروں کی ایک ٹولی بھی ٹھہری ہوئی تھی۔ ان سے شیخ نے اپنی تلاش اور ناکامی کا قصہ دہرایا۔ انہیں یہی مذاق سوچھا، چنانچہ جب شیخ کو نیند آگئی، اس کی چار ابرو کا صفایا کر دیا۔ صبح کے وقت وہ حوض پر وضو کرنے کے لیے گیا، پانی میں اپنے چہرے کا عکس دیکھ کر حیران رہ گیا، چہرے کی ہیئت اور ہیئت نظر آئی؛ داڑھی اور مونچھوں کو غائب پا کر سمجھا کہ میں گم ہو گیا ہوں اور یہ کوئی اجنبی ہے جو میری جگہ آ گیا ہے۔ اب شیخ چلی نے مکان کی تلاش چھوڑ کر اپنی تلاش شروع کر دی۔ آوازوں پر آوازیں دیں اور مسجد کا کونا کونا چھان مارا لیکن شیخ چلی کو اپنا سراخ نہیں ملا۔ قصہ مختصر یہ کہانی ہے جسے خوب حمد نے آیات آئندہ میں بیان کیا ہے :

شیخ چلی کے تھے گھر چار	چلے پھرانے ایکس بار
اونچے چلے کر لیکھا کہیں	کنتی چہرے ہوئے سو تین
جس پر بیٹھے آپ بھر ایس	تسکوں کنتی مانہ نہ لیاں
فکر کریں نہیں کہوں ہوں	اندازا گھر جاوے کیوں
من سنیں ہوں کیا بھار	دل سنیں [یو] دیا قرار
چلوں اے پرا نہیں مات	روس گیا گھر کس اک بات
اوتروں ڈھونڈوں جنہ کہیں پاؤں	دیکھوں جاؤں منا کر لیاؤں
اوتر چلے پوجھیں اس گھاٹ	گھر جانا دیکھا کس باٹ
ایسا چہرا ایسی ہیئت	ایسے کوئے گھر ہے پچھنت
سب کو کہے کہ اے دکہ جائے	دوڑیں کہیں نجانے پائے
ہانیے سانس نہ منہ منہ مانے	خوسے کہ جھرنوں ریل پائے
ٹھاک پڑے آ مسجد مانہ	رہیں قلندر بھی تس ٹھانہ
بات جماعت میں کہی کھول	جوان ملے اور کہے نکول

۱۔ بہیت = دیوار۔ سنسکرت لفظ 'بہت' سے ماخوذ ہے۔

سندھی میں اب بھی دیوار کو 'بہت' کہا جاتا ہے۔ (مراتب)

شیخ چلی کو سونے بوج کتر گئے وے دادھی موچہ
 نس کبریٰ ایک دو سیجیں لیت دادھی کا کچوہہ ہم نہ کیت
 چلتے لہر ہوں جس تھانہ آے وضو کوں پانی مانہ
 ہائی میں مکہ دیکھت بار بیج دادھی یوں دیا قرار
 ہوں رہا مسجد مانہ سوی یہ منجہ بسرا تیں ہے کوئے
 کوئی قلندر ہے جنہ تانہ بھولا آیا میری تھانہ
 جاؤں ڈھونڈ منجھے لے آؤں واہ ہمیں ہوں منجہ کیوں پاؤں
 پھر آئی مسجد کے دوار ہاکاں! ماریں بہت ہکار
 ہو ہوں ہو ہوں کہ جی لاوین رہے ہوں سب ہونکوں کیوں ہائیں

بہادر شاہ کجراتی (۱۷۲۲ء و ۱۷۶۳ء) نے شادی آباد عرف منٹو کو
 ۱۷۴۳ء میں ایک لڑائی کے بعد جس میں محمود شاہ خاچی والی مالوہ
 گرفتار ہونا ہے، فتح کر لیا۔ فتح کے برائے تقیٰ ایک بھری اڑائی
 جس نے آسمان میں ڈوب کر اپنے مقام چٹانیر کا رخ کیا۔ وہ چٹانیر
 ایسے وقت پہنچی جب اس کے ساتھی برہنوں کو طعمہ دیا جا رہا تھا۔
 اشعار ذیل میں یہ واقعہ درج ہے :

فتح ہوں مانڈو کی جب	حاکم شاہ بہادر تب
سیرگاہ مانڈو کے مانہ	بھری ایک اوڈائی تانہ
جہہ جا کے لائی آکس	اونچی چلہ دیکھیا چنہ پاس
چٹانیر میں جس تھانہ	سیرگاہ تھی داہم جانہ
مانگ جناور جس تھار	لے آ دینھا میر شکار
بیلا تانبے کی تھی تب	تانبہ کھاتے تھے وے سب
سدا سونابا کھاتی جانہ	آ کر بھری اوٹری تانہ
اونچی چلہ دیکھے جیکوئی	سب تھانہ ایسے برابر ہوئی
بھری تھوری بیلا مانہ	مانڈو تھیں آئی نس تھانہ

۲۔ ہاک = زور سے دی گئی آواز۔ پنجابی میں بھی موجود ہے۔

راجستھانی کا لفظ 'ہاکا' بہ معنی 'شور' بھی اس کا ساتھی ہے۔

ان کی اصل ہندی الفاظ 'ہانک' اور 'ہانکا' ہیں۔ (مرتب)

ذہل کی حکایت میں ایک شہ زور کا قصہ بیان کیا گیا ہے جس کو کوئی شخص بھی چپ کہ وہ چٹ خالیجے پر لیٹ گیا تھا نہیں اٹھا سکا۔ چپ بہت لوگوں نے مل کر خالیجے سے زمین سے اٹھانے کی کوشش کی تو بھی اس نے جنبش نہیں کھائی بلکہ خالیجے کا وہ حصہ جو اس کے جسم کو مس کر رہا تھا یہ شکل قد آدم درمیان سے بٹھ گیا۔ یہ کرتب غالباً ولی عہد گجرات کے سامنے دکھایا گیا تھا۔ مصنف کا بیان ہے :

ایک بلونت سو ہوا سوار	آیا راج کنور کے بار
کہیا کہ میرا زور آزمائوں	آج ہمشہ اک دکھلاؤں
بڈا زلیجہ اک بچھوای	سوتا چتا تس اوپر جای
دوہوں ہاتھ پگ لانے ناکہ	زور ہٹے کے سورہا راکہ
کہیا اینہاں تہیں منجے اچاؤ	لاکھوں مل اک تسو ہلاؤ
سب بلونت ملے اک ٹھور	کہیا زلیجہ پھرتے دور
ایسا بل اکٹھے مل کیت	جیوں زلیجہ اوچا سولیت
جنہ بلونت سوتا تھا تانہ	اوتنا توت رہا تس تھانہ
توتا یوں زلیجہ سوی	جیوں پوتلا چنریا ہوی
اینا بھار سو تھا اک زور	جس کا اب لک آیا شور
بھار تو اتنا تھا سب مل	جیوں لیجای تلو منزل

(وق ۱۲۷ - ب، خوب ترنگ)

اس موقع پر ہمیں مولانا خوب پد کی ایک اور تصنیف 'چھند چھندان' نامی کا جو عروض ہندی و فارسی و تال ادھیا کے بیان پر شامل ہے، ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک نہایت غیر معروف رسالہ ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے میں اس نایاب تالیف کا ناقص الآخر نسخہ جو کرم خوردہ ہے، موجود ہے اور بظاہر عہد جہانگیری کے اختتام یا دور شاہجہانی کے آغاز میں نقل کیا گیا ہے۔ نسخہ ہذا کی شکستہ حالی کی بنا پر طویل التباس

نہیں دیا جا سکتا ، ابتدائی شعر یہ ہے :

بسم اللہ کر خانوں دھر چھند چھند
پنگل اور عروض اور تال ادھیا تینہ آں

یہاں میں صرف اس کے عروضی حصے کے متعلق کسی اور کہتا
چاہتا ہوں جس کا آغاز اس دوسرے سے ہوتا ہے :

پنگل گن سہ کہہ رہا اب عروض گت آکہ
مصرعے خوب ایس کے جدی جدی بدہ بھا کہ

عروض فارسی کی تشریح کے وقت مصنف نے ایک نیا طریقہ اختیار
کیا ہے جو مروجہ عروضی طریقے سے بالکل مختلف ہے ۔ مصنف کا یہ
طریقہ زیادہ تر پیچیدہ اور الجھا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ اور کان عروض کے
ذکر میں کہتا ہے :

خوب اصل جز آں ہیں اونکی بکت پھان
دوٹن خیاسی تن مہین جھکوں سیاعی جان

یعنی فعلین اور فاعلین خیاسی ہیں اور مفاعیلین ، فاعلین ،
مستعملین ، مفعولات ، متفاعلین اور مفاعلاتن سیاعی ۔

بحور و اوزان کے بیان میں خوب ہج نے اپنے تصنیف کردہ اشعار
مثال میں دیے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوب ہج کے زمانے سے
قبل ہندی اشعار کا فارسی اوزان میں لکھے جانے کا دستور بہت کم تھا ۔
یہ کتاب چوں کہ طلبہ کو حفظ کرائے کی غرض سے لکھی گئی ہے ،
اس لیے شاعر نے اوزان اور ان کے زحافات کا ہر ہر مثال میں ذکر
کر دیا ہے جو طالب علموں کے لیے بہت مفید ہے ۔ اس موقع پر
فارسی اوزان کی بعض مثالوں کا یہاں نقل کیا جانا خالی از دل چسپی
نہیں ہوگا :

مستقارب مشن سالم :

مستقارب مشن جو خوبی کہی ہے
چھوٹ جن سو مصرعے مشن لہی ہے

تدارک مشن سالم :

بھر سن جب تدارک میں آئے
خوب تب لاعلم اصل اوس جانتے

رمل مشن محذوف :

یہ رمل محذوف چاہیں خوب تک سن کان دھر
جسے وزن محذوف کیجیے حرف چہیہ کے دو لکر

رمل مشن محذوف مقصور :

جو رمل نہیں کرے قصر تو یوں خوب پھان
لکھوں ہوں جو توں نہیں فہم کرے گا تو توں جان

رمل اشکل :

جو رمل کیے شکاچ تو توں بھر میں کریں در
لکریں سو خوب دوجا لکریں سو سائواں ار

مضارع :

مضارع کو کیوں کریں گے نہیں خوبیں اصل چاہیں
ہزج پیچھیں بھی رمل کر ، ملا دوئی یوں پھانیں

مضارع اعراب مشن :

اعراب کرے مضارع تب خوب سن سو من دھر
پہلا لے سو چہلا ، : ے دو کہیں چدی کر

ہزج مربع سالم :

ہزج خوبیں مربع کی
سبھی دو کہ کی سودارودی

مقارب ائلم مقبوض :

کہیں سو خوبیں جو قبض ائلم تقارویں سوں سبھی پھانیں
کرے جو ائلم تو یاد پہلا سے خمسہ سہیں سو آئیں

یہ فارسی عروض کی ہندی زبان میں اشاعت تھی جس نے اردو زبان
کے مستقبل میں ہمیشہ کے لیے ایک ہنگامہ خیز انقلاب پیدا کر دیا ۔

یہ انقلاب گیارہویں صدی ہجری (سترہویں صدی عیسوی) کے آغاز میں شروع ہوتا ہے اور اس کا پہلا نتیجہ مجدد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ و ۱۰۰۶ھ) کا کلیات ہے۔ اس کلیات میں ہم دیکھتے ہیں کہ اردو زبان اوزان و بحر، جذبات و تخیل اور تشبیہ و محاورہ میں فارسی زبان کی تاج بنا دی گئی ہے اور ہندی جذبات و تخیلات و اوزان ترکہ کر دیے گئے ہیں۔ جس طرح فارسی اہل قلم نے عربی ذخیروں سے کام لیا تھا، اب اردو نے فارسی خرمین سے خوشہ چینی شروع کر دی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تبدیلی نے اردو زبان کے دائرے میں بے حد وسعت پیدا کر دی ہے۔ اس میں ہر قسم کے مطالب و خیالات کی ادائیگی کے لیے استعداد آگئی ہے۔ ہندی عروض کی بے بضاعتی ظاہر ہے۔ اس میں شگفتہ اوزان بہت کم ہیں۔ دویہوں اور مثنوی کے اوزان محدود ہیں۔ اس پر طرہ خود ان زبانوں کی تہی مائیگی ہے۔ بہر حال فارسی کے پیوند نے اردو زبان کو ہر لحاظ سے مالا مال کر دیا اور ابھی گیارہویں صدی ہجری ختم بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس زبان میں مجدد ولی جیسے استاد فن اور صاحب دیوان پیدا ہوئے لکھے۔ ان زمانہ اس تحریک کی مخالفت میں بعض حلقوں سے آواز بلند ہوئی ہے اور اس کو غیر ملکی اور ناعاقبت اندیشانہ کہا گیا ہے، لیکن ہمارا خیال ہے کہ بزرگوں کی یہ جدت پسندی جہاں تک کہ اس کے نتائج دیکھے جاتے ہیں، نہایت مفید اور سود مند ثابت ہوئی ہے۔ اردو زبان نے اس وقت تک بے حد ترقی کر لی ہے اور آج وہ فارسی زبان کے دوش بدوش کھڑی ہے۔

مثنوی لیالی مجنوں از احمد د گنی

(از "اورینٹل کالج میگزین" بابت ماہ نومبر ۱۹۲۵ء)

ساتویں صدی ہجری میں سکندر ثانی علاؤ الدین خلجی نے دیوگڑھ ،
ورنگل ، کرناتک وغیرہ فتح کر کے دکن کو سلطنت دہلی کا صوبہ
بنا دیا اور مسلمانوں کا قدم اس سرزمین میں جم گیا ۔ لیکن یہ
بہد تغلق کا عہد ہے جو سیاسی اور اقتصادی تغیرات سے مالا مال ہے ۔
وہ شاعانہ دل و دماغ لیے کر آیا تھا ، تخت ہندوستان پر قدم رکھتے ہی
چین و ایران کی فتح کے خواب دیکھنے لگا لیکن وقت اس کی اولوالعزمیوں
کے استقبال کے لیے آمادہ نہیں تھا ۔ چنانچہ ہندوستان ہی نے اس کے
رہنے میں اس قدر مشکلات پیدا کر دیں کہ وہی تلوار جو اس نے
مالک غیر میں ہندوستان کا اقتدار قائم کرنے کے لیے تیز کی تھی ، اپنی
رعایا کے خون سے رنگین کرنی پڑی ۔ راجا اور برجا ، راہی اور رعیت
میں ایک زبردست نفرت قائم ہو گئی اور جوں جوں وقت گزرتا گیا ، یہ
نفرت خطرناک بغاوتوں کی شکل اختیار کرتی گئی اور اسی وقت ختم ہوئی
جب اس کو پیام اجل آ پہنچا ۔

بہد تغلق کی اصلاحی تجاویز میں ایک تجویز یہ بھی تھی کہ
دہلی کو ترک کر کے دولت آباد کو ہندوستان کا پایۂ تخت بنایا جائے ۔
وہ اپنی اس تجویز پر ایک ناقابل یقین حد تک مصر رہا ۔ ہر چند
دولت آباد ، آباد نہ ہو سکا لیکن ایک مرتبہ اس نے دہلی کو ضرور
آجاڑ دیا ۔ اور جب اس پر تجویز کی عملی مشکلات واضح ہو گئیں تو
اگرچہ اس نے رعایا کو واپس دہلی جانے کا حکم دے دیا تاہم ان

میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس نے نئے وطن کو ترجیح دی اور یہیں آباد ہو گیا۔ دلی کے یہ آباد کار اپنے ساتھ دلی کا لہجہ یعنی زبان اردو بھی ساتھ لائے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا جب اردو زبان دکن میں مرہٹی اور تلنگی زبانوں کے درمیان گلیوں اور بازاروں میں بولی جانے لگی۔ بغاوت امیران صد کے واقعے نے دکن کو بہت جلد خاندان تغلق کی اطاعت سے آزاد کر دیا اور عین وقت پر عہد تغلق کی وفات نے حسن بھیٹی کو دکن کا مستقل تاجدار تسلیم کرا دیا۔

یعنی دور میں جو ۱۳۸۸ھ سے شروع ہو کر ۱۹۳۲ھ پر ختم ہوتا ہے، اردو زبان دکن میں رواج پائی رہی۔ اگرچہ تحریری شہادت موجود نہیں تاہم قیاس اگاہ ہے کہ مسلمانوں کی اس نئی بستی کی عام زبان اردو تھی کیوں کہ اس کو تعلیم یافتہ فرقہ بول سکتا تھا۔ فارسی صرف درباری زبان تھی اور کوئی تعجب نہیں اگر ضرورتاً اس عہد میں اردو تالیفات شروع ہو گئی ہوں۔ یعنی خاندان کی بربادی پر ان کی میراث پانچ ریاستوں میں تقسیم ہو گئی۔ ان میں اردو ادبیات کی ترویج کے لیے خاندان قطب شاہیہ کا قدم پیش ہے؛ بالخصوص عہد قلی قطب شاہ (۱۵۸۸ء و ۱۶۰۲ء) کا نام اردو کی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہے، جس کے عہد میں مستقل تصنیفات لکھی جانے لگی تھیں۔ خود عہد قلی اردو اور فارسی کا زبردست شاعر تھا۔ اس کے ضخیم کلیات پر جو اٹھارہ سو صنعت پر مشتمل ہے، حال ہی میں مولوی عبدالحق صاحب آنریری سیکرٹری انجمن ترقی اردو نے رسالہ اردو بابت ماہ جنوری ۱۹۴۲ء میں ایک پر مغز اور عالمانہ تبصرہ لکھا ہے۔

عہد قلی بہ لحاظ علم دوستی ایک بے نظیر شخصیت معلوم ہوتا ہے۔ علوم کی سرپرستی میں جس قدر اس نے حصہ لیا ہے، ہم ابھی اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے کیوں کہ اس کے عہد کے ذہنی کارناموں کی تاریخ ابھی تک مدون نہیں ہوئی ہے۔ اس کی سرپرستی میں متعدد نفیس اور علمی کتابیں تالیف ہوئی ہیں جو آج یورپ کے مشرق کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔

”اختیارات قطب شامی“ جو ”اختیارات بدیع“ (طبی تصنیف) کی ایک ضخیم تقلید ہے، اسی بادشاہ کے حکم سے اطبا کی ایک جماعت نے تالیف کی ہے۔ جس کا اصل نسخہ راقم کے مجموعہ کتب کے نوادرات میں سے ہے۔ ”مثنوی لیلیٰ مجنوں“ بھی احمد دکنی نے اسی بادشاہ کے حکم سے نظم کی ہے؛ اس کے علاوہ وہ ایک اعلیٰ اور نفیس کتب خانے کا مالک تھا۔ راقم نے ایسی بیسیوں کتابیں دیکھی ہیں جو اس کی سہر اور اس کے بھتیجے اور جانشین محمد قطب شاہ کی سہر اور دستخطوں سے مزین ہیں۔

ایک لحاظ سے یہ زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں زرہی دور کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ آگرے کے تخت پر جلال الدین اکبر بادشاہ جلوہ افروز تھا۔ علوم کی سرپرستی اور فنونِ طریقہ کی حاجت میں گویا سلطان حسین مرزا اور امیر علی شیر نوائی کے عہد کا احیا ہو گیا تھا تصویر کشی اور خطاطی کی بے حد قدر کی جاتی تھی؛ صنایع اور دستکاروں کی حوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جاتا تھا؛ ادب و شعر کی گرم بازاری تھی۔ دکن میں اگرچہ اکبر کی ارضی فتوحات دیر میں شروع ہوتی ہیں لیکن اس کی علمی اور صنعتی فتوحات کی ہوائیں بیشتر سے گولکنڈے اور بیجا پور کی پہاڑیوں سے جا جا کر نکرا چکی ہیں۔ اسلامی تاریخ کے دوران میں ایک مخصوص اصول بار بار ظہور فرماتا ہے اور وہ یہ ہے کہ سلاطین اور رؤساء ایک دوسرے کی تقلید میں بے حد اصرار کرتے تھے اور جب ایک دربار کسی خاص علمی یا صنعتی اوصاف میں ممتاز ہوتا، دوسرے رؤساء اور سلاطین اپنے اپنے دائرۃ اثرات میں ضرور اس کا اتباع کرتے تھے۔ وہ علم کا جواب علم سے اور باغات و عمارات کا جواب باغات و عمارات سے دیتے تھے۔ اور یہ ہم چشتی ان میں ہر زمانے میں مشاہدہ کی جاتی ہے۔ اکبر اعظم کی علمی ضیا باریوں نے نہ صرف فتح پور اور آگرے کو چمکا دیا تھا بلکہ اس کی شعاعوں نے وندھیاچل کی چوٹیوں سے نفوذ کر کے دکن کی وادیوں کو بھی مطاع نور بنا دیا تھا۔ دکن میں تصویر کشی کا

ایک نیا دبستان قائم ہو جاتا ہے جو اصحابان کے مقابلے میں آگرے سے زیادہ فیضان حاصل کرتا ہے۔ اس میں بعض مقامی خصوصیات بھی موجود ہیں۔ یہ دکنی دبستان اگرچہ وسعت، بلند آہنگی اور عظمت میں کبھی بھی آگرے کے دبستان کو نہ پہنچ سکا لیکن دل کشی، نزاکت اور پختگی میں اکبری دبستان سے کم نہیں ہے۔

کتاب زیر نظر ایک منظوم و مصور لیلوی مجنوں ہے، جو محمد علی قطب شاہ کے ارشاد پر دکنی اردو میں لکھی گئی ہے۔ ناظم کا تخلص احمد ہے؛ اس سے زیادہ مصنف کے متعلق کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا۔ گرامر دانسی نے باج 'لیلوی مجنوں' کا ذکر کیا ہے، لیکن یہ کتاب اس مجموعے میں شامل نہیں ہے، نہ کسی اور تذکرے میں اس کا سراغ ملتا ہے۔

میرے مخدوم اور کرم فرما پروفیسر سید عبدالقادر ایم۔ اے پروفیسر تاریخ، اسلامیہ کالج لاہور، تاریخی کتب کی تلاش کے سلسلے میں اس کتاب کو حاصل کرنے میں اور نہایت مہربانی کر کے میرے استفادے کی غرض سے مجھ کو عنایت فرما دیتے ہیں، جس کے لیے میں سید صاحب کا نہ دل سے منت گزار ہوں۔

یہ مثنوی اپنی گزشتہ آب و تاب اور حسن کی ایک غستہ یادگار ہے۔ اس کی موجودہ ویرانی اس کے اصل جوہر کا پتا دیتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کی مصاحبت زیادہ تر اس کی ہرپادی کی ذمہ دار ہے۔ کتاب کا اکثر حصہ غائب ہے، صرف انھاس منتشر اوراق ہیں جو زمانے کی دست برد سے بچی رہ گئے ہیں۔ ان میں چودہ تصاویر اکبری دبستان کی طرز میں موجود ہیں لیکن اکثر شکستہ و ریختہ۔ قریب قریب کوئی ورق سلامت نہیں ہے۔ اس کی جو بیولہ کاری ہوئی ہے وہ سکھا شاہی زمانے سے تعلق رکھتی ہے، لیکن ایسے شخص کے ہاتھوں سے عمل میں آئی ہے جس کو نہ تصاویر سے کوئی محبت تھی اور نہ متن سے سروکار تھا۔ تصاویر پر جو اصل کتاب سے تعلق رکھتی ہیں، کسی غیر قلم میں جو گزشتہ صدی کا معلوم ہوتا ہے،

مثنائے و بزرگان دین کے نام مرقوم ہیں ؟ مثلاً لیلیٰ کی بھاری کی تصویر پر لکھا گیا ہے 'پادشاہزادی'، ایک پر لکھا ہے 'حضرت خوت اعظم پادشاہ' کسی مجلس پر 'فرہاد و شیریں' کسی پر 'حضرت امام حسین بن علی بن طالب'، کسی پر 'حضرت امام حسن رحمۃ اللہ علیہ علی ابن طالب کرم وجہ' (کذا)۔ ایک پر 'خواجہ فرید الدین عطار' اور ایک پر 'حضرت خواجہ خضر'۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ ان تصاویر سے ان بزرگوں کو کوئی علاقہ نہیں ہے۔

پہتر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ فن مصوری میں دبستان دکن بہ لحاظ مجموعی دبستان اکبری کا منقذ ہے جو اپنے پیش رو دبستان ہرات کا اتباع کرتا ہے۔ ہر شکوہ عبارات، قدرتی مناظر، صحرا و باغ، گل و ریاحین، سبز و لب جو، طیور و وحوش، میدان جنگ اور کوہستانی مناظر کے پیش کرنے میں دبستان اکبر بہت پیش پیش ہے۔ فتح پور سیکری کے قدرتی مناظر اور عبارات اکبری مصورین کے پیش نظر نہیں اور ان کو، اکثر اوقات کثرت تکرار کے خوف سے بے خبر، عالم رنگ و نقش میں بار بار پیش کرتے ہیں۔ دور آفتاب میں پہاڑوں کی ٹیکریاں اور پتھروں کی چٹانیں دکھائی جاتی ہیں جن کی ترتیب اور اظہار میں مصورین خاص اہتمام سے کلم لیتے ہیں۔ چٹانوں کے دامن میں سبز زار ہے جس کے گرد سر سبز نہال دور و نزدیک نظر آتے ہیں۔ ٹیلگوں آسمان میں غروب ہونے والے آفتاب کی ناتوان شعاعوں نے ایک زریں دریا کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اس نیم سبز اور ٹیلگوں سراب میں سمیرا لیتے والے پرندے قطار در قطار اپنے آشیانوں کو جاتے نظر آتے ہیں۔ سب سے بلند چٹان پر ایک چھاڑی بکرا اپنی پوری عظمت کے احساس کے ساتھ زیر قدم وادیوں پر ایک نگہ غلط انداز ڈال رہا ہے۔

قریب قریب یہی خط و خال دبستان دکن میں بھی کسی قدر تبدیلی کے ساتھ ہیں جو مقامی خصوصیات کی مناسبت سے نشو و نما پاتے ہیں ؟ ترتیب اشیاء، لباس، چہرے کا حلیہ بعینہ وہی ہے ؟ البتہ انسانی جسم کے دو اعضاء کے اظہار میں وہ مختلف ہے۔ دکن نے آنکھ کو کشادہ

کے ساتھ تشبیہ دی ہے ، سینے کو بہت آبیہارا ہے اور کمر کو بہت نازک بنا دیا ہے ۔ دکنی نقاش خاص خاص تصاویر پر اپنا زور قائم دکھاتا ہے اور اکثر تصاویر کو ایک قابلِ رحم اور غیر تکمیل یافتہ حالت میں چھوڑ کر آتے بڑھ جاتا ہے ۔

ایک امر میں ہندوستانی مصور ایرانی نقاش پر تفوق رکھتا ہے ؛ وہ یہ ہے کہ ایرانی مصور تخیل کے اعتبار سے ، برخلاف ایرانی شاعر کے ایک محدود سرمائے کا مالک ہے ۔ ایران کی قدرتی سرسبزی ، چار فصلیں ، باغات کی کثرت ، گل و رہاہیں کی بہتات ، طیور و وحوش اور قدرتی مناظر کی الرام سے تو یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہاں کا تصویر کش اپنے ملکی مناظر اور گرد و پیش کی فضا میں اپنی تصاویر کو بے انتہا متفاوت مناظر اور جذبات کا دلکشی سرفراز بنا دیتا ہوگا ، لیکن اندوس سے دیکھا جاتا ہے کہ اس کی قوت تخیل نہایت محدود ہے ۔ وہ قدرت کی دل فریب اشیا پر نظر نہیں ڈالتا ؛ اپنے گرد و پیش فطرت کے اعلیٰ نمونوں سے کوئی رابطہ نہیں رکھتا ۔ اس کے پیشِ نظر وہ سرمائے میں جو ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے سفولی اور تیموری ہستان سے تعلق رکھتے ہیں ۔ یہ نمونے بجائے خود ہر قسم کے تخیل سے عاری ہیں اور ایرانی مصور کی معراج میں ہے کہ وہ ان نمونوں کی تقلید کرے ۔ جس طرح شعر میں ایرانی شاعر تقلید کا پابند ہے ، یہی حالت وہاں کے مصور کی ہے ۔ ہندوستان میں شاعر اگرچہ ایرانی شاعری کا مقلد رہا ہے لیکن برخلاف اس کے ہندی مصور نے اپنے آپ پر تقلید کی زنجیروں کا سلسلہ برباد نہیں کیا ۔ صحیفۂ فطرت اس کے پیشِ نظر ہے اور قدرتی مناظر کی طرح اس کا انتخاب بھی غیر محدود ہے ۔ وہ فطرت کے نمونوں کو خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ، اہم ہو یا غیر اہم نہایت غور کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے اور اس کی ہمتال کو لٹنی و رنگ کے واسطے سے صفحہ لوطاس کے حوالے کر دیتا ہے ۔

قطب شاہی خاندان مذہب جعفریہ کا ، جو شیعہ فرقے کی ایک شاخ ہے ، متبع تھا اور اسی لیے شاہان صفویہ سے جدہوں نے ایران

میں شیعہ مذہب کو بہ زور شمشیر فروغ دیا تھا ، ان کے تعلقات نہایت دوستانہ تھے اور رسل و رسائل کا سلسلہ باہم جاری تھا ۔ شیعہ فقہا نے ایران میں نستعلیق کی بجائے خط نسخ کو فروغ دینے کی کوشش کی تھی ؛ فقہا کی تقلید یا اتفاق سے قسب شاہی دربار میں بھی خط نسخ کو بہت تقویت دی گئی ، چنانچہ اس لیلیٰ مجنوں کا خط بھی نسخ ہے ۔ کتاب کی قطع 10×6 ہے ؛ فی صفحہ گیارہ اشعار ہیں اور نہایت صاف جلی قلم میں مرقوم ہے ۔ رسم الخط میں بعض مناسی خصوصیات مشاہدے میں آتی ہیں جو زیادہ تر ہندی اصوات کے اظہار کے لیے ایجاد ہوئی ہیں ۔ چنانچہ جیم فارسی ، رائے ہندی یعنی ژ اور دال ہندی یعنی ڈ اور بالے فارسی کے نیچے بالعموم تین نقطے دیے گئے ہیں ۔ تائے ہندی یعنی ٹ ہر چار نقطے لگائے ہیں ۔ کاف فارسی کو کاف تازی کی طرح لکھا گیا ہے اور بعض اوقات اس کے نیچے بھی تین نقطے دیے گئے ہیں ۔

میں اس کی زبان کی بعض خصوصیات یہاں بیان کرتا ہوں :

عربی و فارسی الفاظ جو روزمرہ میں مستعمل ہیں ، کاتب نے ان کا املا بالکل ہندی طریق پر لکھا ہے ۔

مثلاً فائدہ کو فائدا (الف کے ساتھ) صراحیاں کو 'صراحیان' یا 'سوریان' ، ذوق' کو 'زوق' ، غرخواہی کو 'غرر خواہی' ، نور' کو 'سور' ، ذرہ' کو 'زرہ' ، انتظار' کو 'اقتار' ، غوش' کو 'غلی' ، خوشی' کو 'خشی' ، راضی' کو 'راچی' ، ساز' کو 'ساج' ، منجم' کو 'مولجم' ، جواب' کو 'جاب' ، خیر' کو 'کھیر' ، مدد' کو 'مدت' ، تار' کو 'تار' ، حیا' کو 'ہیا' ، صورت' گری' کو 'سورت گیری' اور 'کبیر' کو 'کبیر' لکھا ہے ۔

جمع کی حالت میں اسم کے آخر میں الف نون عام طور پر زیادہ کر دیا جاتا ہے ۔ امثال : جنس ، چستان ۔ میوہ ، مویان ۔ نعمت ، نعمتان ۔ حکمت ، حکمتان ۔ سبیل ، سبیلان ۔ سوال ، سوالان ۔ جواب ، جوابان ۔ حرف ، حرفان وغیرہ ، لیکن ذیل کی صورتیں مختلف ہیں ۔

’رہنگ‘ واحد ، ’رہنگوں‘ جمع ، ’دروں‘ واحد ، ’درونیں‘ جمع ، ’اہرو‘
 واحد ’اہروں‘ جمع ، ’صراحی‘ واحد ، ’صراحیوں‘ جمع ۔
 ایسے الفاظ جن میں حرف دوم ساکن ہے ، شاعر ایسے ساکن کو
 متحرک کر دیتا ہے ، امثال :

نرم ۔ نرم (بہ تحریک دوم) نرم ، نرم (بہ تحریک دوم) صدر ، صدر
 (بہ تحریک دوم) چھہر ، چھہر (بلا تشدید بہ تحریک دوم) دنیا ، دنیا ۔ دریا ،
 دریا (بہ تحریک دوم و اضافہ یا) جرعہ ، جُورُع (بہ تحریک سوم و
 تخفیف دوم) سچی ، سچی (بہ تخفیف تشدید)

بعض اوقات دیکھا جاتا ہے کہ شاعر بعض الفاظ میں نوں کو غنہ
 بنا دیتا ہے ۔

مثال جنگل

جو چمکے ترے عدل کی بھلی جنگل ظالم کا جال لینی چلی

مثال لگا

ننگے سر ننگے پاؤں ننگے سریر بھرے شہر میں جن سو کیوں ہوئے کھنیر
 مثال بندہ

جو عاجز بندے عجز سوں پیش آئیں (کثا)
 سو تقصیر بخشائے بخشش لجاے
 ماضی کے آخر میں الف سے بیشتر ایک ’ے‘ جو اشام کے ساتھ
 بولی جاتی ہے ، اضافہ کر دی گئی ہے ۔ امثال :
 کہا ۔ کہیا ، چھوٹا ۔ چھوٹیا ، لگا ۔ لگیا ، لکھا ۔ لکھیا ، پیرا ۔
 پیریا ، مانا ۔ مانیا ، رکھا ۔ رکھیا ، بڑا ۔ بڑیا ۔
 اس مشنوی میں عربی فارسی الفاظ ایک معتدہ مقدار میں ملتے ہیں ،
 بعض مثالیں عرض ہیں :

جلالت سوں جب یک تجلا کرے نو آکس کوں نوڑ سرمہ کرے

دیگر

جو توفیق دے شکر کلون کھے

سو وہ پہلیر نعمت او کہ ہووے

سو نعمت پہ بہر شکر لازم کرے
 سو اس پر ہی چک شکر قائم دھرے
 سو وہ شکر نعمت او کہ ہوئے بہر
 سو نعمت ستین یوں بدھے چم بھیر
 ولے جن کرے عجز سون اعتراف
 قبولے کرم سات را کہیے معاف
 بہو عجز سو آس احمد دھرے
 کہ سائیں دکھت عجز رحمت کرے

بعض ہندی الفاظ کے املا میں بھی وہ ہم سے مختلف ہے۔ مثلاً
 دکھ، سکھ، مکھ، رکھ وغیرہ کو دکھ، سکھ، مکھ، رکھ لکھتا ہے۔
 لیکن تھ، ساٹھ، ہاتھ، کچھ وغیرہ کو تھ، سات، ہات اور کچ کی
 شکل میں تحریر کرتا ہے۔

بعض حروف و اہاء کی قدیم شکلیں دکھائی جاتی ہیں۔
 خیال، خیال (باشام یا)، مشاطہ، مشاطا (بغیر تشدید)، بغیر، بغیر
 (بہ تخفیف یا)، آزماتا، آزماتا (بغیر مد)، سالک، سالوک (بہ فک
 اضافہ)، سبھی، سبہ۔ بوند بوند، بند بند۔ باھر، پھر۔ اکیلی، یکیلی۔
 ہے، تھے۔ مجھے، منجے۔ اور، ہور۔ میں، مانہ۔ نہیں، نالہ۔ تو، تیا۔
 بھی، ہی۔ کبھی، کبہیں۔ ہے، اچھے۔ کا، کیرا۔ میں، مان (ظرفید)۔
 میں، منی (ظرفید)۔ چلاتا، چالنا۔ گلاتا، گالنا۔ آگ لگائی، آگ لائی۔
 چلا چلا کر، چال چال کر۔ ہوں، اچھوں۔ چھری، چھوری۔ میں ہوں،
 میں سو۔ کبھی، کدہیں۔ پت، پھوت۔ پت، پھوتیکر۔ طرح، دھاتھ۔ تیرا
 سنی، تمہ سنی۔ سب کچھ، سب کوچ۔ پھلی، پھلی۔ چلا لیتی، چال لیتی۔
 کیا، کیتا۔ دیا، دنیا۔ جوش کر کے، جوش کر گن۔ سراہنا، سرہانان۔
 رکھتا، را کہتا۔ آب، آہیں۔ سورج، سور۔ چاند، چندا (ہاتون غنہ)۔
 جو کچھ، جے کچ۔ کا، کرا۔ لک، لک۔ چوما، چما۔ پت، پھونیک۔
 ہزار، سہس۔ میرا، منج۔ بھنورا، بھنور (بہ تحریک واو)۔ ہے، تے۔
 کہ، جو۔ انہوں کا، انوکا، ساتوں، ستیں۔ کے، کہ۔ تلے، تل۔

مثنوی کے افتتاحیہ آیات یہ ہیں :

اس اللہ کے نانتوں سون سب جگت
جودانی دیا دلت اس کی صفت

سرہانا سب اللہ کون چم قرار
جو جگت کا دھنی ہوو پروزدگار

جو دنیا میں کافر مسلمان کون
منگے من سو بخشے بہیمان سون

شاعر نے حمد کے بعد تین مناجاتیں لکھی ہیں ۔ ان مناجاتوں کے
پہلے پہلے بیت پر قناعت کرتا ہوں :

مناجات اول

الہی جو میں داس ہوں تو دھنی خدا میں گدا ہوو تو ہے غنی

مناجات دوم

رحیمی سو رحمت کرے سو رحم کریمی کے سب گن دھرے سو کریم

مناجات سوم

جگت کا غنی سب سکت کا دھنی جو اسکوں سےی کہریا ہوو منی
یہ کتاب ہمد قلی قطب شاہ کے نام پر لکھی گئی ہے ۔ سرخی کے
علاوہ بادشاہ کا نام شعر ذیل میں ملتا ہے :

ہمد قلی قطب شاہ ہے شاہان جمے چرن سیوک شاہان جہان
بادشاہ کی فرمائش کا ذکر ذیل کے آیات میں ملتا ہے ۔

جو منج بخت کسو نفع باور ہوا

سو منج بخت کا سیوک انبر ہوا

جو شہ آپ تھے آپ منج بناد کر

منجے غم کی بندگی تھے اذاد کر (کذا)

دینی امر علی کی یہ باغ لاؤں

جو ہا لون اے شہ اسریت نالوں

جو میں شاہ کا امر سر پر لیتا
 قسرت باغ لائی شہابی کیسا
 ہونیک پریشانی روزگار
 اگرچے منجھے سلامت سو ہمار
 ہو تیک شغلان سبیں رات دن
 لکھی منج فرحت بھلا یک بن
 ولے اس دھر شہ کے فرمان پر
 لکھا تین سنگارن ہو قصد دھر
 دھری عشق کی پاس اس بنی بھول
 جو اس پاس پر جوں بہتور جگ کوں بھول
 سو کچ عشق کوں اب جگت میں جگاؤں
 جو گھر گھر کے لیللی و مجنوں او جاؤں
 جو لیللی و مجنوں تھے بولوں بوران
 سو تازہ کروں اب اتوں کا بوران
 جو اس بن چمن پر تھے گزرے ہوں
 ہوں پاس تھے پاس لے سرکب بن
 جو اس باغ پرشہ کا داغ ہے
 سو باغوں میں یہ باغ شہ باغ ہے
 دھنی باغ کا شہ میں باغبان
 بہنور باغ کا کیوں نہوے آبان
 جو اس باغ مہکار تھی جگ بھرے
 سو سرمست کر قدسیاں کو دھرے
 سو کچ شہ کوں یہ بن مبارک رہو
 جو اس بن تھے ہر روز نوروز ہو

شہنشاہ کے ارکان دولت جیسے کوئی
 مبارک انوں پر بھی یہ باغ ہووے
 جسکوئی باغ کی باغبانی کرے
 سو اس باغ تھے شادمانی کرے
 دہنی باغ کا باغبان کسوں نواز
 جو مرحمت سوں کرے سرفراز
 جو احمد کرے آس دھر بن سنگار
 سو اب شہ تھے ہسائے سیتیں سنگار

احمد ایک ایسے عہد میں جب کہ اودو زبان اپنا گہوارہ چھوڑ
 کر گھٹنوں چلنے کی کوشش کر رہی تھی ، خاصی مہارت اور قادر الکلامی
 کا ثبوت دے رہا ہے ۔ اشعار آئندہ میں اس نے مجنوں کے باپ کے
 جذبات کا خاکہ کھینچا ہے ۔ موقع یہ ہے کہ قیس آبادی کو چھوڑ کر
 جنگل آباد کر چکا ہے ، اس کے باپ کو خبر ہوئی ہے ، بے تاب ہو کر
 آتا ہے ، فرزند کی زار حالت دیکھتا ہے ، اس کا دل کڑھنا ہے اور
 سچپانے کی کوشش کرتا ہے :

گیا ہوت کا سکھ دکھن آس سو
 رہا ہوت کے دکھ سوں تر آس سو
 تری آگ تھے جیو میرا چلے
 تری آہ تھے موم ہوتن گلے
 کینا تو چلے ہوو جالے منجے
 تیا کیا گلے ہوو گالے منجے
 جوتوں ہے ہار تین منج کون
 ہنسوں کیوں جو روئے دیکھوں تیں کون
 میرا جیو ہے تون سرے لالے
 چلے جیو جس کا سو کیوں نا چلے

رکھیا آس جوتوں ہواے مل
 بھانیا کہ تون یوں جھکاوے جنگل
 جو کھر چھوڑ جنگل ہائے لگیا
 سو ج تھے جنگل ہوو جنگل ی جاہا
 نین میکہ ہر سن جو ہوئے نپاس
 کلے ہر بٹاں ہوو جلے سب اکاس
 ولے دل ترا کج پگھلتا نہیں
 جو میرے کہے سات چلتا نہیں
 رہی مائی جانا کندن میں جرم
 سو اس پر نہیں چک تیرا کرم
 ولادت بھنوں :

بغیر از خدا کون قدرت رکھے
 جو ہائی سورۃ گیری کر سکے
 ہو چاہو کہتی دیکھت کرب جب
 سو ہووے ہووے کرب کے ماس سب
 جو ناموس کون چودواں چاند ہووے
 ار کھاپا اچالا کیتا جگ دوئے
 نکھا مکھ مبارک دیکھی دانی جب
 سنی میں دہی سرتھی پک لاگ سب
 ایسے دانی پھل تیرسوں سر نہلائی
 دلے ان کتک دان سوں میں نہائی
 بیہائی اوڑائی امولک حریر
 کہتی دانی کون مان دیکر کنبھیر

خوشیاں کرا دے قیس راکھی جو نام
 لگی وارنے دام اس پر کام
 غزینے دفینے دیسی وار وار
 تو سسکائے قیصران ہوئے مالدار

احمد کے کلام میں پختگی کے علاوہ اس کی زبان میں صفائی اور
 زور دونوں موجود ہیں۔ یہ آیات ملاحظہ ہوں جن میں ایک بزرگ
 مجنوں کے باپ کو اس کے اولاد نہ ہونے پر تسلی دیتے ہیں :

خداوند جگ کا کریم و رحیم
 کچھ دیس حکمت سودے دو حکیم
 جسے کچھ حکمت اس کی تقاضا کرے
 سو وہ چہور کس دھاتھ دوجا کرے
 نہیں باج حکمت کچھ اس کا کہیا
 لین مصلحت کچھ لیا ہوور دیا
 بہو ٹیک مرادان نہوے مرحمت
 سو اس میں آہیں غیر ہوور مصلحت
 کسی ہر سو نعمت ہلا ہو بھرے
 کسی کو ہلا دے سو نعمت کرے
 نہ استہی ہلا دیک نہ آس ہووے
 نہ نعمت کون بھل کرشی دھاگ کوے

ان اشعار پر بھی نظر رہے :

- (۱) میری خاک میں نہیں جو اچھے نہال
 وفا کے لگے بھول بھول ڈال ڈال
- (۲) جو روشن کرے رات کون آہ سوں
 سو ہوے روشنی دین کی راہ کون

(۳) سنے کی چھوری ہوئے تو کیا ہوا
نہیں پیٹ میں مار لیتا روا

دکن میں اردو کے ساتھ ساتھ طلبہ عوام میں فارسی بھی بولی اور سمجھی جاتی تھی لیکن وہ اس قسم کی فارسی ہے جس پر تعلیم یافتہ طبقہ ہر زمانے میں ناک بیہوش چڑھائے گا۔ احمد دکنی اس مثنوی کا ناظم اردو کا زبردست شاعر ہے لیکن فارسی سے بے بہرہ ہے۔ اگرچہ اپنی مثنوی میں اس نے بعض موقعوں پر حکمت اور نجوم کی اصطلاحات کو خوب بیٹا ہے۔ وہ اپنے مذہب سے بھی جو شیعہ تھا، بغض و اقباع معلوم ہوتا ہے۔ اور ایک شعر ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بوستان سعدی سے بے خبر نہ تھا؛ مثلاً سعدی کے مصرع ”مر او را رسد کبریا و منی۔“

کا جیسے اس نے اپنی زبان میں اس طرح ترجمہ کیا ہے : ع
”جو اس کو سہی کبریا و منی“

تاہم کہا جا سکتا ہے کہ اس کی فارسی ہارے عہد کے کالجوں کے انگریزی خوان طلبہ کی فارسی سے کسی طرح بہتر نہیں تھی۔ میں اس کتاب کی سرخیوں سے جو فارسی میں مرقوم ہیں، بعض فقرات نقل کرتا ہوں :

”نزد درویش بردند بھنوں را پندو او“

دیگر : ”بھنوں فقیر شدہ بد خانہ لیلای وقتند“

دیگر : ”آں صحیفہ دہند لیلای و باز مضمون آں صحیفہ فرستادن نزد بھنوں“

دیگر : ”پندو بھنوں پنانہ لیلای رفتن“ (کذا)

دیگر : ”پنہاں کردند لیلای را دشنام دادند مادر“

دیگر : ”پندو لیلای دختر خود را بردند بھنوں نزد شتر لیلای آمدند“

دیگر : ”دو خواب لیلای بھنوں مردہ دید خود واتب آمدند“

میں نے دانستہ احمد کی شاعری کے متعلق کچھ نہیں کہا ہے اس لیے کہ ایک قدیم زبان کے ساتھ جو اب سے تین سو سال پیشتر رائج تھی ، وہی شخص انصاف کر سکتا ہے جو اس زبان کا پورا ماحر ہو ۔ اس امر میں شک نہیں کہ ادب اردو کی تاریخ میں اس مشوی کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے ۔ اس کے ذریعے ہمیں ایک ایسے شاعر کا سراغ ملا ہے جو اب تک نا معلوم تھا ۔ دکن میں جتنے شعرا گزرے ہیں اور جن کے حالات تذکروں میں ملتے ہیں ، سب کے سب بد قلی قطب شاہ اور احمد کے دور کے بعد کے ہیں ۔ اس نظر سے بھی یہ مشوی خاص وقت کی مستحق ہے ۔

یہاں ایک اور امر کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ احمد کے ہاں جو نظم کی حالت دیکھی جاتی ہے ، اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ مشوی کا ابتدائی نمونہ نہیں ہے ، بلکہ ایک ایسے وقت کی یادگار ہے جب کہ نظم نے ایک معتدبہ حد تک ترقی کر لی تھی ، اس لیے ضروری ہے کہ سلاطین ہمنیہ کے دور میں بھی اردو شعرا موجود ہوں ، لیکن ان کے کلام کا سراغ لگانا حضرات دکن کا کام ہے ۔

سب رس

ملا وجہی کی قابل قلم تصنیف 'سب رس' (یعنی قصہ حسن و دل) مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے مرتب کر کے ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے شائع کی تھی۔ زیر قلم مضمون حافظ صاحب مرحوم نے 'سب رس' پر بطور تبصرہ تحریر کیا تھا اور 'اورینٹل کالج میگزین' بہت نومبر ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا تھا۔ (مرتب)

فتاحی نیشا پوری نے 'حسن و دل' کا ایک مثالی افسانہ نویں صدی ہجری میں اولاً فارسی قلم میں، بعدہ ثر میں لکھا۔ اس کے بعد متعدد اشخاص نے اس پر طبع آزمائی کی جن میں زیادہ تر ترک اور ہندوستانی اہل قلم شامل ہیں۔ ترکوں میں آہی، لامعی اور صدق کا نام ملتا ہے۔ ہندوستان میں داؤد اہاجی نے فارسی میں اور شاہ بحرالعرفان اور شاہ پیراٹھ ہرمی نے دکنی میں قلم کیا۔ اہل مغرب نے بھی اس میں دلچسپی لی ہے۔ آردو براؤن نے ۱۸۰۶ء میں اور ولیم ہرائس نے ۱۸۲۸ء میں اس کے تراجم بہ زبان انگریزی کیے۔ جرمن ڈاکٹر وڈولف دوراک نے ۱۸۸۹ء میں اصل فارسی متن مع ترجمہ ایک مستعدانہ مقالے کے ساتھ شائع کیا اور مسٹر گرین شیلٹس نے ۱۹۲۶ء میں اصل فارسی متن پھر طبع کیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ قصہ حسن و دل کو فتاحی کے زمانے سے لے کر اب تک خاصی شہرت رہی ہے اور ایک جماعت اس میں دلچسپی لیتی رہی ہے۔

ہمیں مولانا عبدالحق پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد و الہیئر انجمن ترقی اردو کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے اس سلسلے میں

ایک نہایت اہم تالیف دریافت کی۔ اس سے ہماری مراد ملا وجہی کی نثری تصنیف 'سب رس' ہے جو ۱۰۳۵ھ میں عبدالقہر قطب شاہ والی حیدر آباد (۱۰۳۵ھ - ۱۰۸۳ھ) کے واسطے دکنی زبان میں لکھی گئی۔ مولانا نے علمی دنیا کو سب سے پہلے اس کا سراغ ایک عالمانہ مقالے کے ذریعے سے جو اپریل ۱۹۲۵ء کے رسالہ اردو میں چھپا تھا، دیا اور اب اصل کتاب مع مقدمہ و لڑھک ہخلاف نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد ترتیب دے کر شائع کی۔

کتاب کے صفحات کی تعداد ۳۷۲ ہے جن میں مقدمے کے ۵۲، کتاب کے ۲۰۰، لڑھک کے ۱۶ اور غلط نامے کے ۴ صفحات ہیں۔

وجہی کے حالات میں ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے کہ وہ عبدالقہر قطب شاہ کے عہد کا ایک زبردست عالم، بلند پایہ شاعر اور بے مثال ادیب ہے۔ 'سب رس' کے علاوہ جیسا کہ فاضل مرتب نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے، وہ 'تاج الحقائق' ایک نثری تالیف اور مثنوی 'قطب مشتری' کا مالک ہے۔ علوم میں اس کا پایہ معلوم نہیں لیکن اس کے اس کولنامے سے جو ہمارے پیش نظر ہے، اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسلامی علوم والسنہ کے علاوہ ہندوستانی زبانوں میں بھی اس کو کافی دسترس ہے۔ مرہٹی اور گوجری (گجراتی اردو) کے ساتھ ساتھ گوالیری (برج بھاشا) کے لٹریچر سے آشنا ہے، امیر خسرو کے ہندی کلام سے واقف ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ اردو (جسے وہ زبان ہندوستان اور قول اہل ہند کے ناموں سے یاد کرتا ہے) میں جانتا ہے۔ اب جو شخص عربی، فارسی، برج، گوجری، اردو اور مرہٹی سے واقف ہو اور ان کے جیدہ اور منتخب اساتذہ کے کلام پر عبور رکھتا ہو، شعر و ادب کے نکات کو سمجھتا ہو، صحیح دماغ، نکتہ رس طبیعت اور بلند قلیل کا مالک ہو، ظاہر ہے کہ اس کا ادبی مذاق کسی قدر شائستہ اور شستہ ہوگا۔ وجہی کی خوش مذاق کے ثبوت میں یہ کتاب پیش کی جا سکتی ہے۔

'سب رس' اس دقیق اور رنگین طرز میں لکھی گئی ہے جس کو مقلد اور مسجع کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ فارسی اور عربی میں اس

انداز کی بہت کتابیں ملتی ہیں جن میں زیادہ مشہور 'مقامات ہدی' ، 'مقامات حریری' ، 'مقامات حبیبی' ، 'تاریخ وصال' ، اور 'دورۂ قادریہ' قابل ذکر ہیں۔ اودو زبان میں دو کتابیں مشہور ہیں : پہلی 'نوطرز مرصع' از حصین ، دوسری 'فسانۂ عجائب' از مرزا رجب علی بیگ سرور۔ موجودہ دور میں جب ہمارا صحیح مشرق مذاہی اپنے مرکز نقل سے ہٹ کر مغربی ذوق و وجدان کی طرف جھکتا جا رہا ہے ، ہم نثر کے ایسے مرصع کاروں اور عبارت کے معیاروں کو ناپسند کرتے ہیں لیکن تکلف اور طعطران جاری تہذیب کا ایک ما بہ الامتیاز ہے اور اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو نثر کے سادہ کاروں کی بجائے مرصع کاروں کو پسند کریں گے۔ نثر قدرتا روکھی بھیگی اور سادہ ہوتی ہے۔ دقت پسند طبائع اس میں سجع کی چاشنی دے کر خوش آئند بنانا چاہتی ہیں اور نثر میں نظم کا لطف پیدا کر دیتی ہیں اور جس قوم نے اپنی شمولیت کے زمانے میں قرآن پاک کی سجع اور خوش آہنگ آیات ہدایت کی تلاوت کی تھی کسی طرح ممکن ہے کہ وہ قوم بڑی ہو کر اس خاص طرز نگارش میں کوئی دلچسپی نہ لے۔ رنگینی اور رنگیں بیانی مسلمان قوموں کی گھٹی میں پڑی ہے۔

وجہی نے جب آنکھ کھولی ہے ہندوستان میں فارسی زبان کا دور دورہ تھا۔ شمال اور دکن میں فردوسی ، سعدی ، خسرو اور حافظ کے نام لہوا موجود تھے۔ نظم میں تازہ گوئی اور نثر میں خیال بندی اپنا سکہ جا رہی تھی۔ ظہوری نے دکن میں اور ابوالفضل نے ہندوستان میں نثر کے ایسے اعلیٰ نمونے پیش کیے جو آئندہ چل کر ادبی شاہکار مانے گئے۔ عرف ، نظیری اور لہی نے شعر کو حد کمال تک پہنچا دیا۔ مغل اور دکنی سلاطین کے زوق برق درباروں میں اہرائی اور ہندوستانی ہاکالوں کا جھکھٹا رہتا تھا۔ شعر و سخن کی محفلیں گرم تھیں اور گھر گھر فارسی کا چرچا تھا۔ مختصر یہ کہ ہندوستان تہذیب و شائستگی میں رشک صفایان و شیراز تھا۔ وجہی تہذیب و تربیت کے لحاظ سے بالکل فارسی رجحان کا ادیب تھا اور جن بلند ادبی نمونوں کی فضا میں

اس نے تربیت پائی ، انہی کے اتباع میں اس نے اپنے اس شاہکار 'سب و س' کی بنیاد ڈالی ۔ فارسی میں رنگین نگاری چنداں مشکل نہیں ہے ۔ لیکن وجہی نے اپنی ادبی مہم کے لیے جس زبان کا انتخاب کیا وہ اردو تھی ، جس زبان میں اس کا کوئی رعبہ تیار نہ پیش ہو ۔ اردو ان اہام میں بعض معمولی بول چال اور تفریح کا ذریعہ تھی ۔ اس میں ہر قسم کا ادبی سرمایہ مفقود تھا ۔ نظم میں الجشہ کجرات اور دکن میں بعض تالیفات تھیں لیکن جہاں تک نثر کا تعلق ہے مطلع بالکل صاف تھا ، سنائے اور ہو کا عالم تھا ۔ ان حالات میں وجہی کا دنیا کے سامنے یکایک ایسی بلند پایہ تصنیف پیش کرنا درحقیقت اعجاز سے کم نہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ وجہی کو اپنی جنت طرازی کا پورا پورا احساس ہے ۔ اس نے اردو میں جدید شاہراہ کھولی ہے ، وہ اس کی اہمیت اور مہم کی دشواریوں کا ذکر بار بار دہیاجے میں پورے شد و مد کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں کرتا ہے :

”فرہاد ہو کر“ دونوں جہان نے آزاد ہو کر ، دانش کے تیشے سون چھاڑاں لٹایا تو یو شیریں پایا ، تو یونوی ہاٹ پیدا ہوئی تو اس ہاٹ آیا ۔“ (صفحہ ۳۱)

”چکنوئی اچاپا بنیاد ، اول آخر وہی استاد ۔ یو عجائب نظم ہوو نثر ہے ۔ جانو بہشت میں کا قصر ہے ۔ سطر سطر پر برستا ہے نور ، ہر یک بول ہے یک ہوو ۔ اسے پڑ کر جنے حظ پایا ، جانو بہشت میں آیا ۔“ (صفحہ ۳۱)

پھر حال وجہی اپنے کلماتے پر اور اردو وجہی پر جس قدر فخر کرے کم ہے ۔

’سب و س‘ کا طرز بیان رنگینی کے التزام کے باوجود شگفتہ اور دلکش ہے ۔ عبارت کی آرائش اور قافیے کی پابندی کے باوجود مصنف سے سلاست کا دامن نہیں چھوٹا ہے ۔ کتاب اگرچہ دکنی میں لکھی گئی ہے اور دکنی بھی وہ جو جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانوں میں بولی جاتی تھی ، تاہم اردو خوان اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں ۔

کتاب کا پلاٹ چنداں دلچسپ نہیں ، فرائض افسانہ نگاری سے عام طور پر پوری غفلت برقی گئی ہے ۔ لیکن ایک ادبی ہائے کی تصنیف میں یہ نقص چنداں قابل لحاظ نہیں ۔ ایسی تصنیفات کا مقصد درحقیقت افسانہ نگاری نہیں ہوتا بلکہ افسانے کے پیرائے میں اخلاق سبق اور دوس حیات دینا اور ساتھ ہی مبین خیالات کو ایک دلفریب پیرائے میں ادا کرنا : اسی لیے ایسی کتابوں میں اخلاق پہلو ہر بیانے سے نمایاں کیا جاتا ہے اور طبیعت کا تمام زور اسی پر صرف کر دیا جاتا ہے ۔ نظامی خسرو اور جامی کی مثنویات کا یہی ڈھنگ ہے اور اس نقطہ نظر سے نسب و سہ ان کی نہایت قریبی مقلد ہے ۔

مصنف کی عام معلومات ، دوسری زبانوں کے تقریر سے اس کی وسیع آشنائی اور عام زندگی کے تجربے نے اس کو اس بات کا اہل بنا دیا ہے کہ زندگی کے اخلاق اور معاشی مسائل ، فضائل و رذائل اور معائب و اوصاف پر صحیح طریقے سے رائے زنی کر سکے ۔ اس تعلق میں وہ اپنی معلومات کے ذخیرے سے جو غیر محدود معلوم ہوتا ہے ، کام لیتا ہے ۔ آیات کلام پاک ، احادیث و اقوال بزرگان ، اسانہ کے اشعار اور دیگر مختلف زبانوں کی امثال کے برعمل ایہاد سے کتاب کے حسن کو دوہالا کر دیتا ہے بلکہ اپنی طرف سے بھی پاکیزہ خیالات اور چست فقرات کا اضافہ کرتا ہے ۔

ادبی پہلو سے قطع نظر اور اوصاف میں جن کی بنا پر یہ کتاب گونا گوں دلچسپیوں کا مرکز بن جاتی ہے ۔ لغت و لسان اور قدیم صرف و نحو کے محقق اس کو ایک نعمت غیر مرقبہ سمجھیں گے ۔ بالخصوص اس کے اس حصے کو جو قدیم محاورات اور ضرب الامثال سے تعلق رکھتا ہے ۔ اسی طرح فارسی بھی اس میں نمایاں حصہ لیتی ہے ۔ اردو پر فارسی کا اثر صرف الفاظ و محاورات و ضرب الامثال تک محدود نہیں ہے بلکہ اسلوب بیان ، طریق ادا اور حرفی پہلو تک پر عامل ہے ۔ آئندہ صفحات میں اتنی چند خصوصیات پر ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے ۔

جن بعض امور پر یہ کتاب بالواسطہ روشنی ڈالتی ہے ان میں

سب سے اہم وہ ہے جو اردو اور برج سے متعلق ہے ۔ ہمارے ہاں یہ نظریہ مہبول عام ہے کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے ، یعنی جب سے برج بھاشا میں فارسی عربی الفاظ کا بیوند ہوئے لگا اردو پیدا ہوگئی ۔ یہ نظریہ اردو زبان کے بہترین مورخ مولانا آزاد کا ہے ، لیکن وجہی کے ہاں ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں زبانیں بالکل مختلف ہیں ۔ اردو کو زبان ہندوستان یا تول اہل ہند کہنا ہے اور برج کو گوالیری کے نام سے یاد کرتا ہے ؛ جس طرح اردو نام قدیم نہیں ہے اور خان آرزو کے عہد سے رواج میں آیا ہے ، اسی طرح برج نام بھی قدیم نہیں ، فارسی اہل قلم اردو کو ہندی یا ہندوی کہتے ہیں اور برج کو گوالیری ۔ مغلیہ عہد کے مصنفین ابوالفضل ، عبدالحمید لاہوری ، محمد صالح بلکہ خان آرزو تک برج کو اسی نام سے پکارتے ہیں ۔ وجہی ان دونوں زبانوں سے دوہرے اور کہاوتیں نقل کرتا ہے ۔ دوہرے گوالیری سے اور کہاوتیں اردو سے ، اور جہاں جس زبان سے اس نے کچھ لیا ہے وہاں اس زبان کا حوالہ دے دیا ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ ہندوستانی اور گوالیری کو دو مختلف زبانیں مان رہا ہے ۔ خان آرزو جو وجہی کی طرح ان دونوں زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں ، پھر ان زبانوں کو دو مختلف زبانوں کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں ۔ ایک ان کے نزدیک گوالیری ہے جو 'الصح السنہ ہند' ہے اور دوسری 'زبان اردوی معلی' یا 'زبان شاہجان آباد'۔ ان بزرگوں کے بیانات کی رو سے جن میں پورا ایک ڈیڑھ صدی کا فاصلہ ہے ، صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونوں زبانیں معاصر ہیں اور ان میں ماں بیٹی کے تعلقات ہرگز ہرگز نہیں ہیں ۔

امیر خسرو کی ہندی شاعری ہمارے ہاں معرض بحث میں ہے ۔
 'سب رس' میں خسرو کا ایک ہندی دوہرہ درج ہے وہوہذا :

یہ

بنکھا ہو کر میں ڈولے ساق تیرے جاؤ

منجہ چلتے جنم کیا تیرے لیکھن باؤ

یہ گویا ایک قدیم مانعہ ہے خسرو کی ہندی شاعری کا ۔

عربی اقوال

کتاب میں عربی مقولے کثرت سے ملتے ہیں اور مصنف نے نہایت خوب صورتی کے ساتھ ان کا استعمال کیا ہے :

(صفحہ ۲۳) جس میں سلوک وہی سالک نہیں تو، مٹھنوں میں ذالک ۔

(صفحہ ۵۸) دانایان میں یوں چلی ہے بات ، العقل نصف الکرامات ۔

(صفحہ ۱۶۷) مرضیٰ فرماتے ہیں : جنو کی بات دائم قائم ، عرفت یں بلسخ العزائم ۔

(صفحہ ۱۷۳) کھولے ہیں اسباب کی گرہ ، کہے ہیں ، الدنیا مزوۃ الآخرة ۔

(صفحہ ۱۸۱) صیوری نے دنیا صیوری نے دین ، مصحف کی آہت ہے ان الله مع الصابرين ۔

(صفحہ ۲۰۱) مصحف میں یوں دیے ہیں خبر ، اذا جاء القضاء همی البصر ۔

(صفحہ ۲۰۸) مصحف کی آہت بھی آئی ہے یہاں رھنوں ، کل حزب بما لديهم فرحون ۔

(صفحہ ۲۵۶) نتیجہ (ہمیں) نہیں سمجھے کس کا کیا کرنا کلمہ ، پیغمبر کہے ہیں کہ "المرء عند المعاملة" ۔

(صفحہ ۱۸۳) عافلان نے ہی یوں کہے کہ ، آخر الدواء الکھ ۔

صرفی خصوصیات

ظاہر

بعض تو وہی ہیں جو اردو میں رائج ہیں ، بعض ایسے ہیں جو اردو سے مختلف ہیں ۔ میں ان کا یہاں ذکر کرتا ہوں :

(۱) فاعلی جمع متکلم = ہمیں (ہم) :

(صفحہ ۱۳۶) "ہمیں ہی عجب سرد ہیں ، بہت کوئی بڑے فرد ہیں ۔"

(صفحہ ۸۰) ”دنیا میں کون سا راست کرتا ، ہمیں بحث کیجے
تھے سنے کی آس آتا۔“ (یعنی ہم نے)

(صفحہ ۲۵۹) ”انوکے دلائل میں کہ ہمیں کرتیاں ہیں تاز۔“

(۲) مفعول جمع متکلم = ہمتا (ہم کو)۔

(صفحہ ۲۲) ”ہماری نہایت کی معلوم نہیں ہوئی خبر ، اس کے
نہایت کی کسے خبر۔“

(صفحہ ۱۱۸) ”ظاہر کی صورت ہماری دیکھتے ہیں ، اپنے باطن کی
ہمتا کون دکھاؤ۔“

(۳) مجروری جمع متکلم = ہمتائے (ہم سے)۔

(صفحہ ۱۴۶) ”ہر ایک کام اے سنبھالتا آتا ہے ، نہیں تو کیا
ہمتائے سنبھالیا جاتا ہے۔“

لیکن نہایت تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ ’ہم‘ جو اردو میں اس قدر
عام ہے ، اس کتاب میں بہت کم ملتا ہے۔

(۴) قاعلی جمع حاضر = ہمیں (تم)۔

(صفحہ ۲۴۷) ”کھانے میں بے اڑیا لون ، اتال ہمیں کون ہمیں
کون۔“ (یعنی تم)

یہاں علامت جمع حذف کر دی گئی ہے اور یاد رہے کہ اسلئے
آئندہ میں جائے خطایہ ’ہو‘ غائب کی علامت ’ہیں‘ لائی گئی ہے۔

(صفحہ ۸۸) ”نظر پر چھپا کہ ہمیں کون ، ہیں کیا نام دھرتے ہیں ،
کیا کام کرتے ہیں ؟“

(صفحہ ۱۱۹) ”ہمیں دونوں ہی میرے ہر عاشق ہیں۔“

(۵) واحد غائب = آن (اس)۔

(صفحہ ۱۳۱) ”آن نے سنیا کہ دل اتال جاتا ہے۔“

(صفحہ ۵۱) ”آنے کہیا اے پیر سلام صاحب تدبیر سلام ،
آنے کہیا اے جوان علیک سلام۔“

(صفحہ ۳۱) ”جننے خلیفے کون نہیں سمجھیا اونے کیا سمجھیا۔“

(۶) جمع غائب = انو (انہوں)۔

(صفحہ ۱۲) ”جنوں کے دل میں دائر نے کیا تھا گھر ، انو

دیکھتیج کہے کہ تیں حق کے برحق پیغمبر۔“

(صفحہ ۱۲) ”انو کے دلاں انو کیاں انکھیاں انو کے کٹان قدرت

سون ہاند کر خلعت کی دی گرہ۔“

(۷) جمع غائب = اینو (انہوں)۔

(صفحہ ۳۸) ”تیرے پاس بی صاحب شمشیر

صاحب تدبیراں ہیں ، اینو کا دل مات لے ، اینو کی

سون کی بات لے ، اینو سون قول قرار اچھہ۔“

اصم اشارہ

واحد قریب : ان (اس)۔

(صفحہ ۱۳۲) ”ان چورے ان حرام خور نے چاڑی کھایا۔“

(صفحہ ۲۵۵) ”ان چھتال نے مجھے جیووی ساری ، ان چھتال نے

اپنا دند ساری ، ان چھتال نے میرا گھر گھالی ،

ان چھتال نے مجھے دیس اتتر دی۔“

ایضاً = بو (وہ) :

(صفحہ ۱۳) ”دانس کے توشے سون پہاڑاں التایا نو یو شیریں پایا ،

تو یو ٹوی باٹ پیدا ہوئی۔“

(صفحہ ۵۹) ”لہوے نے بو ملک ہوراج آیا ، لہوے نے بو تخت

بو تاج آیا۔“

واحد بعید = وو (وہ)۔

(صفحہ ۱۵۳) ”جس کوٹ کون کوٹ کہیا جائے سوہو کوٹ ہے ،

ہو کوٹ ہوے تو وو کوٹ سپاوے ، بو کوٹ

نیں تو وہ کوٹ کیا کام آے۔“

جمع قریب = یو (۶) -

(صفحہ ۳۹) ”انو کا عشق فاش ہوا تو یو حکایتاں چلیاں آجئون۔“

(صفحہ ۱۳۲) ”یو دونو جنے مل کر متکئے ہیں جو دل کون دیدار

کے شہر کے اودھر لے جاویں۔“

(صفحہ ۱۳۳) ”یو بولان لوگان رکئے ہیں چن چن۔“

(صفحہ ۹۲) ”حسن یو سواد بھریاں باتان سن ، یو کھریاں

باتان سن کچھ فکر دل پر لیائی۔“

اس آخری ’یو‘ کو اگرچہ اس میں کوئی علامت جمع موجود نہیں ، میں نے جمع مان لیا ہے ، کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری زبان ایک بڑی حد تک جس میں صرفی امور بھی شامل ہیں ، قدرتاً فارسی کا اتباع کر رہی ہے اور فارسی میں قاعدہ ہے کہ جس طرح واحد کے ساتھ اسی طرح ’این‘ یا ’ان‘ جمع کے ساتھ بھی لایا جاتا ہے مثلاً ’این مرد‘ و ’این مردان‘ نہ ’این مرد‘ و ’اینان مردان‘۔ اردو جو فارسی کے آغوش میں پرورش پاتے ہوئے ، اپنی دکنی شاخ میں جو قدیم سے اس قاعدے کی پابند ہے ؛ اس لیے پچھلی مثالوں میں ’یو‘ اسم اشارہ غائب تھیں۔ بولان حکایتاں وغیرہ مشارالہ جمع کے ساتھ آ رہا ہے۔ حالانکہ اردو میں اسم اشارہ جمع میں بھی موجود ہے ، یعنی ان اور ان وغیرہ۔ میں اپنے اس عقیدے کی تائید میں مثال ذیل عرض کرتا ہوں :

(صفحہ ۵۶) ”معن اس داروان کا دلربا شہر دیدار ہے۔“

اس مثال میں ہم دیکھتے ہیں کہ داروان جمع کے ساتھ ’اس‘ واحد لایا گیا ہے ، حالانکہ مصنف اس کی بجائے اگر ’ان‘ کہہ دیتا تو زیادہ صحیح ہوتا۔ مگر چونکہ دکنی فارسی کی منقہ ہے اور فارسی میں ایسی صورت میں ’معن این داروا‘ لایا جاتا ہے اس لیے وجہی عبور تھا کہ محاورے کے مطابق ’اس‘ لائے۔ جدید اردو میں اس میں شک نہیں اشارہ اور مشارالہ دونوں جمع آتے ہیں یعنی ’ان داروان کا معن‘۔ ان مثالوں پر بھی نظر ڈال لی جائے :

(صفحہ ۱۱) ”آج لگن کوئی اس جہان میں ، اس ہندوستان میں ،

ہندی زبان سوں ، اس لطافت اس چہندان سوں

نظم ہو رثر ملا کر گلا کر یوں نہیں بولیا ۔“

اس مثال میں ’چہندان‘ جمع کے ساتھ ’اس‘ واحد آیا ہے ۔

(صفحہ ۲۱) ”کیا تھا ، کیا ہے ، کیا ہوئے گا ، اس باتوں سوں

ہمنا کیا کام ، ہمنا خدا کون ایک جاننا ہو ر اس کا

محبت ہے فرض ، خدا کے کاماں سوں ہمنا کیا غرض ۔“

یہاں ’اس باتوں‘ اردو محاورے کے خلاف ہے ۔

(صفحہ ۵۲) ”جس انکھیاں کو دیدار کی لگی حیرانی ، اس انکھیاں

کا کیوں ہووے ایسا ہانی ۔“

اس مثال میں ہونے قاعدہ ’جن انکھیاں‘ اور ’ان انکھیاں‘ چاہیے

مگر مصنف فارسی کی تقلید کر رہا ہے ۔

(صفحہ ۱۱۳) ”ایک جھاڑ اے کتیاں ڈالیاں سن ، ہر ایک ڈالی

میں جس جس کے گن ، اس ڈالیاں میں بھی رنگ رنگ

کے بھلے ہیں بھول ، بھول کتا میں ڈالی نے

آیا ، ڈالی کتنی میں جھاڑ میں نے آئی ، سب جھاڑ ہے

نکو بھول ۔“

اس میں ’ڈالیاں‘ فارسی محاورے کے مطابق ہے ۔

(صفحہ ۱۵۸) ”وہم کی باتاں کا اس پر اثر چڑیا ، جو کچھ وہم

کیا تھا سو اس کاماں کے خیال میں پڑیا ۔“

یہاں یہ بھی اضافہ کیا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں ضمیر اور اسم اشارہ

میں بھی التباس ہو جایا کرتا ہے ۔ ’وہ‘ ’اس‘ ’ان‘ وغیرہ میں جو

اسم اشارہ بھی ہیں اور ضمیر بھی ، تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے ۔ یہ

بے ضابطگی خود ہماری پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ اسے فارسی سے میراث میں

ملی ہے ۔ فارسی میں بھی ’او‘ ضمیر اور ’آن‘ اشارہ میں مغالطہ ہو جایا

کرتا ہے ۔ چنانچہ قواعد نگار اس گتچلک کو رفع کرنے کی کوشش

کرتے ہیں ۔

’آں‘ اگرچہ بہ ظاہر مشترک ہے مگر دو حقیقت اشارہ و ضمیر میں فرق ہے ۔ چنانچہ کہہ سکتے ہیں : آنکس ، آن مرد ، اور نہیں کہہ سکتے لوکس ، او مرد ۔“ (جامع القواعد)

میں نے امثال بالا میں ’ضمیر‘ اور ’اشارہ‘ کی شناخت کے واسطے فارسی قواعد سے کام لیا ہے جو دکنی پر تو بالکل درست بیٹھتے ہیں ۔

جمع

الف نون کے الحاق سے عام طور پر جمع بنتی ہے ؛ البتہ اگر آخر میں الف ہو تو یہ ’الف‘ ہی کے ساتھ بدل دیا جاتا ہے ۔ امثال :

(الف) دانش مندان ، چاترائ ، صورتان ، صورتان ، پھلان ، پھولان ، جھاڑان ، زووان ، فہمداوان ، گن کاڑان ، آنتاہان ، حوران ، بیغمبران ، ہارن ، گلان ، خویشان ، خدمت گران ، دولت خواہان ، امیدواران ، صاحب کمیزان ، ترکش بندان ، گھران ، بیکان ، بولان ، جاہلان ، سردردان ، جناوران ، کوڑان ، صاحب حاصلان ، حکایتان ، غرائفان ، درمندان ، تینان ، سینان ، داروان ، خیان ، چالیان ، آنکھیان ، بنگڑیان ، رنگیلیان ، چھیلیان ، باتیان ، سکھڑ سپیلیان ، چاند جیسیان ۔

(ب) حمزیاں ، غریباں ، عشویان ، پیاریاں ، دہدیاں ، دیوانیاں ، سچیاں ، مسخریاں ، دسریاں ، کنگوریان ، ناریاں ، تلویاں ، مال ملائیاں ، دھتاریاں ، بیہاتیاں ، ریجہاتیاں ۔

حمزہ ، عشوہ ، دینہ وغیرہ اگرچہ ’ا‘ پر ختم ہوتے ہیں لیکن دکنی میں یہ ’ا‘ تحریر و تقریر میں الف سے بدل گئی ہے ۔

تصریف کے قاعدے میں اردو سے مختلف ہے ۔ اردو میں ’پادشاہان‘ فاعلی مفعولی وغیرہ حالتوں میں پادشاہوں بن جاتا ہے مگر دکنی میں یہ دستور پادشاہان رہتا ہے ۔ چنانچہ :

فاعلی = (صفحہ ۴۸) ”ہرے لوکل شہر میں کوئی کوئی بھرے
ہیں۔“

ایضاً = (صفحہ ۴۱) ”خدا کے دوستان نے بولے ہیں۔“

- مفعول = (صفحہ ۵۱) ”وہاں کے لوگ کون پوچھیا۔“
 اضافی = (صفحہ ۱۵) ”معتشوقان کے تازاں کیا سمجھتے ، عاشقان
 کے جہنداں کون کیا جانتے۔“
 مجروری = (صفحہ ۵۲) ”کس کس لذت بھرے درداں سوں انکھیاں
 میں نے پڑنا ہے بند ایک ایک۔“

’نے‘ کا استعمال

’نے‘ اردو میں محض فاعلیت کے لیے آتا ہے اور عام قاعدہ یہ ہے کہ فعل بہ حالت جمع و وحدت و تذکیر و تانیث اپنے فاعل کا تابع رہتا ہے ، لیکن جب ’نے‘ کسی جملے میں آتا ہے تو فعل بجائے فاعل کا تابع ہونے کے مفعول کا تابع بن جاتا ہے ۔

دکئی ’نے‘ کے استعمال میں بالکل بے قاعدہ ہے ۔ اس زبان میں وہ فاعل اور مفعول دونوں کے لیے آتا ہے جیسا کہ ہریانہ کا دستور ہے ۔ لیکن فاعلی علامت ہونے کی حالت میں اردو کے برخلاف فعل اپنے فاعل کا تابع رہتا ہے ۔

(۱) فاعلی :

- (صفحہ ۲۸) ”ہادشاہاں نے دنیا کا حظ چھوڑے خلی کا دل توڑے“
 (صفحہ ۹۰) ”غمزے نے نظر کون اپنے گھر لے کر گیا۔“
 (صفحہ ۵۶) ”اس خاطر زلیخا نے کیا کری۔“
 (صفحہ ۲۵۸) ”جن عورت نے اتنی جھل کھائی ، ان نے آخر مرد
 کون گنواۓ۔“

- (صفحہ ۷۱) ”رقیب نے روسیاء نے بے نصیب نے بولیا۔“
 (صفحہ ۹۱) ”یو بات ہوئے پیدیں غمزے نے نظر کون دوسرے
 دیں حسن کے حضور لیا یا۔“

(۲) اردو میں مصدر بولنے اور لانے کے ساتھ نہیں آتا ، دکئی میں آتا ہے :

(صفحہ ۲۱۹) ”وفا با صفا نے بولی۔“

(صفحہ ۱۹۹) ”حسن دہن من موہن جگ جیون نے بولی۔“

(صفحہ ۲۴۱) ”دل کون تو خدا نے باغ میں لایا۔“

(صفحہ ۹۱) ”خدا نے اچھے یاں لایا۔“

(۳) مفعول :

(صفحہ ۲۸) ”بے تک کھانے نے آدمی نے کیا سواد پانا۔“

(صفحہ ۱۱۵) ”آدمی نے خدا کا مال سمج کر چپ رہنا ، کسے کچھ نا کہنا۔“

(صفحہ ۳۱) ”آدمی برا اچھے تو شراب نے کیا کرنا۔“

(صفحہ ۱۵) ”انسان نے اتنا تو حاصل کرنا ہے کہ بارے نماز

کسے لکن اسے خدا بن کچھ یاد نہ آوے۔“
 ”یہ“ نے بالکل اسی طرح ہے جیسے پنجاب میں بولا جاتا ہے۔“

’کر‘ فعل

دو فعلوں میں عطف کے لیے آتا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ فاعل نے پہلا فعل ختم کر کے دوسرے فعل پر عمل کیا۔ ’عصب رس‘ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فعل کا دائرہ عمل بہت وسیع تھا۔ ان ایام میں نہ صرف وہ ایک فعل پر دوسرے فعل کی تقدیم ظاہر کرتا ہے بلکہ اس کے علاوہ اور مقاصد کے لیے بھی آتا ہے :

(۱) علت کے لیے آتا ہے۔ مثلاً :

(صفحہ ۳۱) ”خدا نے جشیا کیا کر ، خدا کے فرمودے میں ہی

ایتھے سکر۔“

’کیا کر‘ یعنی کس طرح اور کس لیے۔ پنجابی میں اس کا مرادف

’کی بکر‘ آج بھی استعمال ہوتا ہے)

(صفحہ ۱۸۶) ”اپنا کام فتح ہوا کر بہت خوش حالی ہائے۔“

(یعنی کام فتح ہوا ، اس سے خوش حال ہوئے۔ فتح ہونے سے)

(صفحہ ۲۹۲) ”خدا جو بادشاہان کو بادشاہی دیتا ہے خلق کو

کیوں ہانتے کر خبر نہیں لیتا ہے؟“

(بد استغماہیہ ہے ، یعنی خلق کو کیوں کر ہانتے ہیں ۔ ”کیوں کر“

آج بھی اردو میں آ رہا ہے)۔

(صفحہ ۵۰) ”نشان اس آب حیات کا کہیں نہیں پایا کر بہت تلمیذ“

(یعنی اس بنا پر تلمیذ)۔

(۲) طرح ، مانند ، سا ، یوں وغیرہ کا بھی مفہوم ادا کرتا ہے ۔

(صفحہ ۲۷۰) ”جتنے خدا کے دوست خدا کوں چھانتے ہیں سب

پی پی راہے کون بڑے ہیں کرماتے ہیں ۔“

(یعنی بڑے کی طرح مانتے ہیں ۔ بڑا کر کے مانتے

ہیں ۔ پنجابی میں آج بھی اسی طرح بولتے ہیں : ”میں

تے نینوں وڈا کر کے سمجھیا سی“ میں تو تجھے بڑا

کر کے سمجھا تھا یعنی بڑے کی طرح)۔

(صفحہ ۱۹) ”اگر چہجہ (ہی) وجہ مطلق کچھ نامستا تو ہرگز

”خدا ہے“ کرنا کہتے۔“

(یعنی ہے خدا کر کے نہ بولتے ، خدا موجود ہے یوں نہ کہتے)۔

(صفحہ ۱۵) ”اجالے کے رهن ہاریاں سوں لڑتا جھکڑتا ۔ اندھارے

کوں اجالا کر سجتا ، لال کوں کالا کر سجتا ۔“

(یعنی اندھے کو اجالے کی طرح اور لال کو کالے

کی طرح سجتا)۔

(صفحہ ۲۶۳) ”عشق میں محکم ہے کر جانتی تھی ، عاشق ثابت

قدم ہے کر جانتی تھی ۔“ (یعنی عشق میں محکم ہے ،

یوں جانتی تھی)۔

(صفحہ ۲۰۹) ”عقل یوں نہائی ہور دل یوں سنہڑیا کر کھپا ،

نسیباں میں چو کچھ لکھا تھا سوا لہڑیا کر کھپا ۔“

(یعنی یوں کہا)۔

(صفحہ ۲۳۱) ”ہم میں ہم ہوں کر کہے۔“ (ہوں ہم کر کے بولے
یا ’ہم ہوں‘ بولے بولے۔)

(صفحہ ۲۶۹) ”گھر میں نے ہمارے لکھنے دیو کر فرمایا۔“
(یعنی گھر سے باہر نہ لکھنے دینا بول فرمایا)۔

(صفحہ ۲۲) ”موسیٰ نے خدا کو دیکھنے کا سوال کیا ، میں دستا
سو دستا کر خیال کیا۔“ (گویا نادیدنی کو دیدنی
کی طرح مانا)۔

(۳) برائے تاکید جیسے ’خاص کر‘ وغیرہ :

(صفحہ ۱۸۲) ”بہت کراسچہ نے حسن کوں چھپانے ہیں۔“ (یعنی
اکثر و بیشتر یا اکثر کر کے)۔

(۴) یہ معنی مصدر بطور فعل مرکب جیسے کر گزونا ، کر چھوڑنا ،
کر بیٹھنا وغیرہ۔ ان میں مفعول مقدر ہے۔

(صفحہ ۲۹۱) ”بادشاہی آئی ولے بادشاہی کر جاننا بہوت مشکل
ہے۔“ (یعنی بادشاہی کرنا یا بادشاہی کا فن یا عمل
جاننا)۔

(صفحہ ۱۳۷) ”صاحب وہیچہ جسے صاحبی کرنی آئی ، نثر وہیچہ
جو کر جائنا ہے نثرانی۔“ (نثرانی کرنا۔ چاکری
کرنا)۔

(صفحہ ۱۱۳) ”عارف کوں ضرور ہے یو غلیب کر جائے۔“ (یعنی
غلیب کرنا)۔

(۵) فعل سابق سے مقدم بھی آتا ہے :

(صفحہ ۱۵۶) ”فرست کا وقت غنیمت کر جان تدبیر پر من
دھرے۔“ (یعنی غنیمت جان کر)۔

(۶) بطور علامت مقلوبہ :

(صفحہ ۲۵۱) دل دستا نہیں کدھر گیا ہے ، کر دھندلے لا گیا ۔
(یعنی ”دل“ دگھوتا نہیں کدھر گیا ہے ، کہہ کر
ڈھونڈھنے لگا) ۔

(صفحہ ۱۳۸) ”القصبہ عشق پادشاہ سون صلاح صلاح کہے ہیں ،
کر بے غم نا اچھنا ، ہر چند ”بھاگ بھروسا کہے
ہیں“ کر بے غم نا اچھنا ۔“

’سی‘ مستقبل

’سب رس‘ میں ’سی‘ مستقبل کا استعمال اس قلت کے ساتھ ہوا ہے
کہ باوجود تلاش مجھے صرف چار صیغے مل سکے :

(۱) واحد غائب :

(صفحہ ۱۰) ”کیا عورت کیا مرد ، جس میں عشق کا کچھ درد ،
اس کتاب کو سینے پر سے ہلا سی نا ، اس کتاب
بغیر کوئی اپنا وقت بھلا سی نا۔“

(صفحہ ۱۹) بعض کہتے ہیں کہ خدا کون اس نظر سون دیکھیا
نا چاسی ، نظر سون خدا کون دیکھیں گے تو خدا
نظر نا آسی ۔“ (اس مثال میں پہلا فعل مجہول ہے) ۔

(صفحہ ۲۷) پادشاہ کون عدل انصاف بغیر ہور کچھ ہوچہ بچار
نا ہو سی ، پادشاہ شراب پیا تو گنہگار نا ہو سی ۔“

(صفحہ ۳۱) ”دوسرے کی تقصیر کا حجت اس پر نا آسی ، کسی
کے گنہ خاطر کسی کون دوزخ میں نا بھاسی ۔“

(صفحہ ۵۸) ”ہمت کی صفت جون ہے تیوں کوئی کرسی نا ،
ہمت کی صفت جہتا کہے ہی سر سی نا ۔“

(صفحہ ۳۱۷) ”بھجے ہو کام بغیر آرام نا ہو سی نا ہو کام نا ہو سی ۔“
مثال مونت :

(صفحہ ۱۳۰) ”جو بات نا آسی میانے میان ۔“

(۲) جمع غائب :

(صفحہ ۱۰۵) ”جو کوئی صاحب دل ہیں ، انو کے دل اس گل

میں نا بھاسیں ، انو کے دلاں پر ایسے خطرے ہو گز

نا آئیں ۔“

(صفحہ ۱۸۳) ”یوہن من عرن ، کون سکے انو کون رام کرن ،

بھاندے میں پاڑیں گے ولے بھاندے میں پڑیں نا ،

دسریاں کون سنڑاویں گے ولے اے سنڑیں نا ۔“

(صفحہ ۲۰۷) ”انوی کھید دیکھے ہیں ، بہون کام کیے ہیں ، دنیا

کا بھلا برا سب نام کیے ہیں ، نہنے کاماں میں

ہرگز نا چاہیں ، کوئی دغا دینے آیا نو دغا نا

کہاں ہیں ۔“

(صفحہ ۲۰۸) ہر ایک کام کیے نو بڑیاں کون خبر کرنا ، آخر

خوب اچھیکا نو کرو کٹیں گے و اگر برا اچھیکا نو

جواب نا دیں ۔ چپ رہیں گے ۔“

(۳) واحد حاضر :

”جو لگن تو سب تے ہے طمع نا ہوسی ، عشق میں آئے بغیر خاطر

جمع نا ہوسی ۔“

(صفحہ ۲۲) موسیٰ کون جواب آیا کہ لن ترانی یعنی نادیکھ سی

نو ہو انوار سبحانی ۔“

(۴) واحد متکلم :

(صفحہ ۲۱۵) میں ایسی نہیں ہوں ، تو بولے بچہیں تدبیر نا کرسوں،

جیو سوں راضی ہوں ، فرما ، تصویر نا کرسوں ۔“

باقی صفحے یعنی جمع حاضر اور جمع متکلم اس کتاب میں نہیں آئے ۔

یہ مستقبل اس اور مضارع کے آمیز ہے بتاتا ہے جس میں امر ابھی اصلی

حالت پر رہتا ہے اور مضارع میں تصریف ہوتی ہے ۔ اس تذکیر و تانیث

میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ’سب رس‘ میں اس ثبوت کے ساتھ اس کا استعمال ظاہر کرتا ہے کہ اس عہد میں وہ متروک ہو رہا ہے۔

ظرفیہ

- (صفحہ ۲) ”ٹھارویں ٹھاویں۔“
 (صفحہ ۳) ”ٹھاریں ٹھاڑ۔“
 (صفحہ ۴۳) ”میانے میان۔“
 (صفحہ ۴۷) ”بازار سے بازار۔۔۔ کو بھیے کو بھیے۔“
 (صفحہ ۵۳) ”چنگلیں چنگل چلیا۔“
 (صفحہ ۵۶) ”رگے رگ میں لہو کون آتا جوش۔“
 (صفحہ ۶۳) ”بازار میں بازار بھرے۔“
 (صفحہ ۶۶) ”گھریں گھر ٹھاریں ٹھاڑ۔“
 (صفحہ ۶۷) ”چمنے چمن۔“
 (صفحہ ۷۵) ”راسک راس۔“
 (صفحہ ۸۳) ”ہاتیں ہات چپو بہتا۔“
 (صفحہ ۲۷۶) ”راتیں رات۔“
 (صفحہ ۲۶۷) ”ہالیں ہال۔“

اسم فاعل

فارسی کے مقابلے میں ہندی اسم فاعل کم ملتے ہیں۔ عام طور پر یہ اسم فاعل مصدر پر ’ہار‘، ’ہارا‘ اور جمع میں ’ہارے‘ کے اضافے سے بنتا ہے، جیسے :

(صفحہ ۱۳۰) ”بولنہارا۔“

(صفحہ ۷) ”چلتہارے۔“

بعض بارے فاعل کے اضافے سے جیسے

(صفحہ ۳۳) ”سنگائی۔“

ایک اور اسم فاعل ہے جو ’تا‘ کے اضافے سے بنتا ہے جیسے :

’چانتا‘ (دانا) اور ’انہانتا‘ (نادان) (صفحہ ۷۷)۔

ایک اور شکل یہ کتب سنسکرت ہے جس میں مصدر سے قبل اسم آتا ہے جیسے : (صفحہ ۱۹۳) 'من موہن' 'جگ جیون' وغیرہ - فارسی الفاظ کی ترکیب سے بھی بنائے جاتے ہیں جیسے : (صفحہ ۲۰) 'پیدا کرن ہار' جو صاف پیدا کنندہ کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے - یہی حالت 'نیت کرنہار' کی ہے - 'خیر انہڑان ہارا' ان سب میں عجیب ہے جو غیر رسانی کا ترجمہ ہے - 'بشنہارا' بھی اسی ذخیرے سے تعلق رکھتا ہے جو ہشتائندہ کے لیے بنا ہے -

اس قسم کے الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ حسب ضرورت الفاظ وضع کیے جاتے ہیں اور ان کے ذریعے سے زبان کے ذخیرے کو وسعت دی جاتی ہے -

لیکن سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اردو اور پنجابی اسم فاعل کی نہایت عام علامت 'والا' قطعاً نظر نہیں آتی یعنی ہونے والا ، چلنے والا ، قسم کے اسم فاعل نہیں ملتے - اس سے ظاہر کہ 'والا' قدیم نہیں ہے - سرسری نظر میں جو الفاظ ملتے ہیں ان میں درج ہیں :

(صفحہ ۱)	سرجن ہار
(صفحہ ۵)	کھپان ہار
(صفحہ ۱۱)	سجیان ہارا - چوسار
(صفحہ ۱۵)	چان ہار - رهن ہار
(صفحہ ۲۵)	جان ہار
(صفحہ ۱۱۱)	کرنہارا
(صفحہ ۲۸۶)	لڑن ہارا - بڑنہارا
(صفحہ ۸۰)	دھتیارا
(صفحہ ۷۳)	دین ہارا - لین ہارا
(صفحہ ۲۰۴)	چیون ہارا
(صفحہ ۲۸۰)	گھر کی رهن ہاری (مونث)
(صفحہ ۲۵۷)	سجین ہارے - جھکڑا لان ہاری - دند کڑی (مونث)
(صفحہ ۲۵۸)	آپ بھاونا (خود پسند کا ترجمہ ہے) آہستا -

- (صفحہ ۵۴) منگٹھارا^۱ (خواہندہ کا ترجمہ ہے یعنی سوائی اور گندا) -
 (صفحہ ۷۱) چور ، پاتی -
 (صفحہ ۸۵) قسمت کون ہار -
 (صفحہ ۱۱۳) دیکھیں ہارا ، دھونٹن ہارا -
 (صفحہ ۱۲۳) نشان دینہارا -
 (صفحہ ۱۳۶) سنبھال ہارا -
 (صفحہ ۱۵۰) متا^۲ کرنے (کٹنا) ہارا - بڑے کون نہنا کون ہارا -
 (صفحہ ۱۵۱) کام آن ہارا -
 (صفحہ ۱۵۲) چھڑاں ہارا -
 (صفحہ ۳) کرتار -
 (صفحہ ۲۶۲) لکھن وئی ، گن بھری ، ہلہار -
 (صفحہ ۱۸۲) من ہرن
 (صفحہ ۲۸۶) لڑن ہارا ، پڑن ہارا -
 (صفحہ ۱۲۸) کیاں ہارے -

تذکیر و تانیث

ہمارے زمانے میں دہلی اور لکھنؤ کا اختلاف مسلم ہے ، اگرچہ جزوی معاملات میں ہے - معلوم ہوتا ہے کہ دکنی میں بھی اس کے متعلق کوئی ضابطہ نہیں تھا - کئی الفاظ ایسے ہیں جن کو وجہی دونوں طرح سے لاتا ہے - مثلاً 'مٹسود' (صفحہ ۶۳) مذکر ہے ، مگر صفحہ ۲۸۸ پر مؤنث ہے - نانواں (صفحہ ۱) مؤنث ہے ، اور صفحہ ۵ پر مذکر ہے - اور بھی ایسے الفاظ ہیں - ذیل کے الفاظ مذکر ہیں :

(صفحہ ۱۳) بھال	(صفحہ ۲۱) ذات
(صفحہ ۲۳) شرط	(صفحہ ۴۹) مشقت
(صفحہ ۵۴) نانوں	(صفحہ ۷۷) عزت ، خاطر

۱ - سندھی میں اب بھی 'منگٹھار' یا 'منگٹھارو' کی صورت میں موجود ہے - (مرتب)

۲ - 'منج کرنے والا' مراد ہے - مرتب

(صفحہ ۸۳)	طرب ، بشارت	(صفحہ ۲۷)	شراب
(صفحہ ۲۸)	خاق	(صفحہ ۳۶)	جان ، آگ
(صفحہ ۳۸)	ناگہر ، لبت	(صفحہ ۳۵)	تاب
(صفحہ ۵۰)	امید واری	(صفحہ ۶۰)	چاشنی
(صفحہ ۷۷)	خاطر	(صفحہ ۹۹)	روح
(صفحہ ۱۰۶)	تجلیات	(صفحہ ۱۱۱)	کثافت
(صفحہ ۱۱۴)	صعبت	(صفحہ ۱۵۵)	خطا
(صفحہ ۱۶۴)	خرم	(صفحہ ۱۷۰)	موت
(صفحہ ۱۷۶)	توبہ	(صفحہ ۲۱۸)	منکلی
(صفحہ ۲۶۷)	خطا ، تکصیر	(صفحہ ۲۷۶)	ملاقات
(صفحہ ۲۸۰)	خبر	(صفحہ ۲۸۹)	سکت
(صفحہ ۲۹۱)	پکار	(صفحہ ۳۰۰)	فکر
(صفحہ ۱۳۹)	ہند (بولد)		

یہ الفاظ مونث لائے گئے ہیں :

(صفحہ ۱)	نائون	(صفحہ ۲۸۵)	ادب
(صفحہ ۲۸۸)	منصود	(صفحہ ۲۹۱)	هانگ
(صفحہ ۲۹۶)	مشتری (ستارہ)	(صفحہ ۲۹۷)	چفا
(صفحہ ۳۰۰)	ذکر	(صفحہ ۱۶)	نائون -

میں نے اس نظر سے ساری کتاب کا مطالعہ نہیں کیا ، مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اختلافی عنصر کا یہ حصہ غالب ہے جو اوپر دکھایا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی بڑی مقدار نہیں ہے ۔
باتوں میں اردو کے مطابق ہے ۔

مصدر کا استعمال

(صفحہ ۱۳)	”دھڑے دھڑے دل کے تاویاں میں جھلے آتا ہے تو یو ہاٹ پاتا ہے“ (یہ معنی حال) ۔
(صفحہ ۲۸)	”تا دور قیامت اپنے دور کی بات ہوتا ۔“

”انکے کے لوگوں چکوں سنے تو شہادت ہونا۔“
(یہ معنی مستقبل)

(صفحہ ۱۳۱) ”زور اور کون زور سوں ناہنکارنا ، زور اور کون
ہنر سوں مارنا“ (یہ معنی امر) ۔

(صفحہ ۱۳۳) ”بڑے آدمی کون بڑا کام فرماتا ، نہنے آدمی کا
کام گور میں آنا جانا ، بخرے لانا لے جانا۔“ (چاہے
محذوف ہے)

(صفحہ ۲۹) ”جبوں خدا دیا تیوں لینے ہی جانتا ہے ، کسے کچھ
دینے ہی جانتا ہے۔“ (نے بجائے نا)

(صفحہ ۹۷) ”ہلائیک آرزو دھرنے ہیں اس باغ میں آئے۔“ (محذوف
جارہ ’کی‘)

(صفحہ ۱۳۱) ”وو ابد الابد کی ٹہار ہے ، یہاں نے وہاں جانے
کیا بار ہے۔“ (ظرفیہ ’میں‘ محذوف ہے)

(صفحہ ۸۳) ”چکوں خوب ہے اسے اپنی خوبی چھپانے نہیں بھاتا ۔
خوبی چھپانے خوبان کون نہیں آتا۔“ (نے بجائے نا)

(صفحہ ۶۷) ”بڑے ہونا کیا باٹ میں بڑیا ہے۔“ (یعنی بڑا ہونا)

(صفحہ ۱۳۵) ”ایسی مستی سوں ضرور ڈرنا لگتا ہے ، چوت حذر
کرنا لگتا ہے۔“

دکئی صرف کا یہ کوئی پورا خاکہ نہیں ہے اور نہ اس کی تمام
خصوصیات سے بھٹ کرنا ہمارے موجودہ مقصد کے مناسب ہے ۔
ہم نے بعض ایسے خصائص کو لئے لیا ہے جو سطح پر نمودار ہیں مگر
ایسے جو گہرے مطالعے کے مقتضی ہیں ان کو ترک کر دیا ہے
اور اس میں بھی شک نہیں کہ ’سب رس‘ کا تفصیلی مطالعہ اردو صرف
کے بعض پیچیدہ مسائل کی عقدہ کشائی میں امید سے زیادہ ہماری
امداد کرے گا ۔

فارسی اثر

’سب رس‘ ہز فارسی اثر خواہ اصل فارسی اشعار و اقوال کی بنا پر جو کثرت کے ساتھ اس میں منقول ہیں یا ان کے تراجم نیز ایسے محاورات و امثال کی بنا پر جو فی الحقیقت فارسی اصل پر مبنی ہیں ، نہایت گہرا ہے ۔ فارسی اساتذہ و اہل علم مولانا روم ، سعدی ، خسرو ، حافظ ، عری ، گیسو دواز وغیرہم ، نیز ان بے شمار امثال و اشعار سے قطع نظر جن کے مالکوں کے نام مذکور نہیں ہوئے ، ہم ایسے اسالیب کا ذکر کریں گے جو ہادی النظر میں فارسی ہر تو یا ترجمے کے ذیل میں داخل ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ دکنی اس خصوص میں نہ صرف فارسی اسالیب و روز مرہ سے سیراب ہو رہی ہے بلکہ مصادر ، حاصل مصادر ، صفات و اسما حتیٰ کہ بعض صریح خصوصیات نیز انداز بیان میں اس کی منت کش ہے ۔ یہ اثر اس قدر جگہ ہے کہ بعض موقعوں پر جب تک ہم فارسی محاورے سے واقف نہ ہوں ، اصل دکنی مفہوم کا پتا چلاتا دشوار ہو جاتا ہے ۔

ضرب الامثال

- (صفحہ ۳۸) ”یو بات کھیل نہیں ۔“ (اس سخن بازیمہ نیست)
- (صفحہ ۴۰) ”آپے کیا اے علاج کیا ۔“ (خود کردہ را درمان چیست)
- (صفحہ ۱۷) ”مردی و نامردی یک قدم ہے ۔“ ع
نا مردی و مردی قدسے فاصلہ دارد
- (صفحہ ۱۷) ”اپنا کیا آپے پاوے ۔“ (کردنی خویش آمدنی بیش)
- (صفحہ ۷۵) ”اگر مائی لہکا تو ی بڑی ڈھیک (ڈھیر) پر ہات
سٹے ۔“ (خاک از تودہ کلای بردار)
- (صفحہ ۲۴۳) ”کھیچ ہیں کہ اپنا گھر خوشی بھائے سو کر ۔“
”خانہ خانہ تست“ کا ہر تو ہے)

- (صفحہ ۴۵) ”اس بات پر یو بات آئی کہ علت چاقی ولے عادت نہیں چاقی۔“ (علت می رود ولی عادت نمی رود)
- (صفحہ ۱۳۱) ”ایسا اندیشا اندیشا، اپی ماریا اپنے ہانوں پر تیشا۔“
(’تیشا برہای خود زدن‘ کا ترجمہ ہے)
- (صفحہ ۱۳۲) ”ما باپ مجازی خدا۔“
- (صفحہ ۱۵۴) ”جن نے لبوا ہات پکڑیا، اس کی دائم پیش بازی۔“
(ہرکہ شمشیر زدن سکہ بتامشی خوانند)
- (صفحہ ۲۶۸) ”بولے ہیں کہ شر شیطان نے مکر زنان نے خدا اپنی پناہ میں رکھے۔“
- (صفحہ ۲۵۲) ”مثلاً معلوم ہوا آج، خالی گہر میں کتیاں کا راج۔“
ہم نے ایک قلمی نسخے میں یہ مثل ہوں پڑھی ہے۔ ’خالی گہر بیوتان کا راج‘۔ یہ ہر حال ’خانہ خالی را دیو می گیرد‘ سے ماخوذ ہے۔
- (صفحہ ۱۴۵۷) ”بڑے سون بھلائی کرنا دشمن سون سگالی کرنا نادانگی سراسر ہے۔“
- (صفحہ ۵۶) ”سنے کے ہاں سون لکھ دکھنا یو تیری بات۔“
- (صفحہ ۲۷۴) ”حیرت نے دانتاں تلے انگلی رکھی۔“ (انگشت ہندان گرقن)
- (صفحہ ۳۴) ”بر دوہور در برہاں زمین آہاں کا اتر۔“ ”سعدی کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔ ع :
فرق است میان آنکہ یارش در بر
با آنکہ دو چشم انتظارش بر در
- (صفحہ ۱۳۵) ”ہاج ہوو کاج دونوں ہرے ہیں ولے دانش مندان
پان فرق کرے ہیں۔ کاج میں کیا ہاج کا جھلک
جھلکے گا۔“

اوپر کی مثالوں میں سب سے زیادہ سعدی کے خرمین سے خوشہ چینی

کی گئی ہے۔ لیکن مثال ذیل سرقہ میں شامل ہونے کے قابل ہے۔
اگر ترجمہ داخل سرقہ ہے۔

(صفحہ ۱۳۸) ”جیتے دنیا میں آئے الو میں دو چنیاں نے جینی کھائے۔
جس نے جان کر محفلت میں بڑیا کچھ نہیں کیا ،
جس نے اچہ کر نہیں کھایا کسے کچھ نہیں دیا۔“

گلستان کے باب ہشتم میں ہمیں یہ عبارت ملتی ہے :
”دو کس مردند و خسر بردند ، یکے آنکہ داشت و نخورد ، دیگر آنکہ
دانست و نکرد۔“

مصادر

اردو میں فارسی ذرائع سے کئی مصادر مثلاً فرمانا ، گزونا ،
رنگنا ، بخشنا ، آزمانا ، خریدنا ، قوازنا وغیرہ عام طور پر رایج ہیں۔
ذکنی اس لہجہ میں اور مصادر کا اضافہ کرتی ہے۔ مثلاً تلاش سے
تلاشنا ، قہمیدن سے فامنا۔ آخری فعل نہایت کثرت سے ملتا ہے :

(صفحہ ۱۵۰) ”یو بات دانسی کا معا ، اس بات کون فامنا کون۔“
نگاریدن سے نگارنا اور اندیشیدن سے اندیشنا بھی قابل ذکر ہیں :
(صفحہ ۲۹۶) ”یو کام اندیشے ہیں سو کرنا کھر
سنوارے جاگا جاگا نفس نگارے۔“

مرغولنا ایک اور جدید مصدر ہے جس کے معنی فاضل مرتب نے
برندوں کے چہچہانے کے دیے ہیں :

(صفحہ ۲۲۲) ”جناوراں ڈالیاں پر بست مرغولتے ہیں۔“
مرغولہ تحریر نغمہ یا گٹکری کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ اس بنیاد
پر شاید یہ معنی مستطرح ہوئے۔ اسی طرح رائدن سے راننا نکلا :

(صفحہ ۱۲) ”یو کوڑ پاپی خدا کے وانے یو جہنمی کچ فاسی کی۔“
فارسی مرکب مصادر کا ترجمہ یا نصف ترجمہ یہ کثرت ملتا ہے۔
ان میں اکثر مصدر داشتن ، کردن ، گرفتن ، خوردن وغیرہ کی ترکیب

ہے جیسے ہیں۔ میں صرف چند مثالوں پر قناعت کرتا ہوں :

دھرنا فارسی نہادن اور داشتن کا قائم مقام ہے۔ چنانچہ :

قانون دھرنا = قانون نہادن

(صفحہ ۲۷) ”نوے نوے قانون دھرنا لگیا۔“

کام دھرنا = کار داشتن

(صفحہ ۶۲) ”ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ سے کچھ کام دھرنا ہے۔“

آرزو دھرنا = آرزو داشتن

(صفحہ ۶۷) ”بلا یک آرزو دھرنا ہے۔“

محبت دھرنا = محبت داشتن

(صفحہ ۷۰) ”محبت دھر گیا۔“

نام دھرنا = نام داشتن

(صفحہ ۹۰) ”کیا نام دھرنا ہے، کیا کام کرتا ہے۔“ (اردو محاورہ)

نام دھرنا اس سے بالکل مختلف ہے)

خبر دھرنا = خبر داشتن

(صفحہ ۶۱) ”یو حافل بچارہ خبر نہیں دھرنا۔“

غلام دھرنا = غلام داشتن

(صفحہ ۱۲۳) ”حسن دهن من موهن جگ جیون ایک غلام دھرق

تھی۔“

فرصت دھرنا = فرصت داشتن

(صفحہ ۱۵۷) ”فرصت دھرنا ہے۔“

شوق دھرنا = شوق داشتن

(صفحہ ۲۳۰) ”شوق دھریں گے۔“

رخ دھرنا = رخ نہادن

(صفحہ ۱۶۹) ”رخ دھرے“ یعنی رخ نہادند یا رو نہادند۔

ظہور پکڑنا = ظہور گرفتن

- (صفحہ ۹۴) ”عشق نے معشوق نے پکڑی ظہور۔“
 دنیاں پکڑا = دنیاں گرفتیں“
- (صفحہ ۱۱۵) ”دوسریا کا دنیاں نکو (مت) پکڑ“ یعنی دنیاں
 دھکراں مکیر۔
- (صفحہ ۹۳) ”ہاتو سوں پڑنے کا آیا وقت۔“
- اردو میں بے معنی ہے۔ دراصل فارسی ”از ہا افتادن“ یا ”از ہا
 درآمدن“ کا ترجمہ ہے۔
- (صفحہ ۱۱۷) ”یو حال ہر کسے نہیں دیتا دست۔“ (دست دادن)
 کا ترجمہ ہے)
- (صفحہ ۲۱۰) ”رستاں اس کے انگھے کمر کا لہوا کھول کر سپر
 شے^۱ ہے۔“ (سپر انداختن کا ترجمہ ہے)
- (صفحہ ۲۳۱) ”خوشبوی خوش کرنا۔“ [خوش کردن بہ معنی
 ہستیدین ہے]
- (صفحہ ۲۷۶) ”اپنا ہات اے لڑیا۔“ (ترجمہ ہے دست گزیدن کا)
- (صفحہ ۱۳۲) ”لتنہ اچایا“ یعنی لتنہ انگیکٹ۔
- (صفحہ ۱۳۱) ”یاٹ ماریا ہے“ یعنی راہ زدہ است۔
- (صفحہ ۱۵۳) ”اپنے نانو کا عام اچانا“ یعنی عام برکشیدن۔
- (صفحہ ۱۶۱) ”حیفی کھانے لگا“ ترجمہ ہے حیف خوردن کا۔
- (صفحہ ۱۹۳) ”اس سوں مشورت لائی“ یعنی باوے مشورت آورد۔
- (صفحہ ۸۷) ”سر کون قدم کیا“ = سر را قدم ساخت۔
- (صفحہ ۸۱) ”دل کا مدعا کھولیا“ یعنی مدعاے دل بکشود۔
- (صفحہ ۹۳) ”جیو کے دریا میں بیار کا طوفان ماریا“ یعنی
 طوفان زد۔

۱۔ مصدر ”ستا“ = ڈالتا ہے، یہ مصدر پنجابی میں عام مستعمل
 ہے۔ (مرتب)

(صفحہ ۸۱) ”صحت و سلامت خدا تجھے تیری مراد کون
انپڑاوے۔“

(صفحہ ۵۴) ”پکڑی بلندی۔“ (بلندی گرفتن کا ترجمہ ہے)

اسی سلسلے میں بعض اور مصادر ذکر کیے جاتے ہیں اور
یاد رہے کہ ایسے مصادر بے شمار ہیں :

(صفحہ ۱) قدرت دھرنا = قدرت داشتن

(صفحہ ۲) دم مارنے = دم زدن

پیدا کیا = پیدا کرد

(صفحہ ۶) تقسیم آنا (صفحہ ۸) عیان گردن ، تسلیم کرنا ۔

تمیز کرنا (صفحہ ۹) لذت پانا ۔

(صفحہ ۱۰) کیف کھانا (کیف خوردن) قائمہ پڑھنا ۔

(صفحہ ۱۲) مانا کھولنا (معنی کستودن) ۔ گرہ دینا (گرہ زدن) ،

جاٹ دیکھلانا (واہ نمودن) ۔

(صفحہ ۱۳) گھاپل ہونا (فکار شدن) ۔ بنیاد اچانا (اثبات) ۔

پرہیز کرنا ، انصاف چھپانا ۔

(صفحہ ۱۵) درد مند اچنا (درد مند بودن) ، حق نے گزونا

(از حق گزشتن) ، گنج کلّانا (گنج کشیدن) ۔

(صفحہ ۱۶) عمارت راس کرنا (عمارت راست کردن) ، قدر جاننا ،

عزت پانا ، قبول پڑنا (قبول افتادن) ۔ آفت دیکھنا ،

برا بولنا (بد گفتن) ۔ اس کون پھاننا (خود را

شناختن) ۔

(صفحہ ۱۷) تقیمان ہونا ، تازہ رکھنا (تازہ داشتن) ۔

(صفحہ ۱۸) مول پانا (قیمت یافتن) ۔

(صفحہ ۱۹) روشن ہونا ، شک لہانا (شک آوردن) ، صورت پکڑنا

(صورت گرفتن) ۔ چہو دینا (جان دادن) ۔ حیران ہونا

(حیران شدن) ۔

- (صفحہ ۲۰) فرحت پانا (فرحت یافتن) -
- (صفحہ ۲۱) گردانا (گردانیدن) ، فنا کرنا ، دور کرنا ، آرام پانا -
- (صفحہ ۲۳) دیدار دیکھلانا (دیدار نمودن) ، عشق پڑھانا (عشق افزودن) -
- (صفحہ ۲۴) بے منت دینا (بے منت دادن) ، قبول کرنا ، اظہار کرنا -
- (صفحہ ۲۵) فرق پڑنا (فرق افتادن) -
- (صفحہ ۲۶) دونوں جہان بے گزونا (از ہر دو جہان گنشتن) -
لازم آنا ، نظر کرنا -
- (صفحہ ۲۶) میانے میان لانا (درمیان آوردن) ، ناؤں دینا (قام دادن) ، دخل دادن ، فرق پکڑنا (فرق گزرتن) -
- (صفحہ ۲۷) بادشاہی دینا ، سرفراز کرنا ، ممتاز کرنا -
- (صفحہ ۲۸) دل توڑنا ، آزردہ ہونا ، بزمردہ ہونا ، اسردہ ہونا ، دعا دینا ، خوش حال اچھنا (خوش حال بودن) ، فدا ہونا ، دل شاد کرنا ، یاد کرنا ، تعریف کرنا ، شبہات ہونا -
- (صفحہ ۲۹) سنا کرنا (منع کردن) ، نرم اپنا (نرم بودن) -
- (صفحہ ۲۹) صفا پکڑنا (صفا گزرتن) -
- (صفحہ ۳۰) کھوڑا بھانا (اسپ افگندن) ، خط پانا (خط یافتن) -
- (صفحہ ۳۲) مائل ہونا ، کامل ہونا ، ہاک کرنا ، الہش پانا (آلودگی یافتن) -
- (صفحہ ۳۳) بضنا (بخشودن) ، اختیار کرنا ، ہضم کرنا ، بزم کرن -
- (صفحہ ۳۵) بدمست ہو پڑنا (بدمست شدہ افتادن) - کھوانا

(کھانا) - خالی کرنا ، راز بہار بھانا (راز بیرون
اٹکندن) - بھائی بولنا (بھائی گفتن) -

- (صفحہ ۳۷) قصہ پڑنا (قصہ خواندن) -
(صفحہ ۳۷) دل کھولنا (دل کشودن) ، طالب ہونا ، غالب ہونا -
(صفحہ ۳۸) رنگنا ، لطافت دھرنا (لطافت داشتن) ، سواد لٹنا (ذوق
شکستن) ، آزمانا ، دغا کھانا (دغا خوردن) ، پلا آنا
(پلا آمدن) ، درہم ہونا (درہم بودن) -
(صفحہ ۳۹) فاش ہونا (فاش شدن) ، گھر ہاندھنا (خانہ بستن) -
(صفحہ ۴۱) دہال پڑنا (دہال افتادن) -
(صفحہ ۴۷) در گزونا -
(صفحہ ۷۸) گزواننا (گزواندن) -
(صفحہ ۲۵۲) آہ مارنا (آہ زدن) -
(صفحہ ۲۵۳) خان ہالنا (خانل افکندن) صحبت دھرنا (صحبت داشتن) -
(صفحہ ۲۵۹) کپٹ پکڑنا (کپٹہ گرفتن) وغیرہ -

یہ بعض چند مثالیں ہیں اور ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ تقریباً
مرکب مصادر کے سارے ذخیرے پر قبضہ کر لیا گیا ہے۔ ان میں
بعض ایسے بھی ہیں کہ جب تک اصل فارسی ہاؤسے کی طرف رجوع
نہ کیا جائے ان کا صحیح مفہوم دریافت نہیں ہوتا؛ مثلاً دریغ دھرنا ،
غلام دھرنا ، راز بہار بھانا ، رخ دھرنا ، حیفی کھانا ، خوش کرنا ،
سواد لٹنا ، کپٹ پکڑنا۔

بعض فارسی روزمرے ، حروف عاطفہ و استدراک لانے کا بھی
دستور ہے :

- (صفحہ ۷) ”آخر بعد از حضرت کے بیٹھے حضرت کی ٹھار۔“
(صفحہ ۲۹۱) ”ایک بات ہے قام ، اول خوشی بعد از هر
ایک کام۔“
(صفحہ ۳۵) ”ولایت بلبر از شاه ولایت کسی نہیں آتی۔“

(صفحہ ۲۶) ”بمئی فنا ہوتا ہے نہ یہ صورت۔“

اما :

(صفحہ ۲۰) ”اما خدا کسے حاصل ہے۔“

(صفحہ ۲۴) ”اما دنیا اسے کتنے ہیں کہ بے عزتی ہو رہی خوار ہو سوں حاصل ہوئے۔“

(صفحہ ۳۳) ”اما عشق سلامتی کتنے سو اپنا گھر۔“

(صفحہ ۱۲۰) ”اما خدا کی شان ہو شوکت عدل ہو انصاف کی جاگہ سو آبان۔“

(صفحہ ۱۰۹) ”اما جوں ابتدا نے رسول خدا نے ذکر اشغال کا قاعدہ آتا ہے۔“

(صفحہ ۱۶۹) ”اما روایت ہوں آئی ہے کہ نظر جس وقت عقل کے بند میں سے بہار آیا تھا۔“

ہم :

(صفحہ ۱۱) ہم ہندو تہذیبی باٹ پائے مانتے تھے ، ہم مسلمان تھے بڑا کر جانتے تھے۔“

(صفحہ ۲۳۳) میں جانتی ہوں کس ہائی سے خمیر ہوئی عاشق کی خاک کہ ہم لڑائی میں ہم وصال میں دونوں جاگے تھے ہلاک۔“

(صفحہ ۱۰۸) انا اللہ کے مقام پر ہم عشق میں ہم عرفان میں جکونی کامل ہے ، وہ ہمیشہ کھڑا ہے۔“

’کو‘ (اضافی)

فارسی صرف کی رو سے حرف ’را‘ مفعول کی علامت ہونے کے علاوہ اضافی بھی آیا کرتا ہے ۔ مثلاً ، آنرا کہ حسابہ پاک است از محاسبہ چہ پاک ، اردو میں اس ’را‘ کا ترجمہ ’کا‘ ’کے‘ ’کی‘ کے ذریعے سے

کیا جاتا ہے۔ لیکن ذکئی میں بہ تقلید فارسی ایسے موقع پر 'کو' اضافی لاتے ہیں۔

مثالیں :

(صفحہ ۱۷) ”گھر ذہنی وجہ جس کوں گھر ہے خوب ، وجہ

صاحب جسے نگر ہے خوب۔“

یہاں 'جس کوں' اور 'جسے' فارسی محاورے کے مطابق آیا ہے۔ اردو محاورے کے مطابق دونوں جگہ 'جس کا' آئے گا۔

(صفحہ ۱۱۶) ”اندلیاں دور امتحان کی باتاں کوں کیا اعتبار۔“

یہ 'کوں' بھی اضافی ہے۔

(صفحہ ۱۹۳) ”تجھے کدو ناف کی بریاں میں ایک عزاد ہے۔“

اس جملے میں اردو محاورے کے مطابق 'تجھے' کی جگہ 'تیرا' چاہیے لیکن مصنف نے فارسی 'ترا' کی تقلید کی ہے۔

(صفحہ ۲۸۸) ”تو ہمیں بھائی ہے۔“

یہ بھی فارسی محاورے کا ترجمہ ہے یعنی 'تو مارا برادری'۔

(صفحہ ۸۰) ”کامت کوں یک غلام تھا ، سیم ساق اس کا نام تھا۔“

'کوں' یہاں بھی اضافی ہے۔

بائے مفعولی

فارسی کی ایک 'ب' ہے جس کو مفعولی کہا جاسکتا ہے۔ اہل اردو اس کے ترجمے میں 'کو' لایا کرتے ہیں مثلاً 'فریاد من برسی'۔ میری فریاد کو پہنچ۔ 'بہ شکار رفتہ بودیم'۔ ہم شکار کو گئے تھے۔ او بمدرسہ خواہد رفت۔ وہ مدرسے کو جائے گا۔ وغیرہ۔ وجہی حسب محاورہ اس 'ب' کا مفہوم 'کووں' کے ذریعے سے ادا کرتا ہے :

(صفحہ ۱۳۷) ”صاحب کا فتح ہوئے تو مراد کوں انیڑے نگر۔“

(یہ مراد خود پرسد)۔

(صفحہ ۲۱) ”جو عشق تیرا نہایت کون انہڑپکا اس دھات۔“ (یعنی بہ نہایت خواہد رسید)۔

(صفحہ ۲۹۱) ”خلق کون مراد کون انہڑاتا ہے۔“ (یعنی خلق را بمراد می رساند)۔

(صفحہ ۲۹۳) ”چوری شکر کھیلنے کیوں جیو بیگئے ، جوں رات کون بنسی کون مچھلی لکے۔“ (ماہی دو شب بہشت افتد)۔

(صفحہ ۱۲۷) ”میرے کام کون ہور دسریاں کے کام کون زمین آسمان کا لری۔“

(صفحہ ۱۵۴) ”مرتضیٰ کو ذوالفقار آیا ، نو مرتضیٰ اس جاگا کون انہڑے۔“ (یعنی جوں ذوالفقار بہ مرتضیٰ رسید مرتضیٰ بدیں جاہگاہ رسید)۔

یسارے زائدہ

بعض اولیات فارسی والے ایک بارے زائدہ کہنے کے آخر میں لایا کرتے ہیں جس سے معنوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ مثلاً ہور و حوری ، زبان و زبانی ، پنہان و پنہانی ، قربان و قربانی ، سلامت و سلامتی ، زیادت و زیادتی ، حضور و حضوری وغیرہ۔ اس کی تقابلی ہندوستانی زبانوں میں بھی ہوتی ہے جن میں پنجابی اور دکھنی قابل ذکر ہیں۔

سعادت :

(صفحہ ۱۰) ”اگر نجات ہے تو ادھر کی سعادت کا گر حیات ہے تو ادھر کی سلامتی کا۔“ (یعنی سعادت)۔

خواری :

(صفحہ ۱۳۵) ”شراب کے اثر کا نتیجہ آخر خواری ہے ، ہلاکی حور خواری ہے ۔۔۔۔۔۔ پھوہیں خواری کے کھینچا کھینچی تے جو جاتا۔“ (یعنی خوار)۔

حیفی :

(صفحہ ۱۶۱) ”بھوت بچھتا کر حیفی کھانے لکھا۔“ (یعنی حیف)

خاطر داشتی :

”بیوت خاطر داشتی کیا ، بیوت سچایا ، تقوی دیا ۔“
(صفحہ ۱۲۶) (یعنی خاطر داشت) ۔

شرم حضوری :

”صاحب کے کام پر نظر نہیں ، ہر کسی کی شرم
(صفحہ ۶۶) حضوری کرتے۔“ (حضور) ۔

بحسب ظاہری :

”اگرچہ بحسب ظاہری میں شراب پینا گناہ ہے ۔“
(صفحہ ۱۳۳) (بد حسب ظاہر) ۔

اعتباری :

یائے فاعلی

یائے محتالی بعض اوقات فاعلیت کے لیے بھی لاتے ہیں ، جیسے
کشت و کشتی ، خون و خولی ، محنت و محنتی وغیرہ ۔ اس کے اتباع
میں الفاظ ہذا مانتے ہیں :

غدروی (غدار) :

”کنہک مردان غدروی لپھتے ہیں ، نا قدری لپھتے
(صفحہ ۲۱۸) ہیں ۔“ (یعنی غدار اور ناقدر) ۔

ستمی (شتمکار) :

”نہیں کرتا ۔ سو اے ستمی فعل بد پر لیاے ۔“
(صفحہ ۲۴۴)

مکروی (مکار) :

”یو مکروی دغا بازاں کام کیا آئے۔“
(صفحہ ۱۳۲)

’نی‘ مصدری

ایسے کلمے جو الف یا ’پ‘ پر ختم ہوتے ہیں ان پر ’نی‘ لاحقہ
لاتے ہیں اسم حاصل مصدر بن جاتا ہے ، جیسے بارسا و بارسانی ،
کدا و کدائی ، زیبا و زیبائی ، حنا و حنائی وغیرہ ۔ اس قاعدے کی بنا پر
بعض الفاظ میں ے موقع تصرف کیا گیا ہے :

استغنائی :

(صفحہ ۹۵) ”عاجزی اور استغنائی ، جو ایک صفت ہے عشق کی جو دو صفت ہو آئی ۔“ (یہاں استغنا چاہیے) ۔

نفرائی :

(صفحہ ۱۳۷) ”جو نفر نفرائی نہیں سمجھیا ، اس نفر نے کیا ہوئے کام ، صاحب کون صاحبی سہانا بہوت مشکل ہے ، نفر کون نفرائی آنا بہوت مشکل ہے ۔“

قبول صورتائی :

(صفحہ ۲۹۰) ”جن عورت نے جو جھنہ نہیں ہائی ، کیا کام آئی وہ کہی قبول صورتائی ۔“ (قبول صورتی) ۔

خوبائی :

(صفحہ ۲۹۷) ”برائی بفل میں خوبائی عات میں ۔“ (خوبی) ۔
معلوم ہوتا ہے کہ یہ قاعدہ ہماری زبان کی تعمیر کرنے والوں کے پیش نظر تھا ۔ چنانچہ ہندی الفاظ پر بھی اسی کا عمل کیا گیا ۔

کڑوائی اور مٹھائی :

(صفحہ ۵۲) ”اس علم میں کیوں خوشی آئی ، اس کڑوائی میں کون رکھے مٹھائی ۔“ (یعنی کڑواہٹ اور مٹھاس) ۔

بڑائی :

(صفحہ ۷۳) ”نہنا کام کیا قبول ، بڑائی کل نے آئیک دھول ۔“

چائنائی :

(صفحہ ۷۸) ”اپنی چائنائی کچھ فام نہیں کی ، ناکھی کچھ کام نہیں کی ۔“

’گی‘ لاحقہ

فارسی میں ’گی‘ لاحقے سے اسم مصدری بنتا ہے ۔ مثلاً بندہ اور بندگی ، فرخندہ اور فرخندگی ، افسردہ اور افسردگی ، بیچارہ اور بیچارگی ۔ اس قاعدے کی تقلید میں دکنی نے یہ بے محاورہ بدعت شروع کی :

(صفحہ ۷۸) ”اس کی پریشانی پر ، اس کی حیرانگی پر ، اس کی سرگردانی پر مہر آئی ۔“ یہاں پریشانی ، حیرانی اور سرگردانی چاہیے ۔

(صفحہ ۱۰۶) ”اے فرمایا سواس کی فرمودگی بجا لیا تا ہوں ۔“ (یعنی فرمان ۔ حسن دھلری نے بھی فرمودگی باندھا ہے)

(صفحہ ۲۹۵) ”دوسری بار ایسی شیطانی نکرے ۔“ (یعنی شیطنت)

(صفحہ ۱۶۳) ”اتسو کی عقل جاتی بد سینی جڑتی ، بے خبری آتی ۔“ (یعنی بے خبری)

ان چند امور پر فارسی اثر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ وہ اس سے بہت زیادہ گہرا ہے اور اس قدر رچا ہوا ہے کہ صرف غور و غوض کرنے اور کریدنے سے اس کا پتا چلتا ہے ۔ جذبات و خیالات سے قطع نظر دکنی جملوں کی ساخت بھی فارسی انداز کی نظر آتی ہے ۔ مثلاً :

(صفحہ ۸۰) ”نظر اپنا قصہ قامت کوں بولیا ، ہمت نے مکتوب لکھیا تھا سو قامت کے انگھے کہو لیا ۔ قامت اس مکتوب کا مضمون خاطر لیا یا ، بہت محظوظ ہوا ۔“

یہ سارا جملہ فارسی انداز میں ہے اور اردو کے انداز سے بہت دور ہے ۔ اردو میں اس کا انتہائی حصہ ہوں آئے گا :

”نظر نے قامت سے اپنا قصہ کہا ۔“

علیٰ ہذا فارسی کا ایک فقرہ ہے ”گفت شنیدہ ام“ ۔ یہاں ضمیر منفصل مذکور نہیں ہے ۔ دکنی اس موقع پر فارسی کا لفظی ترجمہ معلوم دیتی ہے ۔ مثلاً (صفحہ ۹۰) ”کہی میں سنی ہوں“ ۔ آج کے محاورے کے مطابق یہ فقرہ ہوں بولا جائے گا : ”اس ’عورت‘ نے کہا میں نے سنا ہے۔“ اردو میں ایسی صورتوں میں ’نے‘ علامت فاعل کا آنا لازمی ہے ۔ اہل دکن اس علامت سے واقف بھی ہیں اور استعمال بھی کرتے ہیں مگر فقرات بالا میں ’نے‘ کا عدم استعمال دکنیوں کی ناواقفیت اور سہل انگاری پر معمول نہیں ہونا چاہیے بلکہ فارسی کی تقلید کے چسپے کی بنا پر وہ آج بھی

بولتے ہیں 'رسول اللہ فرمائے ہیں' اور ہم اس کو بے محاورہ سمجھتے ہیں۔ لیکن درحقیقت فارسی روزمرہ 'رسول اللہ فرمودہ اند' کا تعنی الفی ترجمہ ہے ! اور کیا اس فارسی جملے کا اس سے بہتر کوئی اور ترجمہ بھی ہو سکتا ہے ؟

فعل فارسی میں فاعل کا تابع ہوتا ہے۔ اردو میں 'نے' کے ایوانہ سے بالعموم مفعول کا تابع بن جاتا ہے۔ مثلاً میں نے روٹی کھائی، میں نے کھانا کھایا وغیرہ۔ دکنی اس بارے میں فارسی کی تابع ہے۔ عام اس سے کہ 'نے' موجود ہے یا نہیں، مثلاً فارسی کا فقرہ "کافران زبون شدند خراج دادند و دین قبول کردند" دکنی میں یوں لکھیں گے :

(صفحہ ۱۵۵) "کافران زبون ہوئے، خراج دے، دین قبول کیے۔"

اس فقرے میں 'کافران' فاعل یہ حالت جمع ہے، اس لیے تینوں فعل جمع میں لانے گئے اور مفعول کی مطلق پروا نہیں کی گئی۔

(صفحہ ۱۵۱) "تھوڑیاں نے بہوتاں کو مارے ہیں۔"

یہاں 'نے' موجود ہے لیکن فعل فاعل کی حالت کے مطابق ہے۔ یہی حالت ذہل کے فقروں کی ہے :

(صفحہ ۱۲۷) "دل پادشاہ عالم پتاہ صاحب سیاہ نے بویا۔"

(صفحہ ۹۰) "القصہ حسن ناز نے گل غذارے انکلیاں کے سنگار نے

دل کے ادھارے سی۔" (یہاں فاعل مؤنث ہے لہذا فعل مؤنث آیا)

(صفحہ ۸۷) "جنے (عورت فاعل ہے) فخریاں میں انکڑی، مرد کا

دل ہات میں پکڑی۔"

(صفحہ ۹۱) "ہو بات ہوئے پچھیں غمزے نے نظر کویں دوسرے

دیس حسن کے حضور لایا۔"

اس قاعدے میں ہم دیکھتے ہیں کہ دکنی بالکل فارسی کے

نقش قدم پر چل رہی ہے۔ دکنی کے اس جملے کی مثال میں یہ فقرہ بھی ملاحظہ ہو :

(صفحہ ۴۶) ”اس ٹھار عاشق کون شک لہانا کٹری ہے۔“

جس کا فارسی میں ترجمہ یوں ہو گا ’اینجا عاشق را شک آوردن کٹری است۔‘ اس جملے میں ’را‘ دراصل جارہ ہے اور ’برائے‘ کے معنوں میں آیا ہے ، جیسے ع :

”خدا را بکن یک نظر سوی ما“

اردو میں اس کا ترجمہ ’واسطے‘، ’لیے‘ وغیرہ ہو سکتا ہے مگر فارسی کے نتیج کے ذوق میں دکنی نے ’را‘ کا ترجمہ ’کون‘ مان کر اس میں وہی خاص معنی جو فارسی میں آ رہے ہیں ، تسلیم کر لیے ۔ ذہل کے شعر میں پہلا ’کون‘ اضافی ہے ، دوسرا بہ معنی ’برائے‘ آیا ہے ۔ (صفحہ ۵۵) :

غرض دھرنا ہے نہیں تو کیا غرض ہے ہاں لگ آنے کون

چکوئی سوا کرے کس کی تو کچھ مقصود ہانے کون

(یعنی برائے مقصود یافتن)

کاف فارسی میں متعدد معنوں میں آتا ہے ۔ ازاں جملہ وہ علت کے معنی بھی دیتا ۔ چنانچہ :

ز لشکر بود زور شامشہاں کہ یک تن بدنبہا نگیرد جہاں

یہ کاف علت کہلاتا ہے اور بہ معنی ’چرا کہ‘ لایا گیا ہے ۔ اب

اردو نیز اور ایسی زبانوں میں جو مقامی اثرات میں آتی ہیں ’جو‘ کاف بیانہ کا قائم مقام مانا گیا ہے مگر دکنی ایک قدم اور آگے بڑھی ہے ۔ اس نے اس لفظ میں بیانہ کے علاوہ فارسی اصل کی مطابقت میں علت کے معنی بھی داخل کر لیے ۔ چنانچہ ’جو‘ علت کے لیے بھی استعمال ہونے لگا :

(صفحہ ۱۵۵) ”یو فتح تو ہوئی تھی جو مال پر نظر نہ تھی۔“ یہاں

’جو‘ کہوں کہہ کا ملبوم ادا کر رہا ہے ۔

فارسی میں حکایتوں اور کہانوں کے شروع میں ’آوردہ اند‘

’گفتہ اند‘ وغیرہ قسم کے جملوں کے لانے کا دستور ہے جن میں فاعل

دانا یاں یا بزرگاں وغیرہ محذوف اور مقرر ہوتا ہے۔ دکنی فارسی کی اس خصوصیت کو بھی نہیں بھولیں، چنانچہ :

(صفحہ ۱۶۳) ”بولیچہ ہیں کہ بھوک ہو رہاں نیہاں اور ولہاں کی میراث۔“

(صفحہ ۴۴) ”بولیچہ ہیں کہ بندہ گنہگار خدا ہشتبار۔“

(صفحہ ۲۹۱) ”کہیچہ ہیں کہ خدا یا خلیق، خلق یا خدا۔“

ان جملوں میں ’بولیچہ ہیں‘ اور ’کہیچہ ہیں‘ در حقیقت گنتہ اند کا ترجمہ ہے۔ ایسے موقعے بھی موجود ہیں کہ جب تک دکنی کے مفہوم کو فارسی میں منتقل نہ کیا جائے جملے کا اصل مطلب معلوم نہیں ہوتا :

(صفحہ ۱۵۰) ”فرست ہے لکن کچھ کر لے۔“

اردو میں اس کا ترجمہ ”فرست ہے نلکہ کچھ کر لے“ بالکل نامکمل ہے اور مطلب ادا نہیں کرتا لیکن اس کا فارسی ترجمہ ”تا فرست است چیزے بکن“ اصل مطلب کو پورا پورا واضح کر دیتا ہے۔ اسی طرح یہ جملہ ہے :

(صفحہ ۱۰۵) ”جیوتا ہے لکن مرے کا کام کر۔“ (یعنی تا زنده)۔
علیٰ هذا یہ جملہ :

(صفحہ ۱۵۱) ”ہادشاہاں کون تدبیر کرنا واجب ہے، ولایت خات میں ہے لگ۔“

اس کا فارسی ترجمہ یہ ہوگا ”ہادشاہاں را تدبیر کردن واجب است تا ولایت در دست است۔“
یہ جملہ بھی قابل غور ہے :

(صفحہ ۲۱) ”اگر مرد ہے تو عشق اپنا کمال کون انہڑا، فراق میں کی ہلاک ہوتا، ایس کون وصال کون انہڑا۔“

اس جملہ میں جو گنگجلیک ہے وہ فارسی میں ترجمہ کرنے سے وضع ہو جاتی ہے یعنی

”اگر مرد هستی عشق خود بہ کمال برسان ؛ تو لراق چہ ہلاک شوی
خود را بہ وصال برسان“
ایک اور جملہ ہے :

(صفحہ ۱۱۴) ”ولے یو بھید کون سمجھنا بہت مشکل ہے۔“

اردو میں یہی مطلب یوں ادا ہوا :

’یہ بھید سمجھنا بہت مشکل ہے ، یا اس بھید کا سمجھنا بہت
مشکل ہے۔‘

مگر وجہی ان دونوں کے برعکس فارسی محاورے ”ولے این راز
را قہیدن خیلے مشکل است“ کا پایندہ ہے ۔

فارسی حروف ’از‘ ’بہ‘ اور ’ہا‘ کا ترجمہ اردو میں ’یے‘ مانا
گیا ہے ۔ مثلاً ’ازو گرفتہ‘ میں نے اس سے لیا اور ’ہاو گفتم‘ میں نے
اس سے کہا ۔ دکنی اس موقع پر ’از‘ اور ’بہ‘ کا فرق قائم رکھتی ہے ۔
دکنی زبان میں ’از‘ کا ترجمہ ’نے‘ اور ’بہ‘ کا ترجمہ ’سوں‘ کیا
جاتا ہے اور اردو کی طرح ان کے استعمال میں کبھی کوئی خطا نہیں ہوتا ۔
چنانچہ :

(صفحہ ۱۵۹) ”اپنی عقل سوں اگر دسرے کی عقل ملے تو واہ واہ
اس نے ہی کیا خوب ۔“

اس جملے میں سوں ’ہا‘ کے واسطے اور نے ’از‘ کے لیے آیا ہے ۔

یہیں نہیں بلکہ فارسی اثر ادنیٰ ادنیٰ الفاظ پر آئے ہیں ۔ دانا کا
ترجمہ ’جانتا‘ اور نادان کا ’نجاننا‘ ہم گزشتہ صفحات میں دیکھ آئے ہیں ،
’گھر گھرو‘ (صفحہ ۳۲) ’خانہ خراب‘ کا قائم مقام ہے ۔ ’ہر یکے‘
کا ترجمہ ’ہر یک کوئی‘ وضع ہوا ۔

(صفحہ ۳۳) ”ہر یک کوئی اپنے مراتب کون خوبچہ کر جانتا ۔“

اسی طرح چرا کا ترجمہ ’کیا واسطہ‘ اور دومیان کا ’میانے میان‘
نہہرا ۔

(صفحہ ۲۲) ”موسمی دیکھنے کا بات مرکز میا نے میان نالیاں ، کیا
واسطہ کہ وہ پیمبر تھا۔“

ہائیں ہال ’مو بہ مو‘ کا ترجمہ قرار پایا ۔ مصرع :

مو بہ مو حال پریشانی میں میگوید

(صفحہ ۸۶) ”جیب لگا کر ہائیں ہال ، بولیا اس کے سب احوال ۔“

(صفحہ ۱۶۷) ”آدمی کون پریشانی ہے ہائیں ہال ، خدا چہ ہے
جو وہ رہتا ہے یک حال ۔“

ایک اور پہلو ہے جس پر اگرچہ میں نے کافی غور نہیں کیا مگر
تحقیق و تلاش سے ممکن ہے کہ جدید اسور روشنی میں آئیں ۔ میں یہاں
صرف ایک دو مثالوں پر قناعت کرتا ہوں ۔

’فزدیدن‘ مصدر سے حاصل مصدر ’دزدی‘ اس ’دزد‘ اور اسم ناعل
’دزد‘ ہے ؟ اردو میں اس کا ہم معنی ’چور‘ ہے جو چرانے کی قدیم
شکل ہے ۔ چور نے سے حاصل مصدر ’چوری‘ اس ’چور‘ اور اسم ناعل
’چور‘ آتا ہے ۔ ان مصادر میں یہ مشابہت اتفاق ہے یا ارادی ؟ اگرچہ
ایک آدھ مثال پر کوئی حکم نہیں لکھا جا سکتا مگر ہمیں یہ معلوم ہے
کہ اردو کا اٹھان ناریسی کے آغوش میں ہوا ہے ۔

ایک اور مثال مصدر ’خواستن‘ کی دی جاتی ہے ۔ یہ مصدر کئی
معنوں میں آتا ہے ۔ مثلاً :

- (۱) چاہنا ، خواہش کرنا ، آرزو کرنا
- (۲) سوال کرنا ، گدائی کرنا اور پوچھنا
- (۳) دوست رکھنا اور محبت کرنا

دکنی میں متگنا ’خواستن‘ کا مرادف ہے اور تعجب کی بات یہ ہے
کہ ’خواستن‘ کے معنوں کی تمام مختلف جہات پر حاوی ہے ، چنان چہ
متگنا یہ معنی اول :

(صفحہ ۲۸) ”دنیا کون لوگ متگنے ہیں سو دنیا کا فوق
کرنے خاطر ۔“

(صفحہ ۱۰) ”اگر دین ہو دنیا کا امید ہائے منگتا ہے تو یہ کتاب دیکھو۔“

معنی دوم :

(صفحہ ۳۵) ”جسے دیکھو دنیا دارو منگئے کھڑے رہے ہات پسا۔“

(صفحہ ۳۵) ”لاج سٹاکر منگتا منگن ہارا شرم کا

کوئی منگئے تو وہاں کہے ہیں دھرم ، بے شرم
کھڑی کھڑی منگتا ، اسے منگئے کی کیا شرم ، اسے
خوش لگا ہے منگ لینا۔“

اس جملے میں ’منگناوا‘ ’خواہندہ‘ کا ترجمہ یہ معنی سوالی و
گداگر آیا ہے۔

معنی سوم :

”اگر تو منگتا ہے کہ خلق مجھے منگے ، تو تو بیکان کون نکو منگ ،
جو تو بیکان کون منگتا تو ج میں ہرگز نا رہی رنگ۔“

(صفحہ ۲۱۸) ”بعضے مردان جو کوئی عورت منگتی اسے خواہ کرتے ،
جو کوئی نہیں منگتی اسے پیار کرتے ، جو کوئی
منگتی اس سو غم سے ناز۔“ الخ

یہ ناممکن ہے کہ ان مصادر کے واضعین نے یہ متفاوت پہلو دار
معنی شروع ہی سے ان کے لیے مخصوص کر دیے ہوں۔ ہمارے نزدیک
یہ ہم رنگی اتفاقی نہیں بلکہ ارادی ہے جو ترجمے کی غرض سے پیدا
کی گئی ہے۔ یہ قاعدہ دکنی کے لیے جدید نہیں ہے بلکہ دیگر مسلمانی
زبانوں میں بھی ملتا ہے۔ مثلاً عربی ’انسان عین‘ اور فارسی ’مردم چشم‘
عربی ’فعل الطريق‘ ، فارسی ’راہ زدن‘ اور اردو ’ہاٹ مارنا‘ ؛ نیز ان کے
اسم فاعل ’فاعل الطريق‘ ، ’راہ زن‘ اور ’ہٹ مار‘ اتفاقیہ پیدا نہیں
ہوئے ، بلکہ ان میں ایک دوسرے کا پرتو ہے جو یہ غرض ترجمہ
وضع ہوا ہے۔ اور کیا یہ امر اختلاف السنہ کے باوجود مسلمان اقوام
کے جذبات و خیالات کی ہم آہنگی اور ہم رنگی کا ثبوت ہمارے سامنے
پیش نہیں کرتا ؟

اس معاملے سے یہ امر ہمارے ذہن نشین ہو جاتا ہے کہ اردو پر فارسی اثر، جیسا کہ ہمارے ہاں عام طور پر خیال کیا جاتا ہے، بارہویں صدی سے شروع نہیں ہوتا، بلکہ اس سے بہت زیادہ قدیم ہے اور یہ لحاظ وسعت ہے پایاں ہے جس کا اندازہ کرنے سے ہم انہی قاصر ہیں۔ اس مسئلے پر صرف دکنی روشنی ڈال سکتی ہے جس کے تحریر کی قدامت اردو کے مقابلے میں مسلمہ ہے۔

عربی اور فارسی الفاظ میں تصرفات

اردو کی نحو و نما اچانک غیر تعلیم یافتہ طبقات میں ہوئی ہے؛ تعلیم یافتہ جماعت بہت دیر بعد اس کی طرف متوجہ ہوئی ہے، اس لیے دیکھا جاتا ہے کہ سینکڑوں عربی و فارسی الفاظ رواج عام میں آج بھی غلط بولے جاتے ہیں۔ تحریری اردو میں ایسے الفاظ کا داخلہ بند ہے لیکن یہ اصلاحی تحریک ہمارے ہاں میر و سودا کے عہد سے جاری ہے۔ اس عہد سے پیشتر بالخصوص دکن میں جہاں اردو کی ادبی تشکیل شمالی ہند سے بہت پہلے شروع ہو گئی ہے، دکنی اہل قلم اپنے آپ کو عام بول چال کا پابند بنا دیتے ہیں اور عوام الناس کا تلفظ اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ دکنی میں بے شمار ایسے الفاظ ملتے ہیں جن کو عوام کے تصرف نے کچھ کا کچھ بنا دیا۔ اعراب کی خفیف تبدیلی سے لے کر لفظ کی شکل بالکل معنی تک میں ہر قسم کی ترمیم و تنسیخ روا رکھی گئی۔ مثلاً حروف حلق جن کا عربی سے تعلق ہے، بالکل اڑا دیے گئے؛ قریب المخرج حروف کا فرق مٹا دیا گیا؛ بعض الفاظ پر غلط لا حلق لگا دیے گئے اور لفظ کے آخر کی 'و' کو 'الف' سے بدل دیا گیا۔

(۱) 'و' اور 'ع' کا 'الف' کے ساتھ تبادلہ :

(صفحہ ۱۸)	معنا (معنی)	(صفحہ ۱۵۵)	مانا (معنی)
(صفحہ ۱۱۶)	خاصا (خاصہ)	(صفحہ ۱۱۷)	منا (منع)
(صفحہ ۱۱۹)	وضا (وضع)	(صفحہ ۱۲۰)	بھارا (بھارہ)
(صفحہ ۱۲۲)	نفا (نفع)	(صفحہ ۱۲۵)	قصا (تقصہ)
(صفحہ ۱۳۱)	اندیشا (اندیشہ)، نیشا (نیشہ)		

- (صفحہ ۱۵۵) صبا (صبح) (صفحہ ۵۹) آلا (اعلیٰ)
 (صفحہ ۱۶۲) وانا (واتعد) (صفحہ ۱۶۳) طما (طمع) ، جیا (جبع)
 (صفحہ ۲۱۱) حیلا (حیلہ) ، وسیلا (وسیلہ)
 (صفحہ ۲۳۸) خطرا (خطرہ) (صفحہ ۲۶۶) ماملا (معاملہ)
 (صفحہ ۱۹۹) غمزا (غمزہ) ، عشوا (عشوہ)

(۲) معنی کے لحاظ سے تصرف :

تقویٰ : اصل معنی ترس و پرہیز ہیں ، مگر ذکئی میں جیسا کہ فاضل مرتب نے لکھا ہے اطمینان اور ڈھارس کے معنی دیتا ہے ۔

(صفحہ ۸۷) ”خدا کون نکو بسر ، تقویٰ کم نکو کر ۔“

رقوم : یہ معنی شہرت و نام ۔ فاضل مرتب نے جس معنی دے ہیں ۔

(صفحہ ۲۸۰) ”عورت خوب عورتاں میں جس کی رقوم ، دو تو التادر کالعدموم ۔“

فتوا : معنی فتنہ ۔

(صفحہ ۱۸۵) ”کرا جانے کیا فتوا اچاتا ہے ۔“

نقشان چنتا : نکتہ چینی کرنا ۔

(صفحہ ۲۳۵) ”لوگن پر نقشان چنے بغیر رہتے ہیں ۔“

اختیار : شاید یہ معنی مختار آتا ہے ۔

(صفحہ ۱۶۰) ”دل کے ادھار کون شہر دیدار کون جانے اختیار ہوا ہانوں سار ہوا ۔“

(صفحہ ۱۵۷) ”جو کوئی صاحب سون ہو اختیار اچھے ، اس کا دل

صاحب خاطر کیوں نہ پکڑے اچاٹ ۔“

(۳) الفاظ میں تصرف :

(صفحہ ۹۱) رویش (روشن) (صفحہ ۱۱) کلیمہ (کلمہ)

(صفحہ ۱۶۴) پس شبیت (غیبت ، پس ہشت)

(صفحہ ۲۰۰) ووزور (زور آور) (صفحہ ۱۵۰) جناور (جانور)

(صفحہ ۱۲۳)	نام (ظہیر)	(صفحہ ۱۲۸)	زیات (زیادت ، زیادہ)
(صفحہ ۱۲۹)	تفادیس (تفاضل)	(صفحہ ۱۳۱)	نزیک (نزدیک)
(صفحہ ۱۶۰)	تنا خوری (تہا خوری)		
(صفحہ ۱۶۳)	اندیتوان (اندیشناک)		
(صفحہ ۲۳۱)	گمٹ (گنبد)	(صفحہ ۲۳۱)	منا منی (منی و مالی)
(صفحہ ۲۳۳)	سہروان (سہریان)	(صفحہ ۲۳۶)	فضیحے (فضیحت)
(صفحہ ۲۵۳)	زہار (زہر)	(صفحہ ۲۹۹)	مستید (مستعد)
(صفحہ ۳۰۰)	ناہات (نیات)	(صفحہ ۳۰۹)	تیزی (تازی اسپ)
(صفحہ ۱۰۱)	شناس (شناخت)	(صفحہ ۱۸۲)	تفاس (تفحص)
(صفحہ ۱۰۰)	خلخال (خلقلہ)	(صفحہ ۱۰۷)	صبور (صبر)

اردو اسالیب

جو چیز 'سب رس' کو ہماری نگاہ میں سب سے زیادہ قیمتی بتاتی ہے وہ اس کے اسالیب ہیں۔ ان اسالیب میں ہم محاوروں ، ضرب المثلوں نیز ہر قسم کے دیگر مخصوص روزمرے کو جو خواہ ایک ہی لفظ کے دہرائے جانے سے یا قریب المعنی الفاظ و العال کے آمیز سے جنتے ہیں ، داخل سمجھتے ہیں۔ ان سے ہم کو زبان کی وہ حالت معلوم ہوتی ہے جو اب سے تین سو سال قبل رائج تھی اور پتا چلتا ہے کہ زبان انتشاری کیفیت کو خیر باد کہہ کر ایک مرتب اور منظم شکل اختیار کر چکی ہے۔ جب ہم ان اسالیب کا موجودہ زبان کے اسالیب سے مقابلہ کرتے ہیں تو ان میں بہت خلیف فرق معلوم ہوتا ہے۔ بھونے کے واسطے چند یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

روزمرے اور محاورات

صفحہ نمبر	قدیم	جدید
۲۹۵	'شکر کی چھری ہے'	'میٹھی چھری' (۱)
۲۲	'کنیا خالہ کا گھر ہے؟'	'خالہ جی کا گھر یا خالہ کا گھر' (۲)

۱۔ علامت (۱) سے مراد فرہنگ آصفیہ ، (ج) سے مراد نجم الامثال اور (ز) سے مراد خزینۃ الامثال ہے۔

ضیا، بری تاریخ فیروز شاہی میں لکھتا ہے : ”چنان کہ خسوردکن بہ خانہ
خالکان می روند۔“ (صفحہ ۱۰۱، طبع کلکتہ)

صفحہ	قدیم	جدید
۲۳	’بڑائی کہاں نے آئی دھول‘	(یعنی کیا خاک آئے گی)
۲۵۷	’قیما قیا کرنا‘	’قیمہ قیمہ کرنا‘ (۱)
۱۵	’لڑنا جھگڑنا‘	(آج بھی رائج ہے)
۷۰	’مائی جانی‘	’ما جایا‘
۲۴۳	’چھپے چوری سون‘	’چوری چھپے‘ (۱)
۲۳۵	’اپنا کڑ چہا کھانا‘	’راز چھپانا‘
۹۶	’بھانڈا بھوڑنا‘	’بھانڈا بھوڑنا‘ (۱)
۸۶	’شرم حضور‘	’شرم حضوری‘ (۱)
۱۳۲	’گھر گھانلو‘	’خانہ غراب ، خانہ برباد‘
۲۵۹	’بھلا بھرا‘	’برا بھلا‘
۴۱	’جدھر تدھر‘	’جدھر تدھر‘
۸۷	’جیوں لیوں‘	’جیوں تیوں‘
۳۵	’کھینجا کھینچی‘	’کھینجا کھینچ‘ (۱)
۱۷۶	’تھانا تھات‘	’بھاگا بھاگ‘ (۱)
۱۹۸	’لال گلال‘	’لال گلول‘
۲۰۵	’مارا مارا‘	’مارو مارو‘ (بزن بکس)
۶۱	’پٹ پکڑ پکڑ کر حسنا‘	’یعنی‘ ’پٹ بھر کر حسنا‘
۷۶	’کوڑ کھٹ‘	’کھنہ فٹاق ، دشا فریب‘
۲۳۲	’فراق کے جلے جلے‘	’جلے جلے‘ (۱)
۶۳	’پیشانی کون بدناسی کا ٹیکا‘	’بٹہ لکانا ، داغ لکانا‘
	’لاو‘	

۱۔ ’مارا مارا‘ کو ’اودو‘ کی تاریخ میں بڑا پرانا لفظ ہے۔ غزنوی
دور کے لاہوری شاعر خواجہ مسعود سعد۔ ہان متوی ۵۱۵ھ اسی مفہوم
میں اس کا استعمال کرتے ہیں۔ ع :

چو رعد ز ابر بھر پد کوس محمودی بر آمد از پس دیوار حصن مارا مار

صفحہ	قدیم	جدید
۱۳	'یو بی کیا' نہنوالوں کا	'بچوں کا کھیل' (۱)
	کھیل ہے ؟	
۷۷	'سچے بیروں دھرتے'	یعنی 'ہات لائے' (۱) فارسی سخن داشتن کا ترجمہ ہے
۲۳۵	'کسو غمے کسو غمے دھنورا بھرائے'	'ڈھنورا بھیرنا' (۱)
۳	'شان نہ کھن ، جان نہ پھان'	آج بھی یوں ہی بولتے ہیں
۸۲	'غونا خون'	'خون خرابہ ، کشت و خون'
۷۵	'مائی میں جاؤ نک و نام'	یعنی 'خاک میں ملے ، برباد ہو پلا ہے'
۲۳۳	'گدھیں مدھیں'	'کبھی کبھار ، کدھی کدھار' (۱)
۲۶۸	'تلوے میں عقل'	یعنی 'ناقص العقل یا گدی میں عقل'
۲۶۱	'گہر داری دھندا'	یعنی 'خانہ داری کا دھندا'
۱۰۳	'دیتا دلاتا ہے'	'دیتا لیتا ہے' (۱)
۹۸	'ڈاواں ڈول'	'ڈانواں ڈول'
۱۵۹	'کانٹے باندھنا'	'کانٹھ رکھنا ، کپٹ رکھنا'
۲۸۷	'ادھر اودھر'	'ادھر ادھر'
۱۳۶	'ہاٹ کے ووڑے'	'ہاٹ کا روڑا' سنگ راہ کا ترجمہ ہے
۱۶۱	'پکڑیا چکڑیا'	'پکڑنا دھکڑنا'
۱۷۸	'داد نہ فریاد'	'داد نہ فریاد' (۱)
۲۰۲	'لوگ ہنسائی'	'لوگ ہنسنائی ، چک ہنسنائی' (۱)
۱۶۰	'ہنستا کھیلتا'	'ہنستا کھیلتا'
۲۳۹	'سچیں غپیں'	'سچ مچ'
۲۸۰	'بہولے چوکے'	'بہولے چوکے'
۷۷	'سچے کون اڑائے'	یعنی 'ہنسی میں اڑائے'
۱۱۸	'چھک مارنا'	'چھک مارنا'
۱۳۱	'خال بھانا'	'خلل ڈالنا'
۱۳۷	'انوس کیا مائی اچھکی عقل'	'کیا خاک عقل ہو گی'

- صفحہ قدیم جدید
- ۱۵۹ 'اپنی عقل ہوئی ہوئی' 'عقل جرخ ہو گئی'
- ۲۱۹ 'اپنے گریبان میں کچھ نہیں' 'اپنے گریبان میں منہ نہیں ڈالتے'
- ۱۶۳ 'اس برائی پر ہی اینٹ اینٹ' 'اینٹ اینٹ مرنا'
- مرنے
- ۲۱۰ 'عقل پر بات آتا ہے' 'بات آنا ، حرف آنا' (۱)
- ۲۶۷ 'ماں کے پیٹ میں بے ٹکنا' 'یعنی پاک و معصوم'
- ۳۵ 'بو بزرگی بات میں نہیں بڑی' 'یعنی مفت نہیں ملا کرتی'
- ۱۳۷ 'ایسے نفور کون چولھے میں' 'یعنی چولھے میں جھونگو ہواؤ'
- ۱۵۲ 'کام سب ہو گا' 'بھنگ' 'بھنگ ہو گیا ، خراب ہو گیا'
- ۱۵ 'اس کا مون کالا' 'یعنی کالا منہ ہو'
- ... 'دودھ میں کالھی' 'ع : 'ارے یہ دودھ کالھی کن رلائی' (مجھ اکرم رھتی دو تیرہ ماسہ)
- ۱۷۹ 'بارہ بات' 'بارہ بات' ، 'تتر بتر'
- ۲۲۲ 'الابلالی' 'الانے بلانے لینا ، صدقے قربان جانا'
- ۲۹۵ 'جاں جانے کی واں بلا ہسانے' 'لفتنہ برہا کرتا ، آفت لانا'
- گی
- ۱۳۳ 'ہائی سب تکرے کے کتے' 'پیٹ کے کتے' (۱)
- اردو روز مرہ میں تحسین کلام کی غرض سے بعض افعال و الفاظ کی تکرار کی جاتی ہے ، دکنی میں یہ طریقہ بھی رائج ہے ۔
- (صفحہ ۱۸۹) "ہونچہ چنکے لانے لانے ، پھاندے میں بھانے بھانے ،
- بھسلانے بھسلانے دھدار کے شہر لگن آئے ۔"
- (صفحہ ۲۱۲) "دیکھتے دیکھتے ، سننے سننے ، خاطر لہانے لہانے ، فکر کرتے کرتے ، رھتے رھتے معلوم ہوتی ہے کام کی ذہانت ۔"
- (صفحہ ۵۰) "جائے جائے ، تلہلانے تلہلانے ، حیفے کھانے کھانے
- بات میں دیکھا ۔"

ضرب الامثال

صفحہ قدیم

جدید

۲۸۰ 'چور ہر مور بڑیا' 'چور ہر مور یا چور کے گھر مور'

(۱) ، (ج)

'چھوٹا منہ بڑی بات' (ج)

'کہاں راجا بھوج کہاں گنگا تیلی'

(ج) ، (ز)

۱۲ 'نہنا نہم بڑی بات'

۲۲ 'اس بات کا کون پایا کھوج'

کہاں گنگا تیلی کہاں راجہ

بھوج'

۳۳ 'بولیچہ میں کہ بندہ گہکار

خدا بخش ہار'

'چکنے کھڑے پر ہوند بڑی اور

بھسل گئی'

'گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے' (۱) ،

(ج) ، (ز)

۳۶ 'بتول اہل ہند چکنے کھڑے

ہر ہانی ڈھلتا'

۶۱ 'وام جو جان کر راون

ہر آئے، گھر کے بھیدی نے

لنکا جائے'

'یسا کیا مانگے ہانی'

۳۳ 'بہ قول اہل ہند ہسا کیا

منگتا ہانی'

'اس کی گردن وہاں مارے جہاں

ہانی نہ ملے' (ز)

'اصل سے غطا نہیں کم اصل سے وفا

نہیں' (۱)

'گر گٹ کی دوڑ بھٹی تلک' (ز)

'گر گٹ کی دوڑ بلورے تک' (ج)

'جس کے ہاتھ ڈوٹی اوس کا سب

کوئی' (ز) ، (ج)

'اول خویش بعدہ درویش'

۱۳۸ 'جان ہانی نامے وان گردن

مار'

۱۳۲ 'اصل سے کچھ غطا نہیں کم

ذات سے وفا نہیں'

۱۳۳ 'گھر گٹ کی دوڑ باڑی لکن'

۱۳۷ 'مشہور ہے کہ چدر ہنڈی

ڈوٹی اودھر سب کوئی'

۱۳۷ 'اول خویش بعد از درویش'

۱۲ 'ہات یوں ہی آئی کہ جائے

کا گر انجانیے کا بھائی'

- صفحہ ۱۱۹ 'یو بات چلیجہ ہے سب' بھالے کا زمانہ نہیں' (۱)
 کئی کہ بھالے کی دنیا نہیں'
 ۲۴۲ 'کیلچ ہیں کہ اپنا گھر
 خوشی بھالے سو کر'
 ۲۵۷ 'کنے کون کھیر جروں ہے؟'
 'کنے کو گھی نہیں پچتا' (۱)
 ۲۶۶ 'جس نے نیں سنا بڑیاں کی
 بات اس کون کیوں ہونا نجات'
 'لے ٹھکرا مانگے بیگہ'
 ۲۷۲ 'تین گناہ خدا ہی بخشا ہے'
 'تین گناہ خدا بھی بخشا ہے' (۲)
 ۲۷۶ 'دود کا جلا چھاچہ بھونک
 دودھ کا جلا چھاچہ بھونک بھونک
 بیتا'
 'بے (۲) 'دودھ کا جلا چھاچہ کو
 بھونک بھونک بیتا ہے (ج) 'دودھ
 کا جلا چھاچہ بھونک بھونک گز
 بیتا ہے' (۱)

دکنی ضرب الامثال

- (صفحہ ۷۴) 'یو سمجھے نیں دراصل' دکھن کا ہے یو مثلاً "جو
 کوئی آوازا وہ بیانی ہمارا۔"
 (صفحہ ۸۸) 'جیوں دکھنی مثل ہے "مرنا مرنا چو کے نا" ایسا
 مرنا جو کوئی تھو کے نا۔"
 (صفحہ ۱۳۶) 'جوں دکھن میں چلیا ہے کہ "میاں منے دنیا میں
 رہے" ہاں کون ہاں کی نیں کنے" (؟)
 (صفحہ ۱۵۶) 'مثلاً ہے دکھن میں اگر کوئی سمجھو من میں
 "لوٹ کا لوٹ کا لوٹ" (حرص) لت میں لت خفت۔"
 (صفحہ ۲۲۶) "دکھنی دھرا :

تیرے کرتب کرنے نے میں چپ ہوئی بدنام
 میں مہانے نے اٹھ گئی تو جانے تیرا کام

(صفحہ ۱۴۹) ”دکھنی میں بھی بولے ہیں کہ تلو کوں ٹوسنی
(اہڑ - ٹھوکر) تیزی کوں اشارت ۔“

لیکن یہ کہاوٹ اردو میں موجود ہے ، چنانچہ :

”ٹٹو کو کوڑا اور تازی کو اشارہ“ (جامع اللغات) اور کسی قدر
اختلاف کے ساتھ یوں بھی آئی ہے :

”بھلے گھوڑے کو ایک چاہک بھلے آدمی کو ایک بات ۔“ (ز) ، (ج)

اس کے علاوہ خود مصنف کے دانشمندانہ مقولے نہ صرف خیالات
کی پاکیزگی اور بیان کی چستی کی بنا پر بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ
بھربے اور حقیقت پر مبنی ہیں اور اعلیٰ اخلاق معیار کے حامل ہیں ،
اس قابل ہیں کہ کہاوٹ اور ضرب المثل کے طور پر نقل ہوں ۔ میں
کھونے کے طور پر صرف چند یہاں نقل کرتا ہوں :

(صفحہ ۱۶) ”نہ آفت دیکھئے نہ زلزلہ ، آئے بھلے تو عالم بھلا ۔“

(صفحہ ۳۳) ”سمجھا سو پایا میں سمجھا سو گویا ۔“

(صفحہ ۴۰) ”آفتاب کوں کوئی بقل میں ماریا ہے ۔“ (۵)

(صفحہ ۴۲) ”اُرسی ہات میں ہوو مون دیکھئے نہیں آتا ۔“

(صفحہ ۵۴) ”ہمت نے نیست ہوتا ہست دنیا میں ہمت بڑی ہست ۔“

(صفحہ ۶۳) ”بڑے ہونا کیا ہاٹ میں بڑیا ہے ۔“

(صفحہ ۵۵) ”کیا کام آوے رس نہیں سو گاندا ، جس میں ہمت نہیں

سو خالی بھانڈا ۔“

(صفحہ ۶۴) ”دل کا یار سو پاک پروردگار ۔“

(صفحہ ۱۳۳) ”نامراد کیا متکنا ہے مراد ۔“

(صفحہ ۱۳۵) ”ہست ہستی ، بادشاہ ہوو باگ ، یو تینو ایک جنس

کی آگ ۔“

(صفحہ ۱۳۷) ”رام جیسا صاحب آئے تو ہنوت جیسا نگر جدا

ہوے ۔“

- (صفحہ ۱۳۸) ”ہوتا ہے تقدیر کا کرنا ، ولے مرد تدبیر نا ہسرتا۔“
- (صفحہ ۱۴۱) ”سنے میں شیطان کیوں ہاد آوے رحمان۔“
- (صفحہ ۱۴۲) ”ہرا وقت کیا پوچھ کر آتا“
- (صفحہ ۱۴۳) ”جیتا تیز ہوئی سوئی تو کیا شمشیر کے برابر ہوئی۔“
- (صفحہ ۱۶۲) ”اگر دایم اچھے ہک رضا تو عبث ہے ہو قدر قضا۔“
- (صفحہ ۱۴۷) ”نوے سو نوے قدیم سو قدیم۔“
- (صفحہ ۱۴۷) ”اپنے سو اپنے برائے سو برائے ، براہاں کون اپنیاں میں کیوں کر لیا یا جائے۔“
- (صفحہ ۱۶۲) ”لبوار کا کھیل جو آگ سون ہے تو بٹاوے وقت چلتا ہی ہے۔“
- (صفحہ ۱۶۳) ”جسے نیٹ نہیں اے بیٹ نہیں۔“
- (صفحہ ۱۶۳) ”جو ہارا آگ پر رہیا وو قائم اتار۔“
- (صفحہ ۱۶۳) ”حیات باؤگہ ہلنا چلتا ، اس حیات پر اپنا کیا اچھلتا“
- (صفحہ ۱۸۳) ”سہر سو ما ہاپ کی باقی سہریں ہاپ کی۔“
- (صفحہ ۱۹۰) ”جتنا قاعدہ اتنا قابند۔“
- (صفحہ ۲۲۷) ”کھارا ہے تو میٹھے کا پایا جاتا سواد۔“
- (صفحہ ۲۳۱) ”خدا کے عالم میں سب کچھ بھریا ہے ، سو کا ہے ہریا ہے ، جدھر دیکھیں اودھر دریا ہے۔“
- (صفحہ ۲۹۳) ”ہو عبادت چار سجدے کرنا خلق کون دکھلاتا ہے ، خدا ہر رسول کون بھسلاتا ہے۔“
- (صفحہ ۱۳۹) ”دنیا دو دیسی کی کچھ دبتا لیناچ کلم آویگا“
- (صفحہ ۱۴۳) ”دولت کوئی ماں کے بیٹ میں نے نیں لیا تا۔“
- (صفحہ ۱۴۸) ”خوب عورت خوب کھانا خوب لبوا خوب گھوڑا ، بو صب کچھے میسر ہے تھوڑا تھوڑا۔“

- (صفحہ ۶۳) ”کہانی کبھی ساری رات آخر وہیچہ ہات۔“
- (صفحہ ۱۳۰) ”رہا سوانگن ، (مستقبل) ہوا کا ڈیرا ، جو کچھ توں لیا سو تیرا۔“
- (صفحہ ۱۳۵) ”دسرا اگر دشمن ہوا تو سہل ہے ولے اپنا دشمن اپی ہونا بہوت جہل ہے۔“
- (صفحہ ۱۳۶) ”یو ہاٹ ہے ، جیوں لوکاں آئے ہیں تیوں چل جائے ہیں ، جیسا یہاں کرتے ہیں ویسا وہاں ہاتے ہیں۔“
- (صفحہ ۱۳۹) ”کوٹیاں کو سلک دیے (منہ لگایا) تو سوں چائے آئے۔“

(صفحہ ۱۳۹) ”اپنے ہی میٹھے ناہونا جو مکھیاں توڑ توڑ کھاوین۔“

یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سب مقولے مصنف ہی کے ہیں ؛ ممکن ہے کہ بعض ان میں دوسروں کے ہوں اور مصنف کا حصہ ان میں محض مترجم یا ناقل کا ہو، مثلاً ”یو ہاٹ ہے ، جیوں لوکاں آئے ہیں تیوں چل جائے ہیں“ الخ زیادہ تر ہمیں عربی ضرب الامثال کی یاد دلاتا ہے ؛ تاہم ان میں اکثر ایسے ہیں جن کی کسی معلوم ماخذ تک سراخ رسائی نہیں کی جا سکتی اور معمولی طور پر مصنف ہی کی طرف منسوب ہونے چاہئیں۔ بہر حال کتاب ایسے اقوال و امثال سے بھری پڑی ہے۔

ذیل میں بعض فقرے اصل کتاب سے نقل کیے جاتے ہیں جن سے ناظرین ہمارے مصنف کے شکستہ انداز بیان اور سنجیدہ خیال آرائی کا کسی قدر اندازہ لگا سکتے ہیں :

اپنے اور پرے

”جسے توں کچھ بھت سوں دیا ، اسے توں اپنا کیا۔ مشہور ہے کہ جدھر ہڈی ڈوٹی اودھر سب کوئی ؛ جسے توں اپنا کیا ووجہ تیرا۔ ہر کسی کوں نکو جان کہ یو وقت پر ہے میرا۔ عاقل آنگیتج جانتا ،

نادان چھپیں نے پچھانتا ۔ اپناں کون اپنے کرتا ، اپناں نے مال دریغ نا
دھرنا ۔ اپنے سو اپنے پرانے سو پرانے ! برائیاں کون اپناں میں کہوں
لپایا جائے ۔ اپناں میں بیوت تواضع بیوت تعظیم ۔ ٹوٹے سو ٹوٹے قدیم
سو قدیم ، کہیج ہیں کہ اول خویش بعد از درویش ۔ اتال سب خوب دستے
ولے سن رے جیوا ، گھر کون دیوا تو مسجد کون دیوا ۔ یو وو قصہ کہ :

چار بلانے چوندہ آنے سنسو گھر کی ریت
بہار کے آکر کھٹا کھٹے گھر کے گاڈی گھٹ

آشنا کون جانتا ، بیکانے کون پچھانتا ۔ دنیا میں اپناہٹ خوب ہے ،
اپناہٹ غایت خوب ہے ۔“ (صفحہ ۱۳۷)

ترکش بندی

”بادشاہاں نیر ترکش کیاں لہوا سپر اپنے سنگت لیے کر مستعد
ہو کر ، سب کون دلاسا دے کر ، مہابت سوں ، صلاحیت سوں جیوں
ترکش بندی کا قاعدہ ہے ، جی بات میں ترکش ہنداں کون فائدہ ہے ،
خوب نمائش سوں ، خوب آرائش سوں بیمار آتا ، بیمار آئے تو غافل نا
ہوتا ہشیار آتا ۔ اپنی مردی کا سنگار اپنے دیکھنا ، اپنے لشکر کون
دکھلاتا ، دسرہاں کو دیکھ اس (حوصلہ) آوے ، ترکش بندی کا عوش
آوے ، ترکش بند ترکش بندی کرے ، ترجوت اچھے وہ بھی خوب
دھرے ، ترکش بندی کا عالم بولیجہ ہیں کہ الناس علی دین ملوکہم
بادشاہاں ، بڑے ترکش ہنداں ۔ ترکش ہنداں کون اپنو پاٹ نہلاتا ،
اپنو ترکش بندی پر لپاتا ، اپنو دینا ہنداں تو ترکش بند کا دل قوت
پکڑتا ہے تو ترکش بند لڑتا ہے ، ہمت باری دیتی ہے آگہ میں پڑتا ہے ۔
جو بادشاہاں حاج یو روخی چھوڑے ، تو کدھر نے ترکش بندی
کمریں گے لگوڑے ۔“ (صفحہ ۱۳۹)

سو بیاڈا

”سوکن نا سووے نا سووے دیوے ، سوکن جیو براہیے سوکن
جیو لیوے ، سوکن نے محبت میں فتوا الہیے ، سوکن نے جڑیا دل تلے ،

سوکن آئی دو کھ سے سینہ پھٹا ، سوکن آئی عبت کا سواد اٹھیا ، داہم
 جھکڑیاں ، جون بلیاں لڑتیاں ، ادھر رے سالے اودھر رے سالیان ،
 چاروں طرف رے برستیاں کالیاں ، کوئی کوا کوئی کوئی ہائیں ، گھر میں
 کھلیتیاں چائیں مائیں ، یو گھر میں سکھ سون نہیں سوتا ، میانے میان لوگن
 کا ہنسا ہونا جو دیکھے تو کل کل ، عورت رے زیاست ساس کی جھل -
 سالا دشمن سالی دشمن ، بھر کا اس بھارے کامن ، کسے کسے سمجھاوے ،
 کس کس کے تقادیاں رے بھار آوے ، بیٹا بیٹی اپنیاں ماواں خاطر جدا
 لڑے ، یو جدا نعلتے ، یو جدا چو بیڑے ، بیزار ہوتے باپ کے اسم سون ،
 یو بی دشمن ہو بیٹھنے ایک قسم سون ، دل سب ہوتا بھنگ ، سعدی
 کتا ہے کہ :

بلائے سفر بہ کہ دو خانہ جنگ
 تہی ہائے رستن بہ از کشتی تمشک

(صفحہ ۲۵۲)

ہزیمت خوردہ پادشاہ اور اس کی یربادی

”ہر کوئی نہاٹا کر پادشاہاں پاس آتا ، پادشاہ انہاس کر کبر
 جاتا ، یک وقت ٹولیا تو جوڑتا کون ، پادشاہ نہالیا تو چھوڑتا کون ،
 غنیم لکن کیا کلم جائے ، اینج لوگن تو دشمن ہو آئے ، لوتھے ننگے ،
 ہزاراں ہزار بلایاں لائے ، اول اپنے لوکاچ رے ڈرتا ، پھیں دشمن کی
 فکر کزتا ، کون پادشاہ مال دھن سون نہاٹ کر سلامت گیا ، جیوں
 نکلیا نہا تیوں امانت گیا ، البتہ ننگے ہیں ، یا مفلس ہو کر گیا یا پکڑ
 لینے ہیں ۔ پادشاہاں کون جتی خوشی اتناچ دکھ بھی ہے ، چتا نیک اتناچ
 بد بھی ہے ۔ پادشاہ تو لکچ جو لشکر گھوڑے ہتی ہے ، سب نہائے
 پھیں کیا پادشاہاں کی عزت وہتی ہے ، مالی جیتا جیتا ہے ، ولے جھاڑ
 بیڑے اکھڑے پھیں کیا بنتا ہے ، شیشہ بھونے پھیں چڑتا نہیں ،
 ۱ - ”نہٹا“ یا ”نسٹا“ بہ معنی بھاگنا پنجابی میں عام ہے ۔

یہاں دونوں صورتوں میں ثانی حرف علت کے ساتھ ”اردو“ کے عام
 قاعدے کے مطابق) موجود ہے (مرتب)

پرکٹ ہوئے چھپیں جناور اڑتا نہیں ۔ یو ہات دانش کا سہا اس ہات سکون
 فاستا کون ، آہاں ٹٹ بڑھا چھپیں تھامنا کون ۔ حوضی کی ہال ٹوٹے تو
 پکایک باندھی جاتی ہے ، ولایت گئے چھپیں بھی ہات آتی ہے ؟ جیوں
 کہان کا تیر جوں بولے سو ہات ، یو دونو گئے تو مشکل ہے پھر آنا ہات ۔“
 (صفحہ ۱۵۰)

ادنی اور اعلیٰ کا فرق

”جن نے جو کچھ پایا سو ہمت اور تدبیر سوں پایا ، دولت کوئی ماں
 کے پیٹ میں نے نہیں لیا یا ، بڑا ہونے لگتا ہے تو بڑے لوگ سکون
 پیدا کر ، بڑے لوگ نے کیا ہو پکا کھڑے لوگ کون پیدا کر ،
 بڑے لوگ کی بڑی فکر بڑی دھانوں ، بڑے لوگ کی عقل اس حد لگن
 دوڑتی جان لک خدا کا قانون ۔ نہتے لوگ کے ہات نے کیوں ہوئے گا
 بڑا کام ، توں عقل پادشاہ ہو تجھے بہتر ہے قام ، تجھے روشن ہے تمام ،
 یو بولان لوگ رکھے ہیں چن چن ، سکلائی بد دھلیز تلک گھر گھٹ کی
 دوڑ باڑی لگن ، پکولا ہزار ہر دھرے گا ، تو کیا پیری کا کام بکریکا ۔
 جیتا تیز ہوئی سوئی تو کیا شمشیر کے برابر ہوئی ۔ بی کون باگ کا کس
 آنے کا ، لاندکا جیتے کے جہانپ بھائے گا ۔ کھلکا ہتی کے کام ساریکا ، سیاہ
 گوش سرزے کے اہالے مارے گا ؟ بڑے آدمی کون بڑا کام فرمانا ، نہتے
 آدمی کا کام کھر میں آنا جانا ، نیرے لانا لیجانا ۔“ (صفحہ ۱۵۱)

”سب رس“ اگرچہ اردو نثر کی پہلی کتاب ہے مگر وجہی کے دست و
 قلم نے اس میں وہ چوہر پیدا کر دیے ہیں کہ یہ خورد سال دوسری
 زبانوں کی کہنہ سال میاری کتابوں سے برابری کا دعویٰ کرتی ہے ۔
 اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس تالیف کو اردو زبان کے ساتھ وہی
 نسبت ہے جو ”مقامات ہدیہ“ کو عربی کے ساتھ اور ”مقامات حمیدی“ کو
 فارسی کے ساتھ ہے ۔ اور عین حیرت اس اس پر ہوتی ہے کہ جس شہرت
 کا یہ ادبی شاعر مستحق تھا وہ اب تک اس کو نصیب نہیں ہوئی ۔
 درحقیقت ہمیں اس کے عظیم اثر مولانا عبدالحق کا بخون احسان

ہونا چاہیے کہ انہوں نے مسیحائی کر کے اس کارنامے کو از سر نو زندہ کر دیا ۔

اورنگ آباد کو اردو کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے ! شاہی ہندوستان میں اردو شاہری کا پہلا ورق ولی اورنگ آبادی کی تحریک سے کھلتا ہے ۔ چھ شاہ کے عہد سے لے کر اب تک اس کا نام ہماری ادبی روایات میں گونج رہا ہے ۔ ادھر اردو زبان کی قدیم تاریخ و ادبیات پر تحقیقات کی تحریک بھی اورنگ آباد ہی سے شروع ہوتی ہے ۔ اس تحریک کے موجد و محرک مولانا عبدالحق ہیں ۔ اس تحریک کو شروع ہوئے اگرچہ دس سال سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا مگر اس نے اردو زبان کی تاریخ میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے ۔ جناب چہ سب رس بھی اسی سلسلہ انقلاب کی ایک کڑی ہے ۔

مثنوی یوسف زلیخا از شیخ محل امین

زیر نظر دستور دراصل ایک گزشتہ مضمون ”گوجری یا گجراتی اردو دسویں صدی ہجری میں“ کا حصہ تھی۔ لیکن اس عنوان کے تحت ان کا موجود رہنا کھٹکتا تھا، کیوں کہ امین کی ’یوسف زلیخا‘ دسویں گجراتیوں چھوڑ بارہویں صدی ہجری کی ابتدا میں لکھی جاتی ہے۔ اسی سبب سے میں نے اسے علیحدہ عنوان دے دیا ہے۔ (مرتب)

.....

خوب یاد چشتی کے بعد تقریباً ایک صدی تک گجرات میں کوثر شاعر نظر نہیں آتا جو نہایت حیرت خیز ہے۔ یہ امر ناقابل یقین ہے کہ گجراتی شعرا کا یہ دہشتان جس کو سولہویں صدی عیسوی میں ہم رونق پر دیکھتے ہیں، آنے والی صدی میں یک لخت ناپید ہو جائے۔ گجرات پر ان ایام میں جو انقلاب آتا ہے وہ جلال الدین اکبر کی فتح گجرات کا واقعہ ہے جو ۹۶۰ھ میں پیش آتا ہے۔ اکبر بعض اسرائیلی گجرات کی طلب پر گجرات آتا ہے اور اہل گجرات بغیر کسی قابل ذکر مقابلے کے اطاعت کر لیتے ہیں اور صوبے کا الحاق مغلیہ سلطنت کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ جدید نظم و نسق کے اثر نے اس میں شک نہیں کہ عام رجحان فارسی زبان کی طرف پھیر دیا ہوگا، لیکن یہ خیال کرنا فریب فریب ناممکن ہے کہ اس سیاسی تبدیلی نے گوجری ادب و تالیف کے سلسلے کو یک قلم ختم کر دیا۔ ایسی مقبول تحریکات ہکا بکا مفقود نہیں ہو جایا کرتیں۔ اس لیے ہم کہیں گے کہ اگرچہ اس

صدی کے مصنفین اور ان کی تالیفات ابھی تک معرض گمنامی میں ہیں ، تا ہم ہمارا خیال ہے کہ یہ ادبی سرگرمیاں برابر جاری رہی ہیں ۔

یہاں ہم اس تپاس کا اظہار بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اس صدی میں دکنی مصنفین کا دبستان بہت کچھ ترقی حاصل کر چکا ہے اور یہ بہت ممکن ہے کہ گوجری دبستان دکنی دبستان کے ذیل میں شمار ہونے لگا ہے ۔ دکن کی سلطنتیں بالخصوص عادل شاہی اور قطب شاہی خاندان اردو نوازی کے لیے مشہور ہیں اور یہ اصلاً گجراتی اہل قلم کے لیے نقل مکان کر کے دکن میں جانے کے لیے ہرک ہو سکتا ہے ^۱ ۔ اب گوجری اور دکنی زبانیں آپس میں اس قدر ملتی جلتی ہیں کہ بسا اوقات ان میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ نیز گوجری نے یہ حیثیت زبان کے دکنی پر بہت اثر ڈالا ہے ۔ اکثر محاورے ، الفاظ اور ترکیبیں جو اصلاً گجراتی تھیں ، دکنی میں عام رواج پا گئیں ۔ ان صورت حالات میں کوئی تعجب نہیں اگر گوجری زبان کو دکنی مان لیا گیا ہو اور گجراتی مصنف دکنی شمار کر لیے گئے ہوں ۔ کم از کم یہ التپاس ہمارے عہد میں تو ضرور موجود ہے ۔ مثلاً میں مذکور الصدر خوب چد چشتی کا نام پیش کرتا ہوں ! اب یہ بزرگ گجرات کے باشندے ہیں اور تمام عمر احمد آباد میں رہے ۔ باوجودیکہ وہ اپنی زبان کو 'ہولی گجرات' کہتے ہیں یا اسے ہند انہیں دکنی مصنف کہا گیا ہے ۔ مثلاً پروفیسر ہلوسپارٹ انڈیا آفس کی 'فہرست ہندوستانی مخطوطات' (طبع ۱۹۰۶ء) میں ان کی تصنیف 'خوب ٹرنک' کو جو 'سواج خوبی' کے ساتھ ہے ، 'لفظ اسلامیہ پر ضوابط' کتاب یہ زبان اردو دکن ^۲ بیان کرتے ہیں ۔ یہی بیان پروفیسر موصوف نے صفحہ نمبر ۲ پر بد ذیل نمبر ۲ دہرایا ہے ۔

اسی سلسلے میں شیخ چد امین کا نام بھی لیا جا سکتا ہے جس کو تمام مصنفین دکنی تسلیم کرتے ہیں ۔ اسپرنگر صفحہ ۶۰۱ فہرست کتب خانہ اردو میں چد امین کی مثنوی یوسف زلیخا کو 'دکنی نظم' میں بیان

۱ - دیکھئے مضمون "گوجری یا گجراتی اردو دسویں صدی ہجری میں"

(مرتب)

۲ - فہرست ہندوستانی مخطوطات صفحہ ۶ ، نمبر ۱ ۔

کرتے ہیں۔ علیٰ ہذا حکیم شمس اللہ صاحب قادری 'اردو سے قدیم' میں اور نصیر الدین صاحب حاشی 'دکن میں اردو' ۲ میں اسے 'دکنی مظلوم' مانتے ہیں۔

دکنی ادبیات و زبان نے ہمارے خیال پر اس قدر زبردست غلبہ پا لیا ہے کہ غیر دکنی مصنفین کو بھی دکنی تسلیم کر لیا گیا ہے اور ہمیں مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ دکن کی شہرت نے گجرات کے کئی کائناتوں کو اس سے چھین لیا ہے اور ایک گجراتی یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہے ع :

طاع شہرت رسوائی مہنوں بیش است
ورنہ طشت من و او ہر دو زہک بام افتاد

مجھ امین کو گجراتی مانتے کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مصنف خود اپنی زبان کو گوجری زبان کرتا ہے۔ چنانچہ ایات ذیل ملاحظہ ہوں جو 'یوسف زلیخا' کی سبب نالیف کے سلسلے میں شاعر نے لکھے ہیں :

سنو مطلب اے اب یو امیں کا
لکھی گجری منے یوسف زلیخا
ہریک جاگے ہے قعہ فارسی میں
امیں اس کون اتاری گوجری میں
کہ ہوجھے ہر کدماں اس کی حقیقتہ
بڑی ہے گوجری چک بیچہ نعمہ

اس کے علاوہ کتاب میں ایسے الفاظ موجود ہیں جو خصوصیت کے ساتھ گجرات سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً 'سہنا' بجائے چھینا، 'اکل' بجائے آکر، 'کام' بجائے کاتو اور 'ٹھام' بجائے ٹھانو گجراتی لہجہ ہے۔ اسی طرح 'اے' عاطفہ اور 'ہوٹ' یہ معنی طوطی گجراتی الاصل ہے۔

۱۔ 'اردو سے قدیم تاج نمبر' صفحہ ۸۸۔

۲۔ 'دکن میں اردو' صفحہ ۵۰۔

پہلے امین کے حالات زندگی سے ہم بالکل ناواقف ہیں ، صرف اسی قدر جانتے ہیں کہ وہ 'یوسف زلیخا' کا مصنف ہے ۔ یہ مثنوی دو شتے کے دن جہادی الاول کی دوسری تاریخ ۱۱۰۹ھ میں یہ عہد اورنگ زیب عالم گیر ختم ہوتی ہے ۔ چنانچہ :

زمانا شاہ اورنگ زیب کے میں
لکھی یوسف زلیخا کو امین نہیں
اللہی توں ایسا عاقل شہنشاہ
رکھیں قائم رہے جب لک مہر ماہ

آگیارہ سو اوپر جب نو سو گزرے
برس ہجرت پہلے مصطفیٰ کے
انہی تاریخ دوہی وے دل الفروز
جہادی الاول اتوار کے روز
نہیل کے وقت لکھ رہا امین وے
اللہی توں محبت سب کتنی وے
(از خاتمہ یوسف و زلیخا)

یہ مثنوی ایک بڑی کتاب ہے جس میں چار ہزار ایک سو چودہ ابیات ہیں :

بیاں ہیں چار ہزاراں اوپر ایک سو
دے کر چارہ بیت گجری سئو [کذا]

شاعر نے دیباچے میں حمد و نعت ، خلفائے اربعہ ، حسنین و ہانیان مذاہب اربعہ اور شیخ عبدالقادر جیلانی کے ذکر کے بعد ایک علیحدہ عنوان کے نیچے معراج کا بیان دیا ہے ۔ اس کے بعد عشق حقیقی پر رائے زنی کی ہے ۔ زان بعد تعریف سخن پر ایک فصل ہے ۔ اس کے بعد ہی اصل قصہ شروع ہوتا ہے جس کی تفہید میں شاعر کہتا ہے کہ یوسف و زلیخا کا قصہ فارسی زبان میں بہت عام ہے لیکن میں اس کو گوجری زبان میں منتقل کرتا ہوں تا کہ عوام الناس اس قصے سے

واقف ہو جائیں۔ شاعر نے مثنوی کے خاتمے پر بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے :

الہی لون مجھے توفیق جو دی تو میں نے فارسی کی گوجری کی
سرا مطلب ہے ہوں سب کوئی جانے حقیقت اس کی سب کوئی چھپانے
بڑا ہووے جو کوئی فارسی کون وہی جانے حقیقت ای سو دلموں
انے جو نا بڑا ہووے بھارا سو کیا بوجھے انوں کا عشق سارا
امیں اس واسطے کیتی سو گجری حقیقت سب عیاں ہووے انوں کی
کہ عشق اول انوں نے کیوں نہایا انے آخر اسے کیوں کر نہایا

فارسی زبان میں یوسف و زلیخا کے قصے کو مختلف شعراء نے نظم کیا ہے۔ ان میں زیادہ مشہور تین مثنویاں ہیں؛ پہلی وہ جو فردوسی کی طرف منسوب ہے، دوسری کے مالک مولانا عبدالرحمان جامی ہیں اور تیسری تاظم مروی کے قلم سے نکلی ہے۔ امین کی مثنوی بہ لحاظ روایت و ترتیب مولانا جامی کی مثنوی پر مبنی ہے۔ قصے کے اہم خط و خال وہی ہیں جو جامی کے ہاں مروی ہیں؛ سرخیاں قریب قریب وہی ہیں، لیکن جزویات و حشویات میں مختلف ہے۔ اس مثنوی میں جامی کی رنگینی ادا اور مکلف طرز بیان کو سلاست اور سادگی میں بدل دیا گیا ہے اور ایسی خصوصیات کو بروئے کار لایا گیا ہے جو ہندوستانی زندگی اور اس عہد کے مسلمانی رسم و رواج پر روشنی ڈالتی ہیں۔ مثلاً امین نے زلیخا کے لباس اور زیور کے ذکر میں، جو بالتفصیل دیا گیا ہے، اس زمانے کے اعلیٰ خاندانوں کی خواتین کی ہوشاک اور زیور و دیگر اسباب آرائش کی ایک صحیح تصویر کینچ دی ہے۔ اشعار ذیل ملاحظہ ہوں :

زلیخا کا سنو ہم اب سو سنگار کہتا ہیکا امیں اب ہو کر ہشیار
زلیخا کے تھے ایسے بال سر میں نہ اوے سنک ان آکل نظر میں
انوں کے رنگ آکل سنک ہے کم نہ عنبر ان آگے مارے کچھو دم

جڑے تھے بہت اسکوں در کوھر
دھرا اس کے اوپر لیکا امولا
انے موقی عجائب بوت چلکیں
کچل سرمہ سون پر اسکے زین تھے
سے ہیں اڑدے سارے جا جنگل میں
جڑے تھے ننگ اسکوں تازہ و تر
ہتھی کے اگل شرمندہ شبیم
جو دیکھے سو جگت سون ہووے
تائب

نراکت کیاں انوں بہہ جالیاں تھیاں
تھے ان میں ذات جوں موقی کی
لڑیاں

نہ تھا کچھ دکھ سراسر سکھ اتھا او
زلیخا کی تھی ٹھوڑی سبب جیسی
بھوان اوپر تھا وسہ تر و تازہ
لگائی تیر ایسے جسکوں وے جاتی
جوں گنج اوپر سرب ے مانڈتا بھن
انے چنیے کی کلیاں اس نلے ہیں
بھی اس کی دگدگی کی جوت بسیار
جڑے لعل و گہر اس کٹی ہنر کے
کیا افسوس بوت ان اپنے من میں
انوں کے ریشمیں بھندے سوچھا
جیں

جہانگیر ہاں نے پوچھاں ان سوں
زیبا

جڑاؤ نظر تھا میں ا بھول سر پر
پشانی دیکھ چندن جای بھولا
ٹیکے کے ننگ روشن بوت جھلکیں
انکھوں آگل خجل سارے ہرن تھے
ناسک کون دیکھ کر بو پش خجل ہیں
عجب بھیتی تھی بیسر ناک بھیر
تھے کالوں کے اگل گل ہاسمین کم
اتھے کن بھول ۳ کاتوں بہہ عجائب

انوں اوپر عجب بھول بالیاں تھیاں
ادھر دو لال تھے جو رنگ مرجاں

تھا حلقہ سوٹیکا یا مکھ اتھا او
بتیسی جگ میں اس کی بیٹل تھی
لگایا تھا مکھ اوپر رنگ غازہ
کہانان بھوں ہلک تیریاں چلائی
لٹاں مکھڑے کے اوپر مثل ٹاگن
موہن مالا انے کٹھ مالا گل میں
سینے اوپر جوت بھجنا چندن ہار
لگا تھا زر کمر ۴ اوپر کمر کے
کمر کون دیکھ جیتے گئے سوہن میں
بھی باز و بند بازو پر براجیں

جڑاؤں کا سو چوڑا ہاتھ میں تھا

۱۔ جھوسر - ۲۔ ٹٹہ - ۳۔ کرن بھول - ۴۔ کمر کا زیور -

۵۔ ایک قسم کے کڑے -

جڑے تھے ان کے بھہ بہتہ رنگینیں
بھوت کچھ جوت بھی ان گجریاں
ماں

وہ سارے لعل اور مرجان کھاتی
اے پھر پیچھوے ان سوں صفا تھے
ہرم سوں زین مد ماتے کہے تھے
نہ آوے اوڑنی کے اور کچھ تول
اسے کٹیں کٹیں نواکت سوں چنی
تھیں

نہ زر کے ہلکے تھے در گہر کے
مشک عنبر عطر خوشبو بھرائی
انہی بے مثل جگ بہتروے ناری
لٹاں موتیاں گیاں ٹانگیاں انو پر
نہ تھا کس می جگے کچھ بھی
ادھورا

جو کچھ چاہی سو اس کے تھا مہیا
ز لعل و گوہر و در سب جڑا تھا
زر گوہر زمرد ہر کیا تھا
جڑاؤں کا چتر سر پر سو دھرق

اس طرح شادی کے موقع پر شاعر نے دعوت کا ذکر اعہام کے
ساتھ کیا ہے اور کہانوں کی پوری پوری تفصیل دی ہے۔ اس بیان سے
معلوم ہوتا ہے کہ کھائے سے بیشتر مہمانوں کو قند اور مصری کا
شریت جس میں مشک و عنبر پڑا ہوا تھا، ہلایا جاتا تھا۔ چنانچہ امین
گویا ہے :

انگوٹھیاں اوسیاں تھیاں انگلیوں میں
جڑاؤں کی گجریاں پاؤں میں تھیاں

انہی ہازیب گجری قل سہاں
انگوٹھوں پیچہ انوٹ^۱ بے جا تھے
ز سہی ہاتھ ہگ والے^۲ کیے تھے
تھی زونگی اوڑنی کئی لاکھ کامول
تلک سب زونگی قاروں سے بنی تھی

تلک اوپر تھے ٹانگے بند زر کے
کناری زر کی در دامن لکائی
ہنی زربفت کی سروال بھاری
انہی کسے سو جوئے پاؤ بہتر
زربتا اس کے تن پر تھا سو پورا

نہ تھی کچھ کھوٹ وائ کسوت میں
ذرا

تخت زر کا اسی کارن بیٹھا تھا
چہنر سر کے اوپر زر کا دھرا تھا
ہمیشہ تخت پر آرام کرتی

۱۔ پاؤں کے انگوٹھے کا گھنگرو دار چھلا۔

۲۔ راتا = سرخ۔ پنجابی میں 'راتا' موجود ہے۔ (مرثیہ)

سنے روپے کی قابو بیجہ کھانے
اول شربتہ سو قند مصریوں کے
انوں کے بیجہ مشک عتبر بھرے
ولے کئی نزاکت سوں کرے تھے

اس کے بعد کھانے لائے جانے ہیں جو ذیل میں مذکور ہیں :
حکم یوسف کے سے دوڑے بورچی
جو کچھ یوسف کہا تھا اس سے
سو چند

مٹھائی سب جس کی کیتی موجود
شکر ہارے نے موصوف اور بتاے
کہوری دیوڑی اور شعی ٹر
فرش شکر میں اور لوزاں^۱ بنائے
چربس^۲ حلویے اے حساوانے
مغزی^۳

طبیب صابونیوں^۴ سیتی بھرے
سے سب جس کے لیاے بھی دان
سورجے کو قتی کاچے تلے تھے
بولاؤ مرغ اور بولاؤ ماہی
بولاؤ نوکس اور ہلاؤ بختی
گندوڑوں سیتی وو بھر کر دھرے
تھے
اچاراں تسم سب منگوائے بھی تان
کباب شامی اور سیخان جئے تھے
ہلاؤ رشتہ^۵ لائق پادشاہی
مقلعہ^۶ [کذا] خشکہ اور دم پخت
فرنی

۱۔ چلوبی - ۲۔ لوزینہ - ۳۔ چربش -

۴۔ سفید رنگ کا حلوی جس میں بادام اور پستہ بہت ڈالا جاتا ہے
اور لکیاں بنائی جاتی ہیں - ۵۔ حلویے کی ایک قسم -

۶۔ حلوائی سوخان یعنی سوخن حلوی -

۷۔ بادام ، شہد اور روغن کنجد سے تیار کیا جاتا ہے -

۸۔ کذا ، شہد جسے نا واقع شولہ بھی کہتے ہیں -

مشن زہریاں عاشق کھیر
کلیجے اور حلوانوں کے قلیجے
ملا یاں سیویاں شکرانے شیر
بھی لاوے مریہوں اور تیتروں کے
تاجی نان اور نان خطائی
بھی باتر خانی اور بے حد مٹھائی
زبان کاڑ پنچہ کش ہے نان
بھی ٹاڈو روغنی آبی سوں پر خواں
چپاں بیہکیاں مانڈے نے جونکی
انوں سیٹی پت قاباں بھری تھی
کہاں سب کا بیان کہنے میں آوے
امیں عاجز سوں کچھ کہیا نجاوے

ان کہانوں میں مٹھائیاں، حلوے، گوشت اور روٹیاں وغیرہ
موجود ہیں؛ لیکن تعجب یہ ہے کہ دعوت مٹھائی سے شروع ہوتی ہے
جو ہمارے عہد کے رواج کے بالکل برعکس ہے۔

پند امیں کی مثنوی میں ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تمام
عنوان یا داستانوں کی تمہید ساق نامے کے اشعار سے شروع ہوتی ہے
جن میں بعض وقت نصیحت کا رنگ بھی اختیار کر لیا گیا ہے۔ میں یہاں
اس کے ساق نامے کے آیات کی ایک دو مثالیں تحریر کرتا ہوں :

اوسے ساق لیادے جام جمشید
کہ جس کی جوت آگل شرمای
خورشید

اوسے ساق وے شیشا توں لیارے
کہ جس آگل خجل ہوویں ستارے
کہ جس آگل خجل ہووے ہونم
جان

اوسے ساق ہلادے مطرح (؟) ہاں
خدا کی قدرتوں پر دل لگاؤ
دیکھو دنیا کتنی تم بھر کہ نظراں
ہزاراں جنس کے جہازاں لگائے
لگائے گل میں بھال ہر بیانت کیرے
دیکھو صنعت سو ڈال اور پانت
کیرے

ایسی باڑی بنا کر آپ مالی
ہوا ہے حق تعالیٰ لا اوبالی
(یوسف زلیخا ورق پ ۵۲)

فتح توں لیا اے ساقی زونگرا
 اول تیرے لبوں اوپر وے دھر
 بھر اس میں سے کہ جون روشن ستارا
 امیں کون کر پچھوں دے جام
 انعام
 امیں لہوے پیالا سر چڑا کر
 پیالا پی کے شادی دل میں لاوے
 کرے تعظیم تیری سر نما کر
 نکل کر دود غم سب دل سوں
 چاوے
 نہ آوے اور کچھ اللہ بن یاد
 زمانے کا نہیں بک بھانت پر دور
 رشتہ در ذکر رب مشغول دلشاد
 کدھی کچھ اور ہے کدھوں
 کچھو اور
 کدھیں عاقل کون کھیلا ، کر
 بٹھاوے
 کدھیں ہستے کتبیں غمگین
 کرے او
 کدھیں اوچر کرے ہستی
 کدھیں ہستا کرے ویرانہ گھر
 او
 کدھیں ہستا کرے ویرانہ گھر
 کون

شاعری کے قطعہ نظر سے اگرچہ حشو و زوائد کثرت سے ہائے
 جاتے ہیں اور بھرتی کے اشعار بہت ملتے ہیں ، تاہم بد امن کے ہاں
 زبان بہت صاف ہوگئی ہے اور غالباً یہ پہلی مشنوی ہے جو اس قدر سہل
 اور آسان زبان میں لکھی گئی ہے ۔ ایسے الفاظ کی تعداد بہت کم ہے
 جنہیں موجودہ اردو خوان نہیں سمجھ سکتے اور یقینی طور پر کہا
 جا سکتا ہے کہ بارہویں صدی کی ابتدائی مشنویوں میں امن کی
 'یوسف زلیخا' ایک نہایت کشیاب اور بارآور کوشش تسلیم کی
 جا سکتی ہے ۔

۱ ۔ کھیلا ۔ بیوقوف و ہاکل ۔ راجستھانی میں اس کی شکل 'گہلو' ہے ، سندھی میں یہی لفظ 'گہلو' کی صورت میں ملتا ہے ۔ (مرتب)

رسالہ 'تاج' کا اردوے قدیم نمبر

(از اورینٹل کالج بیگزین ، بابت مئی ۱۹۲۸ء)

رسالہ 'تاج' حیدرآباد کا ایک علمی ادبی رسالہ ہے۔ ملک کا ادبی طبقہ عام طور پر اس سے روشناس نہیں لیکن اس نے اپنا اردوے قدیم نمبر شائع کر کے اردو علم و ادب کی دنیا میں اپنے آپ کو نمایاں امتیاز کے ساتھ متعارف کرایا ہے؛ اردو زبان کے بارے میں تاریخی و لسانی تحقیقات و تدقیقات کا مذاق رکھنے والے نگاہوں کے لیے دل چسپی کا غیر معمولی سامان فراہم کر دیا ہے۔

اس نمبر کا دو مستقل تالیفوں پر اطلاق ہوتا ہے جس میں پہلی تالیف حکیم سید شمس الدین صاحب قادری ماحر علوم آثار قدیمہ (حیدرآباد) کی کاوش دماغی کی وہیں منت ہے۔ اس میں ذکری اردو اور اس کی نظم و نثر کی مفصل تاریخ، اس کی عہد بہ عہد ترقیوں کا تذکرہ اور ابتدائی زمانے سے لے کر عہد اورنگ زیب کے آخر تک کے شعراء اور مصنفین کے صحیح حالات تحریر ہیں۔

اردو تذکرہ نویسی سے جن اہل ذوق کو ذرا بھی دل چسپی ہے، وہ اس الم ناک حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ ہمارے ہاں کے تذکرہ نویسوں نے اس فن لطیف کے ساتھ کس درجہ لاپرواہی اور بے پروائی نہ سلوک روا رکھا ہے۔ تلاش کے باوجود ہمیں کوئی ایسی مثال نظر نہیں آتی جسے مستثنیات کی فہرست میں باریابی نصیب ہو سکے۔ ہمارے ہاں کے تذکرہ نویس ذاتی تلاش و تفحص، تخلیق و تدقیق اور استدلال و درایت سے گریز کرنے کے عادی اور اگلے مؤلفوں کی

انسانہ طرازیوں کی نفل کرنے کے مشتاق نظر آتے ہیں۔ شروع سے لے کر آخر تک مکھی پہ مکھی مارتے چلے جاتے ہیں اور خود اپنی نگاہ تحقیق کو مطلقاً تکلیف نہیں دیتے۔ سن و تاریخ، ماہ و سال اور حالات و واقعات کی صحت اور اسباب صحت جو فن تذکرہ نویس کے امتیازی و اساسی اصول ہیں، ان کی تحقیقات عالیہ کے دوران میں ایک سرے سے مرادود توجہ نہیں دیتے۔ ان کے ہاں روایت کا شوق عام اور روایت کی سعی فضول سمجھی گئی ہے۔ نظر برائیں حالات جب ہم اس تالیف کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں بے اختیار حکیم صاحب موصوف کی محنت و کاوش کی داد دینی پڑتی ہے۔

حکیم صاحب کو اس تالیف کی تیاری میں عربی، فارسی، انگریزی اردو، فرج اور جرمن کی متعدد کتابوں کی ورق گردانی کرنے اور ان میں سے اپنے مفید مطالب آموز کے اخذ و انتخاب اور رد و قبول میں جو دقت پہلی آئی ہوگی، وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یقیناً ان کی محنت و کوشش کا نتیجہ ایک نہایت شان دار اور قابل قدر علمی حثیت کا حامل اور اردو زبان میں اس موضوع پر اپنی طرز کی مستند و مؤثر مثال ہے؛ بالخصوص اردو کے قدیم دکنی شعراء کے سلسلے میں (جن میں سے ہم یہاں کے نام اور حالات و واقعات سے بے خبر اور سراسر تاریکی میں تھے) حکیم صاحب موصوف کی سعی بلیغ بہ ہر لحاظ لائق تشکر ہے۔ اور اس اعتبار سے حکیم صاحب نے اردو پر جو احسان عظیم کیا ہے، اس کے بارے اردو علم و ادب کبھی سبک دوش نہیں ہو سکتا۔ اس اہم موضوع پر اس تالیف میں پانچ مسئلہ ابواب نظر آتے ہیں، جن میں حکیم صاحب نے مفصلاً داد تحقیق دی ہے۔ حق یہ ہے کہ اگر اس کتاب میں صرف یہی ابواب ہوتے تو بھی وہ اس قدر، قدر و منزلت کی مستحق ہوتی، کیونکہ ”دکھنی اردو“ کی نامعلوم حالت پر جو روشنی اس سے پڑتی ہے، وہ بالکل نئی اور اچھوتی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اردو کے قدیم کے بارے میں اس قدر جامع و مانع اور مفصل و مبسوط معلومات کسی کتاب اور تذکرے میں ایک جگہ

جمع نہیں ملیں گی۔ اور حکیم صاحب کی یہ کتاب آنے والے تذکرہ نویسوں کی بہترین کوششوں کا غزن و ماخذ بن جائے گی اور ایک ایسا کارنامہ قرار دی جائے گی جسے ہر دور اور ہر عہد میں یہ نگاہ استحسان دیکھا جائے گا۔

حکیم صاحب نے اپنی اس تالیف کا انتساب مولانا مولوی عبدالحق صاحب آنویری سیکریٹری الہمن ترقی اردو کے نام سے کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اردو زبان کی عام خدمت کے علاوہ اردو سے قدیم کی خدمت کے معاملے میں بھی کوئی شخص مولوی صاحب موصوف سے زیادہ قابل خطاب و مستحق انتساب نہیں ہو سکتا۔

حکیم صاحب کی اس گراں پایہ تالیف کے بعد دکن کے مشہور و معروف بزرگ حضرت بندگی مخدوم ابو الفتح سید محمد حسینی گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کا ایک رسالہ موسم بہ 'معراج العاشقین' نظر افروز ہوتا ہے، جو تقریباً نویں صدی ہجری کے آغاز کی دکنی اردو میں تصنیف ہوا ہے۔ یہ رسالہ جناب مولوی عبدالحق صاحب سیکریٹری الہمن ترقی اردو کی تصحیح و تشریح سے شائع کیا گیا ہے۔ شروع میں مولوی صاحب موصوف نے حضرت گیسودراز کے اکثر حالات و واقعات بیان کیے ہیں اور زیر نظر تالیف سے متعلق بعض امور پر بحث بھی کی ہے، نیز آخر میں بعض اجنبی اور غیر مانوس الفاظ کی فرتک بھی دے دی ہے۔ یہ رسالہ 'تاج' کا دوسرا قابل قدر کارنامہ ہے جس سے ہم اس عہد کی دکنی اردو کے باب میں بہت کچھ مفید اور نتیجہ خیز معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

آخر میں ہم 'تاج' کے مدیر جناب غلام محمد انصاری وفا کو داد دیتے ہیں جن کی کوششوں نے رسالے کے 'اردو سے قدیم ممبر' کو ہماری بہتر سے بہتر توجہات کا مستحق بنا دیا۔

اردو شد پارے (جلد اول)

از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

(از اورینٹل کالج میگزین ہائٹ می ۱۹۳۰ء)

گزشتہ چند سالوں سے قدیم اردو اور اس کی ادبیات کے متعلق ہندوستان میں تحقیقات کا شوق روز افزوں ترقی کر رہا ہے جس سے ہمارے ذخیرہ معلومات میں متحدہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اور اگر تحقیق و تلاش کی یہی رفتار جاری رہی تو وہ دن دور نہیں جب اردو کی قراموش شدہ تاریخ عیداً دنیا کے سامنے آ جائے۔ اب تک اس سلسلے میں جو کچھ ہو چکا ہے اس سے ہمارے کئی پرانے نظریے منسوخ ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ نئے نظریے قائم کیے گئے ہیں، جن کے معتبر و مستند ہونے میں کسی احتیال کی گنجائش نہیں۔ اس خصوص میں دکن نے ہندوستان کے کئی دیگر صوبوں کے مقابلے میں بڑا کام کیا ہے اور حقیقت میں قدیم اردو کی تحقیقات کی تمام تر تحریک دکن کے ساتھ وابستہ ہے۔ اردو کے ان پرستاروں میں سب سے پیش پیش مولوی عبدالحق سیکرٹری انجمن ترقی اردو ہیں، جو فی الواقع اس جدید تحریک کے پیشوا اور امام ہیں۔ ان کے مفید اور عالمانہ مضامین نے جو وقتاً فوقتاً رسالہ 'اردو' اورنگ آباد میں شائع ہوتے رہے ہیں، اردو کی تاریخ میں انقلابی کام کیا ہے۔ ان کے بعد حکیم شمس اللہ صاحب قادری ہیں جن کی مختصر مگر جامع معلومات تصنیف 'اردو قدیم' تاریخ اردو میں ایک گران قدر اضافہ ہے۔ آغا حشر حسن دہلوی پروفیسر نظام کالج حیدر آباد مصنف 'ہس پردہ' کا

مذکور بھی اس خصوص میں ضروری ہے۔ موسوف نے اپنے متفرق مضامین سے دکنی مصنفین کے حالات و تصنیفات پر جدید روشنی ڈالی ہے۔ دوسرا بڑا کام مولوی عبدالحق کی طرح آپ نے یہ کیا ہے کہ قدیم دکنی مصنفین کے مخطوطات کا ایک گران قدر ذخیرہ بڑی سعی و تلاش سے جمع کیا ہے۔

اس فہرست میں نیا اضافہ جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل سید محی الدین قادری ایم۔ اے کے نام سے ہوتا ہے، جو سال گزشتہ لندن سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے کر واپس ہندوستان آئے ہیں۔ انہوں نے حال ہی میں قدیم اردو ادبیات سے متعلق متفرق تاریخی و ادبی مواد کو ایک تالیف "اردو شہ ہارے" جلد اول کی شکل میں یہ سلسلہ مطبوعات مکتبہ ابراہیمیہ مرتب کیا ہے۔

"اردو شہ ہارے" حیدرآباد کی طباعت کی ایک نفیس مثال ہے۔ کاغذ و کتابت کی اعلیٰ بائیکی کے علاوہ اہل مطبع نے اس کو ذیلہ زیب و دل پسند بنانے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا ہے۔ ادھر چنانچہ مراتب کی ترتیب میں محنت اور سلیقے سے کام لیا ہے اور کئی نمونہ میں اپنی جدت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ مثلاً آغاز میں ایک مختصر سی عام فہرست پر فصاحت کی گئی ہے، جو ابواب مندرجہ کتابت کی حامل ہے۔ مضامین ابواب کی فہرستیں کتاب کے اندر ہر باب کے شروع میں دی گئی ہیں۔ کتاب کے آخر میں آٹھ ضمیمے، فہرست معین و واقعات، سرنگ الفاظ اور اشاریہ درج ہیں۔ باوجودیکہ فہرستیں اس کتاب کا ایک وسیع جزو ہیں تاہم ناظرین کتاب کے لیے عام مطالب کتاب پر آسانی سے رسائی حاصل کر لینا مشکل ہے۔ شاعر کا ذکر کہیں ہے، نمونہ کلام کہیں ہے۔ اور اگر اتفاق سے وہ نثر نکلو بھی واقع ہوا ہے تو اس کی نثر کسی اور مقام پر ہے، اور نہ تمام نمونہ کلام ایک جگہ درج ہے بلکہ مختلف مقامات پر ہے۔ غم خیال کرتے ہیں کہ تفصیلی فہرست کا آغاز کتاب میں درج نہ ہونا ایک افسوس ناک فروگزاشت ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ اردو کے لسانی اور صوتی پہلوؤں پر کام کرنے کے لیے انہیں لندن، آکسفورڈ، کیمبرج، پیرس اور ایڈنبرا کے کتب خانوں کی سیر کرنی پڑی۔ ان کتب خانوں میں قدیم اردو کی کتابیں بھی نظر سے گزریں؛ تب انہیں خیال آیا کہ اس تمام ادبی ذخیرے کے بہترین حصوں کا انتخاب جمع کر لیا جائے تاکہ اردو دانوں کی خدمت میں پیش کیا جاسکے (صفحہ ۱)۔ جب گزشتہ سال تعطیلات میں ہندوستان آئے تو سارے انتظامات ان کے ساتھ تھے۔ حیدرآباد آنے پر اس میں صرف چند اضافے کیے گئے (صفحہ ۴)۔ شعراء اور ان کی کتابوں کے متعلق جو کچھ حالات لکھے گئے ہیں، وہ خود ڈاکٹر صاحب کی ذاتی تحقیق و تفتیش اور اعلیٰ ماخضوں کے مطالعے کا نتیجہ ہیں اور کہا ہے کہ اس بات کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ سنی سنی اور غیر مستند تحریروں پر بھروسہ نہ کیا جائے (تمہید)۔ یہ بیانات اگر صحیح ہیں تو اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر زور نے ایک بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اب ہم اصل کتاب پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

”اردو ادب شمالی ہند میں“ اس عنوان کے تحت میں ڈاکٹر صاحب نے جو امور بیان کیے ہیں، ہمیں ان سے اختلاف ہے۔ لکھتے ہیں:

”یہ درحقیقت ایک حوصلہ فرسا بات ہے کہ ان ممالک میں جہاں اردو نے جنم لیا، اس کو عرصہ دراز تک معمولی ملکی زبان سے زیادہ درجہ نہیں دیا گیا؛ بلکہ اس کے برخلاف گیارہویں صدی ہجری کے آخر تک کیا علماء اور کیا امراء دونوں اس سے بیزار رہے اور اس دوران میں یہ کہنا مناسب (کذا) نہ ہوگا کہ وہ کبھی ادبیات میں استعمال نہیں کی گئی۔“ (صفحہ ۶)

اگر سرود اور شعر ادبیات کے ذیل میں شمار ہو سکتے ہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ شمالی ہند میں گجرات و دکن سے بہت پیشتر ملکی زبان میں شعر گوئی شروع ہو جاتی ہے۔ ابھی مسلمانوں کو دہلی میں آباد ہونے سے تیس چالیس سال گزرے ہوں گے کہ ان میں

اپنے لوگ پیدا ہو گئے جو ہندی شاعری ، موسیقی اور نغمات میں دل چسپی لینے لگے ۔ ہندی حلقوں میں عربی قول اور فارسی غزل کے ساتھ ہندی سرود شامل کر لیا جاتا ہے ۔ اس سلسلے میں شیخ احمد نہروانی کا نام قابل ذکر ہے ۔ یہ ذات کے جولائے اپنے ہم پیشہ و ہم مشرب شاہ کبیر سے دو صدی پیشتر گزرے ہیں ۔ ”اخبار الاخبار“ میں ان کو قاضی حمید الدین ناگوری کا مرید بتایا گیا ہے اور ”مغزن الاصفیاء“ میں ان کا سال وفات ۹۶۱ھ دیا ہے ۔ لیکن ان کے متعلق صحیح بیانات وہ ہیں جو شیخ نظام الدین اولیاء نے اپنے ملفوظات میں دیے ہیں ؛ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ احمد نہروانی بڑے خوش آواز تھے اور ”ہندوی“ کہنے کا ان کو بڑا شوق تھا ۔ ایک روز شیخ مادھو نے جن سے موصوف نے فیض پایا تھا ، شیخ احمد کو ہندوی سرود گاتے سنا ، کہنے لگے ”انسوس ہے کہ ایسی عمدہ آواز کو سرود ہندی میں ضائع کیا جاتا ہے ، کلام مجید کیوں نہیں سیکھتے ؟“ شیخ احمد نے تعمیل کی اور کلام مجید سیکھ لیا ۔ میں یہاں اصل عبارت نقل کر دیتا ہوں :

”چنی گویند کہ او نعمت از فقیر مادھو یافتہ بود و این فقیر مادھو امام مسجد جامع اجمیر بود ۔ روزی شیخ احمد نہروانی ہندوی می گفت ؛ در اوان جوانی آواز خوب داشت ، ہندویا خوش گفتے ۔ چون فقیر مادھو شنید گفت چنی آوازے کہ تو داری دویغ باشد کہ در سرود ہندی خرج کنی ۔ فقیر مادھو فرمود کہ قرآن یاد کن ۔“ شیخ احمد نہروانی قرآن یاد گرفت ۔“ (صفحہ ۱۸۷ ، فوائد الفواد ، مطبعہ المطابع ۱۲۷۲ھ)

اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں ہندی سرود گوئی اس عہد میں رائج تھی ۔ شیخ احمد نہروانی کا عزاز ہندویوں میں ہے اور وہ اس مجلس ساج میں شریک تھے ، جس میں خواجہ قطب الدین بنخیاو کاکے (متوفی ۹۳۳ھ) انتقال کرتے ہیں ۔

شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر (متوفی ۹۶۰ھ) ہندی میں شعر گوئی کرتے رہے ہیں ۔ ذہل کا دوہا شیخ بہاؤ الدین باجی (متوفی ۹۱۲ھ)

نے اپنی تصنیف میں ان کے نام پر دیا ہے :

مانیں سیوت کلی (گہل) گئی ماس نہ رہیا دیہ

تب لک ساٹیں سیوساں چب لک ہوسوں کمپہ

ادھر شیخ شرف الدین ہو علی قلندر کے حالات میں "مجمع الاولیاء" میں مذکور ہے کہ انہوں نے یہ دوہرہ شیخ نظام الدین اولیاء کے دوہرے کے جواب میں لکھا ہے :

ساہرے نہ مانیاں پیو کے نہیں تہاؤ

کتہ نہ بوجھی بات روی دھنی سپاگن ناؤ

اور مبارز خان کو یہ دوہا لکھا تھا :

سجن سکڑے جاٹیں گے اور نین سریں گے روے

بدھنا ایسی رین کر چور کدی نہ ہوے

ان کے معاصر شیخ نظام الدین اولیاء نے خود دوہرے کہے ہیں۔ ہندی موسیقی سے ان کو آفت تھی اور پوری سے تو گویا عشق تھا۔ کتاب چشتیہ (صفحہ ۷۶، ب) میں لکھا ہے : "سلطان الاولیاء، را پردہ پوری بغایت خوش آمدے ... می فرمودند کہ ما پر شدیم و پوری پر نشد۔"

ان ایام میں ایک خاص صنف سخن جس کا نام جگڑی (ذکری) تھا، بہت رائج تھی۔ اور ہمیشہ ہندی میں لکھی جاتی تھی۔ شیخ نظام الدین اولیاء، کو ایک مرتبہ جگڑی پر حال آیا تھا جس کے متعلق صاحب سیر الاولیاء لکھتے ہیں :

"نوال جگڑی از مولانا وجیہ الدین ہسونے مرقی می گفت و غالب

غلز من آہست کہ ایں جگڑی بود (بینا بن بہاجی ایسا سکھ میں باہوں)

حضرت سلطان المشائخ را این ہندوی اثر کرد۔" (صفحہ ۵۱۲)

خواجہ مسعود سعد سلمان اور امیر خسرو کے متعلق زور صاحب

کا خیال ہے کہ "وہ اس زبان میں شعر نہیں کہتے تھے جس کو عام

طور پر ہندو اور سلمان بولتے تھے" (صفحہ ۶) اور ہم سوچ رہے ہیں

کہ آخر یہ بزرگ جو زبان بولتے تھے ، اگر اس زبان میں شعر گوئی نہیں کرتے تھے تو پھر کون سی زبان میں کرتے تھے ؟ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک خسرو کے کلام کی زبان مشتبہ ہے ۔ اسی طرح خسرو کے مروجہ اشعار بھی ان کے نزدیک مشتبہ ہیں ؛ بلکہ غیر معتبر (صفحہ ۱۰) لیکن شکر ہے کہ ڈاکٹر زور اپنی اس رائے میں تنہا ہیں ۔ ابھی تک کسی نے امیر خسرو کے کلام کے متعلق شبہ نہیں کیا تھا ۔ میر تقی میر نے غالباً اسی موقع کے لیے لکھا تھا :

”اشعار وضحت آن بزرگ بسیار دارد دریں خود ترددے نیست ۔“
(صفحہ ۳ ، نکات الشعراء)

میر صاحب کو تردد نہیں ہے تو ہم نہیں سمجھتے کہ ڈاکٹر صاحب کو اس معاملے میں کیوں تردد ہے ۔ خود امیر خسرو دیباچہ غرۃ النکال میں لکھ رہے ہیں ”جزوے چند ہندوی نیز نثر دوستان کردہ شدہ است“ ہمارے خیال میں امیر کا ایسا کلام جو فارسی اور ہندی متصروحوں پر شامل ہے اور شہر آشوب سے تعلق رکھتا ہے ، ہر قسم کے اشتباہ سے پاک ہے ۔ مثلاً :

زگر ہمرے چو ماہ بارا کچھ گھڑے سنوارے ہکرا
نقد دل من گرفت و بشکست پھر کچھ نہ گھڑا نہ سنوارا
یہی قطعہ ”نکات الشعراء“ میں نیز ”غزل نکات“ میں دیا گیا ہے ۔
میر حسن نے امیر کی غزل کا یہ مطلع دیا ہے :

ز حال مسکین مکن تغافل دورے نینا بنائے پتیاں
چو تاب ہجران ندارم ایساں تلیہو گلے لگائے چھتیاں
(صفحہ ۹۲ ، تذکرہ میر حسن)

اسی غزل کے دو شعر شفیق اورنگ آبادی نے اپنے تذکرے میں صفحہ ۵۳۸ پر دیے ہیں ۔ یہ تذکرہ ۱۱۳۷ھ میں لکھا جاتا ہے ۔ اور یہی پوری غزل ایک ایسی ریاض میں موجود ہے جو ۹ سنہ جلوس

لہد شاہی میں لکھی جاتی ہے۔ بیاض کے مرتب کا نام برتاب سنگھ ہے جو موضع راہوں ضلع جالندھر پنجاب کا باشندہ ہے۔ اب جو چیز اب سے دو سو سال پیشتر قریب قریب ایک ہی وقت میں پنجاب، دہلی اور دکن جیسے مختلف مقامات میں امیر کی طرف منسوب کی جا رہی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ انتساب کسی نہ کسی ہائداو بنیاد پر قائم ہے^۲۔

عبدالواسع ہاندوی اپنے دستور العمل میں خسرو کا یہ شعر نقل کرتے ہیں:

از چل چل تو کل من زار شد کچل
من خود نمی چلم تو اگر می چل بچل

(صفحہ ۱۴، رسالہ عبدالواسع مسیح الزمان)

وجہ الدین وجہی خسرو کا ایک دوہرا اپنی تصنیف 'سب رس' مؤلفہ ۱۰۳۵ھ میں حسب ذیل نقل کرتے ہیں:

پنکھا ہو کر میں ڈولے ساتھ تیرے جاؤ
ڈولے بھکوں جنم گیا تیرے لہکھیں پاؤ

امیر خسرو پر کیا منحصر ہے، شاہی ہند میں اور بزرگ بھی ایسے ہوئے ہیں جو امیر کے نقش قدم پر چلے ہیں، مثلاً شیخ عبدالحق ردولوی متوفی ۸۳۷ھ اور شیخ بیارا متوفی ۸۹۵ھ جن کے بعض دوہرے شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی تصنیفات میں موجود ہیں۔ چان میں شیخ بیارا کے دوہروں پر فطاعت کرتا ہوں:

۱۔ ایک اور جگہ بیاض کے مرتب کا نام رام برتاب دیا گیا ہے۔ دیکھیے مضمون 'دسویں صدی ہجری کے بعض جدید دریافت شدہ رخنے' (مرتب)

۲۔ مزید تحقیق کے بعد حافظ صاحب کے نزدیک زیر بحث غزل کا امیر خسرو سے انتساب مشکوک ہو گیا تھا اور انہوں نے اس پر عروسی اعتبار سے سیر حاصل بحث کی تھی۔ ملاحظہ فرمائیے ان کا مضمون 'دسویں صدی ہجری کے بعض جدید دریافت شدہ رخنے' (مرتب)

پٹے ہوئے یہ جا توں دھک جیون تیرا
 سائیں نہیں توں کی پہرا دیکھہ کتب گھنیرا
 اپکو کام نہ آوسی جب بڑی ویرا
 چھوڑ پیارا سائیاں توں جانن کیرا

(رشد نامہ)

میں بالفعل اسی مختصر پر کفایت کرتا ہوں اور اس قدر اضافہ
 کرتا ہوں کہ وہ گجراتی ہوں یا دکنی، ہندی شعر گوئی کا چسکا
 شاہی ہندوستان ہی سے لے کر جاتے ہیں۔

گجرات کے دیہستان اردو کے ذکر میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے
 ”اس وقت گجرات کے اردو کارنامے بہت کم دست باب ہوتے ہیں
 اور وہاں اردو کی نشو و نما اور ترقی کی نسبت ہماری معلومات بھی
 دوسرے مرکزوں کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے“ (صفحہ ۱۱)۔ ان کا
 یہ بیان بے شک صحیح ہے لیکن دیکھا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں جو
 اطلاع ان کو ملی، ڈاکٹر صاحب نے اس سے بھی اعراض کیا ہے؛ مثلاً
 وہ لکھتے ہیں:

”رازم الحروف کو گجرات کی دو قدیم اور معتبر ناولوں (یعنی
 مرآت سکندری مؤلفہ سکندر منجہو ۱۶۱۰ء اور مرآت احمدی
 مؤلفہ علی محمد خان ۱۷۵۶ء) کے مخطوطوں میں چند ایسے اردو جملے
 اور فقرے ملے جو ۱۵۲۵ اور ۱۵۴۶ء میں استعمال ہوتے تھے۔ اس کا
 قوی امکان ہے کہ اگر کوئی زیادہ تفحص سے ان مخطوطوں کا مطالعہ
 کرے تو ایسے اور زیادہ فقرے دست باب ہوں گے“ (صفحہ ۱۱)

اور حاشیے لکھا ہیں ہے ”ملاحظہ ہو مرآت سکندری ورق ۱۵۲ الف،
 انشیا آفس فارسی مخطوطات“ اور ”۲۔ ایضاً مرآت احمد ورق ۶۶۸ ب،
 انشیا آفس فارسی مخطوطات۔“

کیا اچھا ہوتا اگر اس اطلاع کی بجائے ڈاکٹر صاحب وہ
 اردو فقرے نقل کر دیتے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے انہی

ناظرین کو اس اطلاع سے کیوں محروم رکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جو اطلاع ہندوستان میں اس مضمون پر میسر تھی اس کو بھی استعمال نہیں کیا۔

اردو زبان کے سلسلے میں امیر تیمور کا حملہ ۸۰۰ء میں نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے اول تو گجرات کا صوبے دار دہلی کی اطاعت سے آزاد ہو کر خود مختار حکومت کی بنیاد رکھتا ہے، دوسرے تیموری فوجوں کے خوف سے دہلی کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد گجرات میں جا کر آباد ہو جاتی ہے۔ ان پناہ گزینوں میں بعض مشاہیر بھی شامل ہیں؛ مثلاً شیخ احمد کھٹو، برہان الدین قطب عالم اور مولانا خواجگی۔ دہلی سے بڑی تعداد میں ہجرت ایک تاریخی واقعہ ہے؛ چنانچہ تاریخ گجرات میں مرقوم ہے :

”ہم ذریں اثنا خبر رسید کہ حضرت [صاحب] قران امیر تیمور کوہکن در نواحی دہلی نزول اجلال فرمودند و فتور عظیم در آن دیار راہ یافت و خلق کثیر ازاں حادثہ گریختہ بہ گجرات آمد۔ مقارن این حال سلطان ناصر الدین محمود شاہ از دہلی فرار نموده بہ گجرات رسید و از آنجا ماہوس شدہ بہ مالوہ رفت۔“
(صفحہ ۷۴، مرآت احمدی، جلد اول، بمبئی)

۸۰۳ء میں مولانا محمد بن قوام کڑٹی نے فرہنگ بحرالقضائل تالیف کی ہے؛ اس فرہنگ سے معلوم ہوتا ہے کہ گجرات میں ان ایام میں ہندی شاعری کا کافی چرچا تھا۔ مولانا نے اپنی فرہنگ کے آخری باب میں صرف ایسے الفاظ کا ذکر کیا ہے جو ہندی نظم میں مستعمل تھے۔ اس باب کا عنوان ہے :

”باب چہارم در بعض الفاظ ہندی کہ در نظم ہندی استعمال کنند“
(بحرالقضائل للہمی)

گجرات میں اردو شاعری کو رواج دینے والوں کے تاسوں سے ہم واقف محض ہیں مگر شیخ بہاؤ الدین باجن کی تصنیف سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عطاء اللہ العظیم بہ شیخ رتن خان شیخ نصر اللہ علوم موسیقی میں اپنے زمانے میں پگائے تھے اور ان کے سرود ان

اہام میں بہت مشہور تھے۔ ان کے زمانے کا اس امر سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ شیخ رکن الدین کلان شکر متوفی ۷۳۵ھ کے مرید تھے اور شیخ عزیز اللہ متوکل کے بڑے بھائی کے فرزند۔ شیخ باجن کہتے ہیں:

”وہ سر شیخ نصر اللہ ہند کی شیخ عطاء اللہ الملقب بہ شیخ رتن کہ ہند کی ایشان در علوم موسیقی و در جمیع علوم ہا دانش مند بودند سرود ہائے ایشان در عالم خدا ظہور مشہور و مقبول اند۔“

رتن، ہم خیال کرتے ہیں شیخ عطاء اللہ کا تخلص تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے ”گجرات کی اردو کے قدیم خطوطے جنوز محفوظ ہیں؛ اگرچہ بالکل ادبی رنگ کے نہیں مگر ان سے ثابت ہوتا ہے کہ گجرات میں یہ زبان اس قدر ترقی کر گئی تھی کہ اس کا مقصد استعمال یقیناً ادبی بھی ہوگا۔“ (صفحہ ۱۲)

اس موقع پر ہم خیال کرتے ہیں کہ ڈاکٹر زور نے گجرات اور اعلیٰ گجرات کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا ہے۔ گجرات میں دکن سے پہلے شاعری کا ذوق شروع ہوتا ہے؛ دکنیوں نے بیشتر گجراتیوں میں تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنی ایک جہش قلم سے یہ عزت ان سے یہ کہہ کر چھین لی ہے کہ ان کے کلوناسے بالکل ادبی رنگ کے نہیں ہیں۔ حالانکہ اسی صفحے پر ڈاکٹر کو اس امر کا بھی اعتراف ہے کہ گجرات کے بناء گزین ادیبوں نے ”دکن میں اردو ذوق بڑھانے میں بڑا حصہ لیا ہے۔“

(صفحہ ۱۲)

ہم ذرا بات کرتے ہیں کہ یہ بناء گزین جب دکن پہنچ کر دکنیوں میں ادبی ذوق کی روح بھونک سکتے ہیں تو کیا اپنے وطن میں بناء کر ایک تصنیف بھی ایسی پیدا نہیں کر سکتے جو ادبی ذوق کے معیار پر پوری اتر سکے۔

— میں ذیل میں بعض اشعار گجرات کے ایک صوفی شاعر شاہ علی بہادر جو کلام دہلی متوفی ۷۹۳ھ کی تصنیف جواہر اسرار اللہ سے نقل کرتا ہوں

جس سے نظریں خود فیصلہ کر لیں گے کہ آیا یہ اشعار ادبی ہائے کے
ہیں یا نہیں :

جس بھولوں سونگین چالوں	تس باس تمہارا ہانوں
کمر ہار نکپوں گل لاشوں	یہ کرنیں اور کللاں
ہور کلیاں جسے ات لالان	سب دیویاں تیریاں چالان
یہ جوہی ہیں سرمائی	ہور باس تمہارا لپائی
تو ہڑے میں لے باہی	ان ہار حیلوں سارے
سب کلیوں بھول پیارے	ہنس کرے موتوں سہکڑے
نچہ مائی جسے ہون ہاؤں	لے جیوڑے مانہ چہپاؤں
میں نینوں نانہ دکھاؤں	توں گہر گہر شہ ہو آوے
ہور الیل کلیوں راوے	جگ تیرا سہاگ کہنداوے

ساوہ اٹھے یوں ہمارے منجکوں یہیں کر پکر آس راؤں
کہیں سو نوشہ ہو کر آؤں کہیں سو آس آپ کہاؤں
پکڑی بانہ قبا لٹکائوں پھروں ہانس زربنہ سارا
سہرا ہار حیلان پھروں دل ہادل ہوؤں اسورا
دھول دھامیں اونٹوں پر سات سید سب باجت جاویں
سب جگ کیمری خوشبوؤں لوک سو بہر بہر لیاویں

چھوڑو نو کاچہ لڑائی کان کرو بہ برم کہانیں
مہوں تمہاری شیریں بہاوے منجکوں میری لیلی سہانیں
جسے تم لیلی جو یا لوڑو منجہ بختوں کی نینوں دیکھو
مہوں تمہاری شیریں جوڑو لیلی کون کہوں دیکھو

اس بستی کا کیا ہشمارا آج مہوں کل دوجوں مارا
سو کیوں تسکوں دھرے پیارا
یہ جگ بانڈی اس جگ کیمری جہاں نہ بکڑے کہیل سویرے
جانوں بات سہی کمر میری

سورخ گجرات میرزا محمد حسن شاہ علی جیو کے دیوان کے متعلق
یہ رائے دیتے ہیں :

”دیوانے دارد بہ زبان ہندوی در روش و معنی برابر دیوان مغربی
است۔“ (مستحقہ ۱، ۲، مرآت احمدی)

گجرات کے مصنفین میں زور صاحب نے تین شخصوں کا
ذکر کیا ہے :

۱۔ بہاء الدین باجن ۲۔ شاہ علی محمد جیو کام دھنی

۳۔ شیخ خوب محمد چشتی

باجن کے کلام کو ڈاکٹر صاحب اردو تسلیم نہیں کرتے بلکہ
’بھاشا‘ بتاتے ہیں ، حالانکہ باجن اپنے کلام کو صریحاً کبھی ہندوی
(اردو) اور کبھی زبان دھلوی کہہ رہے ہیں ۔ مثلاً کہتے ہیں :

”و ایں مناجات بہ زبان ہندوی گفتہ شدہ است“

نرے ہتھہ کوئی چل نہ سکھے	جو چلے سو چل چل نہکے
بڑا ہشت ہوتی دھوپاں	سب جانہ بندہ کھوپاں
سبہ جوگیوں جوگ ہمارے	سبہ تہیتی تپ ہکارے
ایک درستی درس ہسولی	سرنانگے ہانسو کھل
ایک سوڑی ہوی سو کر نہ	ہوی برتیتی کیا دو کہہ دھرنہ
ایک درویش ہوی گر آئے	ہوی قلندر روپ ہمارے
ایک ابدال ہوی اب دھوتی	ایک ہاندہ ہا ہا ہوتی
ایک کھلی ہوتی دوانی	ایک ہادل ہند رانی
ایک رانی ماتی ہوی ارواوندہ	بھی بے مندہ ہو ہو جاوندہ
ایک اہلسی راتندہ جاگن	ہوی ہیکاری تہبہ مانگندہ
ہوں ٹولی ٹولی ہوی کرے	سبہ رل رل کھل کھل کھوی
دے مکت منے ایوے دیکھے	آرے باجن توں کس لیکھے

دلیا کی مذمت میں باجن نے کچھ آیات لکھے ہیں۔ اس موقع پر کہتے ہیں :

”صفت دنیا بزبان دھلوی گفتہ است“

دوہرہ

یہ فنی کیا کہے یہ ملتی ہے جب ملتی ہے تب چھلتی ہے
[پہلے اول] اول آن چھل بہت چھلاے

آن چھوہری پتی کھائے آن رو کسر بہت رولائے
یہ فنی کیا کہے یہ ملتی ہے جب ملتی ہے تب چھلتی ہے
[پہلے دوم]

آن بہت گھیرے ہارے جسے اس ہلکے دے اندہ چہارے
جے رہے اس تھے تارے دے نیانے اس تھے ہارے
جے اس کل نہ تہہ ترسہ جے چکے ملے تو اس سنہ بسہ
یہ فنی انہوں تہاوی چکے ہاس انہوں نہ آوی
جے اس کدھی نہ لوڑی جے چکے ملے تو بھی چھوڑی
جے دیکھ اس تھے ہارے یہ نیلج اندہ سنہ لاگے
[تخلص]

دیکھ باجن یہ تو جھوٹ مکہ میٹھی چٹ میٹھی
یہ اے ایسی ڈیہٹی یہ کیا کہے یہ ملتی ہے
(الخ)

اسی طرح ایک اور موقع پر باجن فرماتے ہیں :

”مناقب حضرت ایشاں وزبان دھلی لہستہ است“

ان امور سے صاف ظاہر ہے کہ باجن کے نزدیک ہندوی یعنی اردو اور دھلوی ایک ہی چیز ہے۔ بہر حال اس زبان کو بھاشا نہیں کہا جاسکتا، وہ اردو ہے۔ البتہ اس پر گجراتی زبان کا اثر غالب ہے۔

شیخ باجن کا ذکر 'ہنجاہ میں اردو' میں بھی شامل ہے اور مختصر نمونہ کلام بھی درج ہے ، لیکن ڈاکٹر عی الدین اس کے متعلق لکھتے ہیں : "ہنجاہ میں اردو" میں ان کے کلام کے جو نمونے دیے گئے ہیں وہ نہ تو ادبی لحاظ سے قابل قدر ہیں اور نہ ہی معتبر و موثق۔ باجن ایک زاہد سرائی شخص تھے اور غالباً انہوں نے کوئی ادبی کارنامہ اپنی یادگار نہیں چھوڑا۔" (صفحہ ۱۳ - اردو شہ ہارسے)

ڈاکٹر صاحب کا یہ انداز تنقید قابل اعتراض ہے ۔ اگر وہ نمونے جو 'ہنجاہ میں اردو' میں دیے گئے ہیں ، ان کے نزدیک غیر معتبر ہیں تو انہیں چاہیے تھا کہ شیخ باجن کے کلام کے معتبر نمونوں سے اپنے ناظرین کو مستفید کرتے۔ لطف یہ ہے کہ انہوں نے خود کوئی نمونہ نہیں دیا ہے اور اس نمونہ کلام کو جو 'ہنجاہ میں اردو' میں دیا گیا ہے ، رد کر دیا ہے ۔ شیخ باجن قرن نہم ہجری کے دوسرے منتصف سے تعلق رکھتے ہیں اور ۹۱۲ھ میں وفات پاتے ہیں ۔ اب اس عہد کے شخص سے ادبی کارناموں کی توقع کرنا خیال بحال ہے ۔ اردو زبان کی اس عہد میں یہ حالت نہیں تھی کہ داغ و اسیر کی سیوہ ، بیانی کی چشم داشت کی جائے ۔ باجن اور اس کے ہم وطن دوسرے بزرگوں کی اہمیت صرف تاریخی دل چسپی کی بنا پر ہے اور اسی ذوق نے دبستان دکن کو ہماری نگاہ میں محبوب کر دیا ہے ورنہ آج کون ہے جو ولی کی غزلوں ، نصیر کی مثنویوں اور ہاشم علی کے سرائیوں کو بڑھ کر سو دھتے لگے ۔ قصہ مختصر ان بزرگوں میں ہماری دل چسپی تاریخی اور لسانی ہے نہ ذوق اور وجدانی ، اور ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ گجراتیوں کے ساتھ سید صاحب کا ساوک نہایت نا منصفانہ ہے ۔

شاہ علی محمد گام دہنی اور شیخ خوب محمد سے اقدم ایک اور بزرگ قاضی محمود دریائی ہیں جن کی وفات ۹۱۶ھ میں ہوئی ہے ۔ ان کی جگرہاں نہایت مشہور ہیں اور اسی سلسلے میں قاضی صاحب کو اس قدر شہرت حاصل ہے کہ گجرات کے علاوہ ہندوستان کے دیگر صوبوں میں بھی مقبول و معروف ہیں ۔ صاحب اخبار الاخبار کہتے ہیں :

”چکری طے وے کہ بزبان ہندی دارد دستور قوالان آن دیار است
ہفایت مطبوع و موثر و بے تکلف و آثار عشق و وجد از سخنان وے
لاج است۔“ (صفحہ ۱۸۷ ، اخبار الاخبار ، ۱۲۷۰ھ احمدی)

مخدوم بہاء الدین ثانی برناوی اپنی کتاب چشتیہ تالیف ۱۰۶۶ھ میں
لکھتے ہیں :

”کلام مقبول او مثال چکری لاشی محمود ہر کہ می شود پر ہمت او
آفرین می شود۔“ (ورق ۳۶ ب)

اور صاحب مرآت احمدی کا بیان ہے :

”از تجلیات عشق پیوستہ بحسب حال عاشقانہ ہندی بطرز دلہندی
می است۔“ (صفحہ ۸۰ جلد سوم)

خزینۃ الأصلہا میں مرقوم ہے :

”اشعار عاشقانہ بزبان ہندی فرمودے کہ قوالان آن دیار بوقت سماع
اشعار آن جناب بہ مجلس اصفا میخوانند و ہفایت موثر میباشند۔“
(صفحہ ۸۰ ، جلد دوم)

گجراتیوں نے اپنی اردو کا نام ہندی کے علاوہ گوجری یا گجری
رکھا ہے۔ یہ اصطلاح غالباً اس زبان کو گجراتی زبان سے مجز کرنے
کے لیے مصنوع ہوئی ہے۔ جواہر اسرار اللہ کے دیباچے میں جو ۹۷۳ھ سے
قبل کی تحریر ہے ، یہ اصطلاح موجود ہے اور ۱۱۰۹ھ میں بھی جب
امین نے اپنی ’یوسف زلیخا‘ نظم کی ہے ، استعمال ہو رہی ہے۔ دکنی
اپنی زبان کو ابتدا میں ہندی کہتے رہے اور دسویں صدی ہجری کے
پہلے متعصب میں ہندوستانی یا زبان ہندوستان کہنے لگے۔ مثلاً
ابوالقاسم فرشتہ :

”و بدوئے فارسی را خوب میگفت کہ تا بہندوستانی متکلم نمی شد
ہیچ کس نمیتوانست فہمید کہ غیر از فارسی بزبان دیگر آشنائی دارد۔“
(تاریخ فرشتہ ، جلد دوم ، صفحہ ۸۰ ، لولکشور)

اور ’سب رس‘ میں مولانا وجہ الدین رقم طراز ہیں :

”آغاز داستان زبان ہندوستان“

لیکن جہانگیر کے بعد شاعریوں کے عہد میں جب دکنیوں اور ہندوستانیوں میں متواتر جنگیں ہوتی رہیں تو دکنی اور ہندوستانی کی تقریبی نے قدرتا دکنیوں کو اپنی زبان کے لیے ایک نیا لفظ یعنی ’دکنی‘ سچھا دیا ۔ چنانچہ شیخ نصر علی اپنی زبان کو ’دکنی‘ لکھ رہا ہے ۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر علی الدین صاحب نے ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے جس کو میں انہیں کے الفاظ میں لکھتا ہوں :

”اس عہد کی تواریخ دکن سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ گجرات سے بہت سے ادیب اور عالم بیجاپور آیا کرتے تھے ۔ وہاں کی سلطنت کے زوال پر ابراہیم عادل شاہ نے وہاں کے تمام ادیبوں کو اپنے دربار میں بلا لیا ۔ چنانچہ گجرات کے ان ہنر گزینوں نے دکن میں اردو کا ادبی ذوق بڑھانے میں بڑا حصہ لیا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ بیجاپور کے بعض اردو مصنفین جیسے شاہ برہان ، اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ گجرات کے اثر سے دکن کی ادبی زبان بڑی حد تک بدل گئی ہو اور جو لوگ اس متبدلہ زبان میں لکھ رہے ہوں وہ اپنی زبان کو گجری کہتے تھے اور برائی زبان دکنی کہلاتے تھے ۔“ (صفحہ ۱۲)

دکن پر گجرات کا لسانی اثر ہم تسلیم کرتے ہیں ، لیکن اس خیال کے ساتھ کہ گجرات کے اثر سے جب دکنی زبان میں تغیر رونما ہوا تو اسی تغیر یافتہ زبان کا نام گجری رکھ دیا گیا ، ہم متفق نہیں ۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ جو لوگ اپنی زبان کو گجری کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ یا تو گجراتی ہیں یا گجرات سے آکر دکن میں آباد ہو گئے ہیں ۔ اگر شاہ برہان الدین جام اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ وہ اصل میں گجراتی تھے ؛ یہ دوسری بات ہے کہ وہ یا ان کے والد بیجاپور میں آکر مقیم ہو گئے ہوں ۔

اب ہم ان گجراتی بٹاء گزہنوں کے قصے کو لیتے ہیں جس میں سید صاحب نے ابراہیم عادل شاہ کے ذکر میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے ۔

” ان دنوں گجرات ایک ایسا مقام تھا جہاں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے اچھی طرح ملتے جلتے رہتے تھے اور فی الحقیقت یہی وجہ اردو زبان کے ارتقا کا باعث ہوئی ۔ نیز گجرات میں مسلمان بادشاہوں کی طویل اور اطمینان کی حکومت نے مصنفین کو تالیف و تصنیف کا کافی موقع دیا ۔ چنانچہ اس زمانے میں خاصی ادبی پیداوار ہوئی جس کے چند نمونے یورپ کے بعض کتب خانوں میں دست باب ہوئے ہیں ۔ لیکن اکبر کی فرستادہ مغل فوجوں کے حملوں نے گجرات میں اردو کی اس دن دلی اور رات چوکنی ترقی میں روڑے اٹکائے اور اس پر ہی کیا منحصر ہے ان حملوں نے تو سلطنت ہی کے شیرازے کو درہم برہم کر دیا ۔ جب گجرات سے امن و امان و غصت ہو گیا اور شاہی دربار کا بھی خامخہ ہو گیا تو شاعر اور ادیب بے سرو سامانی کی حالت میں ادھر ادھر مارے مارے پھرنے لگے ۔ ان میں سے جو اپنے وطن میں ٹھہرے ہوئے تھے ان کو مغلوں نے کئی طرح کی تکالیف پہنچائیں اور ان بے چاروں کو ”تھر درویش برجان نرویش“ کے مصداق طرح طرح کی مصیبتوں کا شکار ہونا پڑا ۔ ایسے نازک موقع پر ابراہیم نے نہایت عقل مندی اور لیاظی کا کام کیا ؟ اس نے اپنے آدمیوں کو بیش بہا تحائف اور سوغات دے کر گجرات روانہ کیا تاکہ وہاں کے علما اور شعرا کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دیں ۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد ہم گجرات کی عظمت کے پرچم کو بیجا پور پر لہراتا ہوا دیکھتے ہیں ۔ مشہور و معروف ہستیوں کے علاوہ اکثر عام لوگ بھی بیجا پور ہٹاگ آئے تھے اور ان گجراتیوں کا اس قدر اثر ہو گیا تھا کہ بعض دکھائی مصنف بھی اپنی گجراتی آمیز زبان کو گجری کے نام سے موسوم کرتے لگے ۔“

اس بیان سے ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ سمجھ لیں کہ اکبر کی ہمہ گجرات در حقیقت اردو کے خلاف جہاد تھا ، جس کی بنا پر اردو

شاعروں اور ادیبوں کو طرح طرح کی تکالیف پہنچائی گئیں اور اس کی فوجیں اردو کی ترقی میں روڑے لگاتی رہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس اہم بیان کے لیے کوئی قاری حوالہ نہیں دیا ہے؛ یہ حالت موجودہ ہم اس کتابا بیان پر مہر تصدیق لگانے سے انکار کرتے ہیں۔ گجراتی سلاطین کی طویل اور طمانیت کی حکومت کے زمانے میں جو ادبی کارنامے گجرات نے پیدا کیے اور جس کے چند نمونے ڈاکٹر صاحب نے یورپ کے کتب خانوں میں ملاحظہ کیے ہیں، ہم کو ان کے متعلق کوئی علم نہیں اور نہ ڈاکٹر ہی نے ان کی کوئی تفصیل دی ہے اس لیے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن تاریخ گجرات کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین گجرات کے آخری دو جانشینوں کے عہد میں گجرات کی حالت نہایت اہتر رہی ہے۔ یہ زمانہ ۱۶۶۱ء سے شروع ہوتا ہے اور ۱۸۰۰ء پر ختم ہوتا ہے، جب اکبر نے گجرات پر قبضہ کیا ہے۔ یہ دور گجرات کی تاریخ میں دور آشوب کے نام سے یاد کیا جاسکتا ہے۔ بادشاہ طاف و اسرا کے تسلط میں حوالاتی تبدی کی حیثیت رکھتا تھا اور اسرا ایک دوسرے کی حالت توڑنے اور اپنا اقتدار چلانے میں مصروف تھے۔ قتل و خون ریزی، نساد اور ہنگامے چار سو برپا تھے۔ ۱۸۰۰ء میں اکبر وہاں کے اسرا کی خواہش پر بغیر کسی جنگ و خون کے گجرات پر قابض ہوتا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اسی زمانہ آشوب میں گجرات کے بعض نامی شاعر گزرے ہیں، یعنی شاہ علی جیوگم دہنی اور شیخ خوب ہد۔ موخر الذکر اپنی مشنوی 'خوب ترنگ' ۱۸۹۹ء میں یعنی اکبر کے قبضہ گجرات کے چھ سال بعد لکھتے ہیں۔ ان کی دوسری تصنیف 'چھند چھندان' جو ہندی اور فارسی عروض اور نال ادھیا پر مشتمل ہے، عن قریب اسی عہد میں لکھی جاتی ہے۔ لیکن سید صاحب ہم کو گجراتی ادیب و شاعر کی مثالوں کے ہاتھ سے ستم کشی کی بے بنیاد کہانی سنا رہے ہیں۔ یہاں ہم سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر کا قلم قاری میدان سے گریز کر کے المسافہ نگاری کی حدود میں داخل ہو گیا ہے۔ وہ ان مفلوم ادیب و شعرا میں سے کسی ایک کا بھی نام نقل نہیں

کرتے۔ اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ اس نازک موقع پر ابراہیم عادل شاہ نے بڑا کام کیا۔ وہ پیش ہا تحائف دے کر آدمی گجرات بھیجتا ہے اور وہاں کے اذیبوں کو دکن میں آنے کی دعوت دیتا ہے؛ یہ دعوت منظور کر لی جاتی ہے اور گجراتی اذیبوں کا قافلہ بیجاپور پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ بیجاپور کی باندیوں پر گجرات کی عظمت علمی کا پرچم لہرانے لگتا ہے۔ ان نازکین وطن میں بعض مشہور و معروف ہستیاں تھیں۔ کاش ان مشاہیر میں سے ڈاکٹر صاحب بعض کے اساء تو درج کر دیتے۔ لیکن ایک امر جو ہم کو اس قصے پر ایمان لانے سے روکتا ہے، یہ ہے کہ اکبر گجرات پر ۹۸۰ھ میں قابض ہوتا ہے اور ابراہیم عادل شاہ، اس اذیبی دعوت کا محرک ۹۸۸ھ میں تخت نشین ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی عمر نو سال کی تھی؛ آئندہ دس سال تک اس کو امور سلطنت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ۹۹۸ھ میں البتہ وہ مطلق العنان ہوتا ہے۔ اب ابراہیم کی طرف سے ۹۸۰ھ میں گجراتیوں کو دعوت ناممکن ہے۔

یہاں ایک اور امر کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کی جاتی ہے؛ سید محی الدین صاحب نے اپنے حوالوں کو جب کہ وہ مغربی مخطوطات سے تعلق رکھتے ہیں، بیان کر دیا ہے، لیکن جب انہوں نے اپنے پیش روؤں کی تصنیفات اور تحقیقات سے استفادہ کیا ہے تو اس کا عیراحتاً کہیں تذکرہ نہیں کیا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ شعرا کے حالات کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب ان کی ذاتی تحقیق و تلاش اور اصل مآخذ کے مطالعے کا نتیجہ ہے، لیکن اردو شہ ہارے میں اس بیان کے خلاف کافی سے زیادہ شہادت موجود ہے۔ میں بعض مثالیں درج کرتا ہوں۔

مولوی عبدالحق نے جولائی ۱۹۲۹ کے رسالہ اردو میں نطب شاہی دور کے ایک شاعر حسن شوق پر ایک مضمون لکھا ہے جو صفحہ ۵۴ تا ۵۹ پر شامل ہے؛ ڈاکٹر صاحب نے اس کا خلاصہ لے کر اپنی تصنیف میں صفحہ ۱۰۲ پر شامل کر لیا اور اصل مآخذ کا کہیں پتا نہیں دیا۔ البتہ آخر میں اس قدر اضافہ کر دیا ہے ”اس کے کلام کے غناملے الجمن ترقی اردو میں بھی محفوظ ہیں۔“

ڈاکٹر نے عادل شاہی عہد کے ایک شاعر مومن کے متعلق بیان کیا ہے :

”مومن (۱۰۹۲ھ) سینا پٹن کا باشندہ تھا جو عادل شاہی سلطنت میں چھوٹا سا گاؤں تھا۔ شاید یہ بیجاپور نہیں آیا۔ اسلام کے مہدوی فرقے سے اس کا تعلق تھا اور اس نے اس فرقے کے بانی حضرت سید محمد جونپوری کی حیات اور تعلیمات پر ایک نظم لکھی ہے۔ ۱۶۸۲ء میں ختم ہوئی۔ اس کا نام اسرار عشق رکھا گیا۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے۔“ (صفحہ ۷۵)

لیکن ان کے پیش رو حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری اردو کے قدیم میں تحریر کرتے ہیں :

”مومن - ان کا نام عبدالمومن ہے۔ جینا پٹن کے باشندے تھے۔ یہ شہر علاقہ میسور میں واقع ہے جو عالم گیر کی فتوحات سے پہلے عادل شاہی عدل داری میں شامل تھا۔ مومن مہدوی مذہب کے بابت تھے۔ انہوں نے اسرار عشق کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے اور اس میں اپنے ہادی و پیشوا حضرت سید محمد صاحب جونپوری کے حالات و کرامات تحریر کیے ہیں۔ یہ کتاب نظم میں ہے اور ۱۰۹۳ء میں تمام ہوئی۔ اس کا نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔“ (صفحہ ۷۹)

ذیل میں ایک اور مثال عرض ہے۔ قاضی محمود بھری کے متعلق حکیم شمس اللہ قادری نے اس طرح لکھا ہے :

”بھری دکن کے ایک صوبی منشی بزرگ تھے۔ ان کا نام قاضی محمود ہے۔ والد کا نام میر الدین تھا اور وہ ’قاضی دریا‘ کے لقب سے مشہور تھے۔ نصیب گدوگی جو نصرت آباد کے مضافات میں واقع ہے، ان کا وطن تھا۔ ۱۰۹۵ء کے قریب اپنے وطن سے بیجاپور چلے گئے اور وہاں سکندر عادل شاہ ان کا معتقد ہو گیا۔ اس کے دربار میں سال دو سال مقیم رہے اور جب بیجاپور کی سلطنت ۱۰۹۷ء میں تباہ ہو گئی تو وہاں سے حیدرآباد چلے آئے۔۔۔ قاضی صاحب نے

تصوف میں ایک مثنوی لکھی ہے جس کا نام 'من لکن' ہے۔ یہ مثنوی اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں اس کی وفات سے سات سال پہلے ۱۱۱۲ھ میں تمام ہوئی۔ چنانچہ خاکسے میں اس کی تاریخ کا اس طرح ذکر آیا ہے :

ہجری تھے بھی کتک برس تھے بارہ اوپر ایک سو سہس تھے
بعض مریدوں کی فرمائش سے قاضی صاحب نے 'من لکن' کے مضامین فارسی میں لکھے اور اس کا نام 'عروس عرقان' رکھا۔ یہ کتاب ۱۱۱۶ھ میں تمام ہوئی۔ (صفحہ ۸۶، ۸۷ اردو سے قدیم تاج بحیر) اذہر علی الدین صاحب فرماتے ہیں :

"بھری - اس کا نام، قاضی محمود تھا۔ بحرالدین کا بیٹا تھا جو گوگی کے 'قاضی دریا' کے نام سے مشہور تھے۔ گوگی سلطنت بیجا پور میں نصرت آباد کے قریب ایک گاؤں ہے۔ یہ وہاں کا قاضی اور ایک بڑے ہائے کا صوفی تھا۔ ۱۰۹۵ھ میں اپنے وطن کو غیر آباد (کڈا) کہہ کر بیجا پور پہنچا؛ سکندر عادل شاہ اس کا معتقد ہو گیا اور اسے اپنے دربار میں ایک جگہ بھی عطا کی۔

۱۰۹۷ھ میں جب سلطنت فتح ہو گئی اور اورنگ زیب نے سکندر کو قید کر لیا تو ہجری نے حیدرآباد کا راستہ لیا۔ . . . اور اورنگ زیب کی وفات سے سات سال قبل یعنی ۱۱۱۱ھ میں اس نے ایک صوفیانہ مثنوی بعنوان 'من لکن' پیش کی۔ اس کے کچھ سال بعد یعنی ۱۱۱۵ھ میں اپنے مریدوں کی خواہش اور اصرار پر اس نے اس نظم کو فارسی زبان میں 'عروس عرقان' کے نام سے منتقل کیا۔" (صفحہ ۱۳۹ - اردو شد ہارے)

میں نے کچھ حصہ یہ خوبی طوالت ان بیانات سے حذف کر دیا ہے جو دونوں میں مشترک تھا۔ ان بیانات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اصل ہے اور ایک نقل مگر ظلم یہ ہے کہ ڈاکٹر نے کہیں بھول کر بھی اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ صاحب اردو سے قدیم اپنے حوالے دینے میں نہایت محتاط ہیں، ڈاکٹر صاحب نقل کرنے

میں نہایت بے پروا واقع ہوئے ہیں ، جس کے آثار اس تالیف میں بہ کثرت ملتے ہیں ۔ مثلاً اسی بھری کے ذکر میں انہوں نے 'من لکن' کی تاریخ تصنیف ۱۱۱۱ھ دی ہے ۔ حکیم صاحب نے اصل شعر بھی نقل کر دیا ہے جس کی رو سے سال تالیف ۱۱۱۲ھ ہے ۔ حکیم صاحب نے بھری کی فارسی تالیف کا نام 'عروس عرفان' اور تاریخ ۱۱۱۶ھ دی ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے کتاب کا نام 'عروسی عرفان' اور سال تالیف ۱۱۱۵ھ دیا ہے ۔

دوسرے لوگوں کی محنت اور کاوش دماغی سے فائدہ اٹھانا اور شکریہ درکنار استفادے کے اظہار تک، سے گریز کرنا ایک عجیب طریقہ ہے جو نہ مغربی کہا جا سکتا ہے اور نہ مشرق ۔ شہ ہارے ، کا مصنف سب سے زیادہ مولوی عبدالحق کے مضامین سے خوشہ چینی کر رہا ہے اور اس کے بعد 'اردو قدیم' سے لیکن اس نے اپنی زلہ ربانی کا انوار قسم کھانے کو بھی نہیں کیا ؛ البتہ اس نے اپنے پیش روؤں کی لغزش اور لرو گناہات کا ذکر ضرور کیا ہے ۔ مثلاً جنیدی کے ذکر میں اس کو شاہ عبداللہ کی سوانح عمری سے معلوم ہوا کہ اس عہد میں ایک شخص علی اکبر جنیدی موجود تھا ؛ ادھر 'اردو قدیم' میں جنیدی مصنف 'ماء پیکر' کا نام احمد بتایا گیا تھا ؛ ہمارے ڈاکٹر نے فیصلہ دے دیا کہ شاعر کا نام علی اکبر تھا ۔

اس طرح حکیم شمس اللہ نے ولی دکنی سید محمد فیاض کی ایک مناجات کے متعلق کہا تھا کہ وہ بھی ولی کی ہے اور 'اردو قدیم' میں اس کے تین بند بھی نقل کر دیے تھے (صفحہ ۶۱) لیکن ہمارے محتاط ڈاکٹر نے جب دیکھا کہ حکیم صاحب نے اس کا حوالہ نہیں دیا ہے ، اس کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور یہ حکم لکھا :

"اردو قدیم کے مصنف نے اس کا حوالہ دیا ہے لیکن اپنے بیان کے ثبوت میں کوئی سند نہیں پیش کی ، اس لیے شبہ ہے کہ آیا وہ ہے بھی یا نہیں ، اور اگر ہے تو ولی کی ہے یا کسی اور شاعر کی ۔"

یہ استدلال بالکل نا واجب ہے۔ جب حکیم صاحب اس مناجات کے اشعار نقل کر رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ چیز ان کے بیش نظر ہے۔ اس صورت میں یہ کہنا کہ اس کے متعلق شبہ ہے کہ آیا وہ مناجات موجود ہے یا نہیں، یا یہ کہ اگر ہے تو ولی کی ہے یا کسی اور شاعر کی بالکل فضول ہے۔

شعرا کے کلام کا انتخاب جو دیا گیا ہے ڈاکٹر کی خوش مذاق کا ایک بین ثبوت ہے۔ بعض نمونے البتہ ایسے ہیں جو طبیعت پر گراں گزرتے ہیں۔ لیکن اس معاملے میں انتخاب کنندہ ایک بڑی حد تک اپنے محدود ذرائع کی بنا پر بھیور ہے۔ وجہی کی مشنوی 'نقطہ مشنوی' سے جو نمونے دیے ہیں ہمیں بے حد ہستد آئے مگر رستمی کے 'خاور نامہ' کے اقتباس زیادہ کام یاب نہیں معلوم ہوئے، اگرچہ ڈاکٹر اس کی شاعری کے زیادہ مداح ہیں۔ مشرق نے 'لہ درین' میں جو دعوت کا نقشہ کھینچا ہے اودو کے مورخ اور ٹرہنگ نگار کے لیے بے حد دل چسپی کا سامان رکھتا ہے۔

انڈیا یونیورسٹی کی بیاض سرائی سے جن شعرا کے انتخابات درج ہیں، سید صاحب نے ان کا زمانہ ۱۱۵۰ھ فرض کر لیا ہے۔ مگر ایسے حال میں جب کہ بیاض میں تاریخ کتابت درج نہیں ہے۔ ان تمام شعرا کے متعلق جو ایک درجن سے زیادہ ہیں یہ تسلیم کر لینا کہ سب اسی زمانے میں گزرے ہیں نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ نمونہ کلام پر نظر ڈالنے سے خیال گزرتا ہے کہ ان میں سے کئی بعد کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ہم کو کوئی تعجب نہیں ہوگا اگر کلام، اساسی، نظر وغیرہ جیسا کہ ان کی زبان سے ہوتا ہے بارہویں صدی کے اختتام سے علائقہ رکھتے ہوں۔

”ہندوستانی“

ہندوستانی اکیڈمی کا سہ ماہی رسالہ

(از اورینٹل کالج بیگزین ہاٹ منی ۱۹۳۱)

مقام مسرت ہے کہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے اپنا سہ ماہی رسالہ ”ہندوستانی“ جنوری ۱۹۳۱ء سے جاری کر دیا ہے۔ ہمارے سامنے اس کا پہلا نمبر ہے جو مضامین، ٹائپ اور چھپائی و کالغذ کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ اور دیدہ زیب ہے۔ اس کے قائل ایڈیٹر شاعر مشہور جناب اصغر حسین صاحب اصغر گوندوی ہیں جو دو تین سال پیشتر لاہور میں تشریف فرما تھے اور اردو مراکز کی ادارت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ہم یہ معلوم کر کے خوش ہیں کہ اصغر صاحب اکیڈمی کے حلقہ لگ گئے۔

ہندوستانی کے اس نمبر میں اکثر مضمون نگار ایسے ہیں جو خوش قسمتی سے ہمارے ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں ممتاز عہدے رکھتے ہیں جس سے رسالے کے مضامین کی بلند پائیگی یقینی ہے۔ پہلا مضمون ’اردو اسلا‘ پروفیسر ڈاکٹر عبدالستار مدنی، صدر شعبہ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی کے زور قلم کا نتیجہ ہے اور نہایت خوب لکھا گیا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اس مضمون کو برابر جاری رکھیں گے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ تاریخ کے پروفیسر محمد حبیب ترون وسطیٰ میں ہندو مسلم تعلقات پر رقم طراز ہیں۔ پروفیسر صاحب بڑے زیر دست نظریہ باز ہیں اور بعض اوقات تو

اپنے نظریوں کی خاطر صریح واقعات تاریخ سے بھی چشم پوشی کر جاتے ہیں۔
 تیسرا مضمون مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب
 صدر شعبہ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی کا اردو لغات پر ہے۔ مولوی
 سید مقبول احمد صاحب صدیقی نے 'تذکرہ خسرو' پر ایک لکڑا دیا ہے۔
 خواجہ غلام الثقلین صدر شعبہ تعلیم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے
 'قومی سیرت کی تشکیل' پر ایک فاضلانہ مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ رسالے
 کے تمام مضامین عالمانہ ہیں اور ان سے بہت کچھ استفادہ کیا جا سکتا
 ہے۔ ہم اکیڈمی کے ارباب حل و عقد کو عذبتہ مبارک باد پیش کرتے
 ہیں کہ ان کی مساعی سے ایک ایسے علمی رسالے کا اجرا ہوا ہے جس
 سے اردو زبان و ادب کے سرمائے میں قابل قدر اضافے کی بجا طور پر
 امید کی جا سکتی ہے۔

جہاں ہم سید مسعود حسن صاحب کے مضمون 'اردو لغات' پر
 کچھ الفاظ کہنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کا ایک مضمون سید صاحب نے
 کچھ سال ہوئے رسالہ 'خیابان' لکھنؤ میں شائع کیا تھا؛ موجودہ
 مضمون میں کسی قدر ترمیم اور اضافہ نظر آتا ہے۔

ہمیں 'خالق باری' کے معاملے میں سید صاحب سے بالکل اختلاف ہے۔
 موصوف کا خیال ہے کہ خالق باری ہندی زبان سے نا آشنا ایرانیوں اور
 توراتیوں کے لیے جو چنگیزیوں سے بھاگ بھاگ کر ہندوستان میں
 پناہ گزین ہو رہے تھے لکھی گئی تھی۔ 'خالق باری' کی یہ وجہ تالیف
 ہمارے لیے استعجاب انگیز ضرور ہے، 'جواہر خسروی' میں مولوی محمد امین
 صاحب چڑیا کوٹ نے بھی اسی قسم کی رائے زنی کی ہے مگر رائے کے معبر
 ہونے میں ہم کو بہت کچھ شبہ ہے، کیونکہ اول تو چنگیزیوں کا
 طوفان امیر خسرو کے عہد سے پیشتر ہی برسرِ برسا کر کھل چکا تھا
 اور امیر کے زمانے میں مطلع بڑی حد تک صاف ہو چکا تھا۔ دوسرے
 خالق باری کی زبان کسی ایسے قیاس کی مویہ نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہ
 کتاب ان کو وادوں کے لیے لکھی جاتی تو ضرور تھا کہ اس کی تعلیمی یا
 تشریحی زبان التزاماً فارسی ہوتی، جس زبان سے یہ لوگ بالعموم واقف

تھے ، مگر دیکھا جاتا ہے کہ خالق باری میں ایسا التزام مفقود ہے ۔
اس میں دونوں زبانیں ملتی ہیں یعنی کہیں ہندی ہے اور کہیں فارسی
ہے ۔ مثلاً شعر ذیل کی زبان ہندی ہے :

راہ طریق سبیل پہچان اوتھ تھوکا مارگ جان

اب اگر یہ رسالہ ایرانی بناء گزینوں کے لیے لکھا گیا ہے تو ظاہر ہے
کہ یہ نووارد 'اوتھ' 'تھوکا' اور 'جان' اور 'پہچان' کے الفاظ مطلق
نہیں سمجھ سکتے تھے ۔ مگر شعر ذیل میں فارسی زبان اختیار کر لی
گئی ہے :

ہاندہ شراب و راوق و صیبا می است و مد
گر جرعه زان خوری تو کئی کلو نیک و بد

اس شعر کے غائب اگر بناء گزین ہیں جو ہندی سیکھنی چاہتے ہیں
تو سوچنے کا مقام ہے کہ تمام شعر سیکھنے کے بعد ایک ہندی لفظ
یعنی 'مد' ان کے لیے بڑا ۔

قرین عقل یہ ہے کہ اگر یہ کتاب ایرانی و تورانی نوواردین
کے لیے لکھی جاتی تو ہندی اور فارسی زبانوں کی یہ گنگا جمنی اس میں
لہریں نہ مارتی بلکہ ہندی الفاظ پر زیادہ توجہ دی جاتی اور ہر ہندی
لفظ کا فارسی مرادف دیا جاتا اور عربی الفاظ سے سروکار نہ رکھا جاتا ۔
لیکن خالق باری میں جو انتظام ہے اس سے ہم سمجھتے ہیں کہ مصنف
کی توجہ ہندی کے برعکس فارسی و عربی الفاظ کے سکھانے پر بہت زیادہ
مبذول ہے ۔ مثلاً اوپر کے دونوں شعروں کو لیجیے ۔ پہلے شعر میں یہ
فارسی و عربی الفاظ ملتے ہیں 'راہ طریق' ۔ 'سبیل' جن کے متبادل لفظ ایک
ہندی لفظ 'مارگ' لایا گیا ہے ۔ دوسرے شعر میں 'ہاندہ' ، 'شراب' ، 'راوق' ،
'صیبا' اور 'مد' پنج عربی و فارسی الفاظ ملتے ہیں ، ہندی لفظ صرف
ایک ہے ۔ میں ایک اور مثال دیتا ہوں :

لسان و زبان فارسی جیبہ آکھو
درخت و شجر دار و روکھ بہاکھو

ہندی زبان خانہ ہم بہت گہرے
چو خوف و خطر ہم ترس ڈر ہے
گرہ عقد باشد ہتازی و لیکن
ہندی بود کائنات بشو توازن
کثیر و تراوان و بسیار و الزون
بسے بہت کہے بھی جانو توں

ان اشعار میں عربی و فارسی الفاظ ہندی الفاظ کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ مصنف کا مقصد عربی و فارسی الفاظ کی تعلیم ہے۔ اگر ایرانی اور تورانی مہاجرین کے لیے یہ کتاب لکھی جاتی تو معاملہ بالکل برعکس ہوتا یعنی کتاب کی زبان فارسی ہوتی مگر ہندی لغات و مرادفات زیادہ تعداد میں ملتے، فارسی عنصر بقدر ضرورت ہوتا اور عربی الفاظ نہ لائے جاتے، نہ مصنف کو یہ کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی کہ فلاں لفظ فارسی ہے اور فلاں قازی وغیرہ۔ ان ملاحظات کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ خالق باری یرونیوں کی تعلیم کے لیے نہیں لکھی گئی بلکہ ہندوستانی بچوں کو عربی و فارسی نصیب سکھانے کے لیے۔

روایتاً خالق باری امیر خسرو کی طرف منسوب ہے مگر یہ روایت ہمیں زیادہ قدیم زمانوں میں نہیں لے جاتی۔ اس سلسلے میں ایک روایت وہ ہے جو خان آرزو کی مرتبہ غرائب اللغات میں درج ہے۔ میر عبدالواسع ہانسوی نے اپنی تالیف غرائب اللغات میں ’چہرے‘ کے معنی ’کلرد بزرگ‘ لکھے تھے۔ خان نے ان معنوں پر اعتراض کیا۔ فرمایا ہے :

”چہرا در رسالہ کلرد بزرگ و در رسالہ منظومہ امیر خسرو چہرہ

۔ بہ معنی استرہ است و مشہور در قصبات ہندوستان نیز ہمین است“

رسالہ منظومہ امیر خسرو سے مراد خالق باری ہے اور چہرا بہ معنی

استرا شعر ذیل میں لایا گیا ہے :

جاوہر سوہنی وسید است ٹوکرا
مقراض کثرتی کہ بود استرا چہورا

خان آرزو کی روایت ہمیں صرف بارہویں صدی کے مصنف تک پہنچاتی ہے ، البتہ سید صاحب نے اللہ خدائی کے بعض اشعار کی بنا پر جو عہد شاہ جہاں کی تصنیف ہے ، یہ قیاس لگایا ہے کہ اس کے مصنف تجلی نے بھی خالق باری کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ میں اس موقع پر سید صاحب ہی کے الفاظ نقل کیے دیتا ہوں :

”اَنَا ضَرُورٌ بِنَا جَلْنَا هے کہ آج سے کوئی تین سو برس پہلے بھی یہ کتاب خالق باری ہی کے نام سے مشہور تھی ۔ ’اللہ خدائی‘ جس کا ذکر آئے گا ۱۰۶ء کی تصنیف ہے ۔ اس کے مصنف تجلی نے کتاب کی مختصر منظوم تمہید میں یہ شعر بھی لکھا ہے :

شاید از لطف و رحمت باری روح خسرو نمایدم باری

اس شعر میں امیر خسرو کی روح سے مدد مانگی ہے اور اس کے پہلے مصرع کے آخری لفظ سے خالق باری کی طرف اشارہ کیا ہے ۔“
(ہندوستانی صفحہ ۳۳)

ہمیں خالق باری کے متعلق اور آسور میں بھی سید صاحب سے اختلاف ہے لیکن چونکہ یہ اسور بالتحصیل ’پنجاب میں اردو‘ میں دوچ ہو چکے ہیں اس لیے ہم اس تالیف کے صفحات ۱۲۸ ، ۱۳۳ کی طرف اپنے ناظرین کی توجہ متعطف کرتے ہیں ۔

اردو لغات میں دوسرا نمبر ’بحرالفضائل‘ کو دیا گیا ہے ۔ اگرچہ وہ براہ راست اردو لغت نہیں ہے بلکہ فارسی و عربی الفاظ کی فرہنگ ہے جس میں مصنف نے ضرورتاً بعض الفاظ کی تشریح اردو الفاظ جنہیں وہ ہندوی کے نام سے یاد کرتا ہے ، استعمال کیے ہیں ۔ یہ الفاظ متفرق طور پر تمام کتاب میں پکھڑے ہوئے ہیں جن کی تعداد تین ساڑھے تین سو الفاظ کے قریب ہوگی ۔ اگر ’بحرالفضائل‘ کو اس بنا پر اردو لغات کے ذیل میں لایا جا سکتا ہے تو ایسی اور درجن بھر کتابیں ہیں جو سید صاحب کی فہرست میں داخل ہونے کی منتظر ہیں ۔ ان میں بعض تو بحرالفضائل

سے بھی قدیم ہیں۔ مثلاً فرہنگ نامہ مولانا لطیف الدین مبارک غزنوی
 قوام جو علاء الدین محمد شاہ (۸۹۹۵ء و ۸۷۱۵ء) کے عہد کے بزرگ ہیں۔
 ضیاء برنی اور فرشتہ دونوں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ اسی طرح
 ’دستورالفاضل‘ ہے جو مولانا رفیع حاجب خیبر نے ۱۲۷۳ھ میں تالیف
 کی ہے۔ فرہنگ ’زبان گویا‘ از ملا رشید برادر چد جامع شرف نامہ احمد
 منیری اور اذات الفضل ۱۲۸۲ھ از قاضی بدرالدین محمد دہلوی بھی قدیم
 کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ اور متعدد فرہنگیں ہیں جن کے لیے ہم
 ’پنجاب میں اردو‘ (صفحہ ۴۰۸) کا حوالہ دینا پسند کرتے ہیں۔

محمد بن قوام بن رستم کرخی نہیں ہیں بلکہ کڑی یعنی کڑی
 (سلاطین گجرات کے عہد میں کڑی قصبہ ہونے کے علاوہ ہر گنہ بھی
 تھا۔ احمد آباد سے براہ آگرہ چالیس میل پر واقع ہے) علاوہ گجرات
 کے باشندے ہیں۔ ہر الفاضل ۸۹۷۵ھ میں تالیف نہیں ہوئی بلکہ
 ۸۸۳۷ھ میں۔ ۸۷۹۵ھ محمد بن قوام کی ایک اور تالیف ’شرح مخزن السرا‘
 کی تاریخ ہے۔ ان کی ایک اور تالیف کا نام ’جواہر المعادن‘ ہے جو
 فنون بدیع اور بیان و عروض پر شامل ہے۔ ہر الفاضل کے لیے ملاحظہ
 ہو رسالہ مخزن سال کرہ نمبر مارچ ۱۹۲۹ء و اپریل نمبر ۱۹۲۹ء۔

حکیم ہوسنی کا قصیدہ در لغت ہندی کوئی طویل چیز نہیں ہے،
 اس میں صرف چوالیس بیتائیں آیات ہیں اور خاتمہ یہ ہے :

ہوسنی بہت دریں آیات کرد است آئندہ ذکر
 کر کنی ازہر قوا ہر دم رسد نفعی دگر
 از ضرر داود مدامت در ہذاہ خوبشن
 آنکہ در عالم بتقدیرش بود نفع و ضرر

حکیم ہوسنی تقریباً ۸۹۰۶ھ سے ۸۹۳۲ھ تک تصنیف و تالیف میں مشغول
 رہے ہیں اور ایک درجن سے زیادہ رسالے اور کتابیں ان کی یاد گار ہیں۔
 طب اور افشا ان کے مقبول مضامین ہیں۔

’اللہ خدائی‘ اس قدر نادر نہیں جتنا عہد صاحب خیال کرتے ہیں۔

وہ مطبع انوار احمدی میں بخار تیر ہزار کے اہتمام سے ۱۲۹۸ھ میں طبع ہو چکی ہے۔ مطبوعہ مشہور کے ۱۶ صفحات ہیں۔ سبب تالیف میں لکھی کہتا ہے کہ ہندی و فارسی الفاظ کی تعلیم کی غرض سے میں نے یہ کتاب یاس خاطر گہور (کبڈا) ہسر شیر شاہ قانون گوی لکھی ہے :

گرچہ ہودازوہ طبیعت دور ایک گفتم بضاطر گہور
کہ در امر است قابل و خوش ہسر شیر شاہ قانون گوی
خوی

مطبوعہ نسخے میں ۸۱.۶۶ مال تصنیف بتایا گیا ہے اور کتاب کا نام 'اللہ خدائی' دیا ہے :

دو ضمیرم جو این ہوس افزود شصت و شش یا ہزار ہجری ہود
چون بفضل خدائی گشت تمام کردم 'اللہ خدائی' این را نام
نہ من از ہر این و آن گفتم خاص از ہسر کبودکن گفتم

غرائب اللغات کے مصنف میر عبدالواسع خانسوی نے بچوں کے لیے ایک منظوم رسالہ بھی لکھا ہے جو تصاب سہ زبان یا حمد ہاری کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں التزام یہ ہے کہ ہر مصرع میں ایک ایک لفظ عربی و فارسی و ہندی زبانوں کا بالترتیب دیا ہے۔ اس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں :

صمد پاک ترین جان نیں ہیمبر ہستہ پیمان
ملک ترشہ دیوتا مان صحتہ نامہ ہائی بکھان

اس کے علاوہ مختلف متناسب الفاظ کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے ، مثلاً لغات اعطای انسان ، اجناس ، غلہ ، گل ہا و میوہا ، ادویات ، لغات قرابت و رشتہ ، صفات ، معدنیات ، پرند ، حیوانات ، غیر پرند ، لغات متفرقہ ، لغات عوارضات ، ذائقہ ، عیوب جسم انسان ، اقسام الخدیہ ، اسباب اہل عرفہ ، مایوسات و اسلحہ ، لغات متعلقہ باورچی خانہ وغیرہ۔ آخر میں فارسی کے مصادر مشہورہ و غیر مشہورہ دیے ہیں۔ اس فصل میں ترتیب یہ ہے کہ پہلے مصرع میں تین تین مصدر ہیں ، دوسرے مصرع میں بالترتیب ان کا اردو ترجمہ ہے۔ مثال :

گردن گفتن شیدن جان گونا گونا گونا گونا
خوردن خفتن نوشیدن مان کھانا سونا پینا پکھان
اور خانے میں یہ شعر آتا ہے :

عبدالواسع سے یہ کتاب تین زبانوں کی ہے نصاب
صد ہاری فارسی دور میں بہت مقبول رہی ہے اور متعدد بار
چھپ چکی ہے لیکن مصنف کا نام مذکور نہیں۔

انگریزی اردو لغات کے سلسلے میں سید صاحب نے زیادہ تو مولانا
عبدالحق صاحب کے مضمون سے کام لیا ہے لیکن اس بارے میں سب سے
اہم اور اصلی ماخذ سر جارج گریسن کی پیناٹ لسانی کی جلد نم ہے جس
میں ایک نہایت طویل فہرست مغربی اہل لہجہ کی تالیفات کی درج ہے۔
اس فہرست میں اردو لغات کو بھی شان دار جگہ ملی ہے۔

خزینۃ الامثال نول کشور مطبوعہ ۱۸۷۳ء ہمارے پاس ہے۔ اس کے
کل ۲۵۶ صفحات ہیں۔ اصل کتاب صفحہ ۲۲۱ پر ختم ہو جاتی ہے اور
مصنف کا خاکہ بھی اسی صفحے پر درج ہے۔ بعد میں مختلف ضمیمے ہیں۔
خانے سے معلوم ہوتا ہے کہ سید حسین شاہ حقیقت نے ۱۲۱۵ء میں اسے
تالیف کیا ہے اور شعر ذیل میں تاریخ دی ہے :

کو خزینہ سے خرج صائب عدد بولا هاتف خزینۃ الامثال

خزینۃ الامثال = ۱۲۷۵ - ۶۰ = ۱۲۱۵ء

علی گڑھ جوبل میں ایک دکنی اردو کا لغت نمائش میں رکھا گیا تھا
جس کو نہایت قدیم بتایا گیا تھا۔

اگر 'تحفۃ الہند' اردو لغات کی فہرست میں داخل ہو سکتی ہے تو
پھر 'آئین اکبری' کسی صورت میں بھی اس فہرست سے خارج نہیں رکھی
جا سکتی۔

آخر میں ایک فلمی رسالے کا ذکر کیا جاتا ہے جو اردو لغت پر ہے۔
اس رسالے کا منصوبہ بھی وہی ہے جو غرائب اللغات عبدالواسع

ہائوسوی کا ہے۔ ۶۴ صفحات اور ہر صفحے پر ۱۵ یا ۱۶ سطریں ہیں۔ ہندی الفاظ کی فارسی زبان میں تشریح کی گئی ہے اور جگہ جگہ اساتذہ فارسی کے اشعار نقل ہوئے ہیں۔ شروع میں ذیل کا مختصر دیباچہ درج ہے :

”چند لغت از رسالہ کمال عترت کہ او از کتب لغت عربی و فارسی مثل ”مہذب الاسماء“ و ”منتخب رشیدی و صراح و صحاح و موبد الفضلا و لغتک چہانگیری و رشیدی و کشف الغات و تحفۃ السعادت و برہان قاطع و سروری و الخرائب اللغۃ و غیر ہا جمع نمودہ است نوشتہ شد“

یہ کمال عترت کون ہیں ہم نہیں جانتے۔ باب الالف میں ابتدائی دس لغت حسب ذیل ہیں :

اگوا ، اڑواڑ ، اولہنی ، انگہا ، آل ، آنکہ بولہ ، اندرائن کا بھل ، ادوک ، اذا ، آری ۔

اشارید

مقالات شیرانی (جلد اول)

(سربہ گوهر نوشاهی)

مقدمہ

شخصیات

- | | |
|---------------------------------|-----------------------------------|
| ابوالفرج رونی - ۷ | آذر - ۳۵ |
| ابوالفضل - ۱۸ | آرچ ہولڈ ، ڈہلیو - اے - جی - ۳۱ |
| احمد برہلوی سید - ۲۱ ، ۲۲ | آرزو ، خان - ۸ |
| احمد ہلغی - ۷ | آرنلڈ ، پرویسر - ۲۹ ، ۳۳ ، ۵۳ |
| احمد دکنی - ۱۰ ، ۸ | - ۵۵ |
| احمد شہید ، سید - ۲۲ | آزاد ، مولانا محمد حسین - ۱۱ ، ۱۲ |
| احمد کھٹو ، شیخ - ۱۸ ، ۱۹ | - ۸۳ ، ۶۵ |
| اختر شیرانی - ۱۹ ، ۳۲ ، ۵۸ ، ۶۱ | ابراہیم - ۳۵ |
| - ۶۶ ، ۶۹ ، ۷۰ ، ۷۷ ، ۷۸ | ابراہیم خان - ۲۳ |
| - ۷۹ ، ۸۰ | ابراہیم ڈار ، پرویسر - ۶۶ ، ۶۸ |
| اسٹب ، ڈاکٹر ہنری - ۵۳ | ابراہیم علی خان ، نواب - ۲۳ ، ۲۵ |
| اسحاق خان - ۲۳ | - ۶۰ |
| اسحاق ہنری ، شیخ - ۱۸ ، ۱۹ | این رشت - ۳۹ |
| اسرائیل خان - ۲۳ | |

- اسماعیل خان ۲۲ ، ۲۳ ، ۲۴ -
اقبال ، پروفیسر ۶۵ ، ۷۱ ، ۸۲ ،

۸۶ ، ۸۷ ، ۸۸ ، ۹۲ ، ۹۹ -

اقبال ، سر ۶۵ ، ۷۳ -

البیرونی ۷ -

الشمس ، سلطان شمس الدین ۱۸ -

امیر الدین ، میان ۷۵ -

امیر خان ، نواب ۳۱ ، ۳۲ ، ۳۳ -

امیر علی ، جسٹس سید ۳۱ ، ۳۸ ،

۵۵ -

ایلووڈ عظم ، شاہ ۴۴ -

بابائے اردو ۱۱ -

ب

باجن ، شیخ بہاؤ الدین ۸ -

براؤن ، پروفیسر ۵ -

بیدل ۴۱ -

بیکن ، لارڈ ۳۹ -

بے نوا سناسی ۷۱ ، ۸۶ -

پ

پالز ، ڈاکٹر ۳۵ -

ت

تاج الدین ریزہ ۷ -

ج

جالان ، سیٹھ وادھا کرشنا ۸۹ -

جسوت رائے ہلکر ۲۱ -

جنگ تانہ (امرتسری) ، لالہ ۲۹ -

جلال الدین مشہدی ، سید ۷۳ -

جمال الدین ۱۹ -

جہانگیر ، نور الدین ۱۸ -

چ

چاند خان (شیرانی) ۲۱ ، ۲۲ -

چاند خان ناگوری ۳۲ -

چند بردائی ۶۵ -

ح

حاجم ، ظہور الدین ۹ -

حالی ہانی اتی ۶۳ -

حامد (پسر محمود شیرانی) ۵۷ -

حبيب الرحمن خان شروانی ، نواب

۶۳ -

حسن ہلکرامی ، میجر سید ۳۱ -

حسن بھٹی ، سید ۴۷ ، ۴۸ -

حسن میان ۴۹ -

حسین ہلکرامی ، نواب عہدالملک

سید ۵۵ ، ۶۳ -

حسینی پیر ۱۹ ، ۷۳ -

حمید الدین خان ۴۴ -

خ

عہد داد خان ۳۸ -

خسرو دہلوی ، امیر ۷ -

خلیل (اللہ) ۴۵ -

خلیل احمد خان ۹۴ -

خوب بہد چشتی ، میان ۸ -

د

داؤد خان (اختر شیرانی) ۳۲

۷۸ -

درد ، میر ۹ -

دلہتی ۶۳ -

ڈ

ڈاہن ۷۵ -

ڈارون ۳۰ -

ڈلپ ۳۶ -

ڈیسائی ، ڈاکٹر ۵۸ ، ۵۹ ، ۹۵ -

ر

رائٹ ، ایچ نیلسن ۷۶ -

رتن سنگھ رائہور ۲۱ -

رحمان ، امی - اے ۹۹ -

رستم بن احمد بلخی ۷ -

رینز ، جے - ایچ ۵۶ -

س

سرسید ۱۱ ، ۳۹ -

سعادت علی خان ، نواب ۷۵ -

سعدی ۳۹ -

سختہ ، ڈلپ ۳۵ -

سٹاف ، غزنوی ۷ -

سودا ۹ -

سورج نرائن ، لالہ ۲۹ ، ۳۲ ،

۳۳ -

سہراب ۸۷ -

سمروودی ، عبدالقاسم ۳۸ ،

۳۹ ، ۴۹ -

سیاہ اکبر آبادی ، علامہ ۹۶ -

ش

شاکر ۶۸ -

شبلی ، علامہ ۵ ، ۱۱ ، ۱۲ -

شریف علی ، برویسر ۹۸ -

شلیح ، مولوی ۶۵ ، ۷۷ -

شمس سراج عظیم ۷ -

شہاب الدین مقتول ۳۰ -

شیرانی ۱۷ -

شیرانی ، برویسر حافظ محمود خان

۱ ، ۳ ، ۳۱ ، ۵ ، ۶ ، ۷ ، ۸ ،

۹ ، ۱۰ ، ۱۱ ، ۱۲ ، ۱۳ ، ۱۵ ،

۱۷ ، ۱۸ ، ۱۹ ، ۲۰ ، ۲۳ ،

۲۶ ، ۳۱ ، ۳۲ ، ۳۷ ، ۳۸ ،

۴۰ ، ۴۲ ، ۴۳ ، ۴۶ ، ۴۷ ،

۵۵ ، ۵۶ ، ۵۹ ، ۶۰ ، ۶۱ ،

۶۲ ، ۶۳ ، ۶۶ ، ۶۸ ، ۷۲ ،

۷۳ ، ۷۵ ، ۹۶ ، ۹۸ ، ۱۰۰ -

شیکمپٹر ۳۹ -

ض

ضیاء برلی ۷ -

ط

طلحہ ، برویسر سید ۹۷ -

عبدالقہ خان ، نواب ۲۳ -

عثمان غناری ۷ -

عرفی ۳۵ -

عطار ۳ -

عظیم الدین ۶۰ ، ۶۱ -

علی ہلگرامی ، شمس العلماء سید ۳۱ ،

۳۲ ، ۳۸ -

علی محمد جیوگام دھنی ، شاہ ۸ -

غ

غلام رسول سہر ، مولانا ۲۲ -

ف

فردوس ۳ ، ۶۳ -

فرعون ۸۳ -

فضل الدین قریشی ۶۵ ، ۷۲ ، ۷۵ ،

۹۰ -

فیروز ۶۶ -

فیروز جنگ بھادر ۶۰ -

ق

قاضی احمد آباد ۷۳ -

قدرت اللہ قاسم ، میر ۶۵ -

قوام بن رستم بن احمد بلخی ۷ -

ک

کاؤس جی جہانگیر ، سر ۳۱ -

کلیم (اللہ) ۳۶ -

خ

حاشق حسین بٹالوی ۹۹ -

حالمگیر ، اورنگ زیب ۹ -

عباد اللہ خان ، حافظ محمد ۲۳ -

عبدالحق ، مولوی ۱۱ ، ۱۹ ،

۶۳ ، ۶۶ ، ۷۱ ، ۷۸ ، ۸۰ ،

۸۱ ، ۸۲ ، ۹۶ -

عبدالحمد خان غازی ، سلطان ۵۰ -

عبدالرشید ، ملک قیس ۱۷ -

عبدالستار صدیقی ، ڈاکٹر ۶۶ ،

۸۳ ، ۸۵ ، ۸۶ ، ۹۱ ، ۹۶ -

عبدالمزیز ، میان ۶۵

عبدالغنی ، پرویسر ۵ -

عبدالقادر ، پرویسر سید ۶۵ ، ۹۷ -

عبدالقادر ، شیخ (سر) ۲۹ ، ۳۱ ،

۳۳ ، ۳۵ ، ۳۸ ، ۴۳ ، ۶۲ ،

۶۵ ، ۹۷ -

عبداللطیف تھن ، پرویسر ۶۵ -

عبدالودود ، قاضی ۶۶ -

عبدالقہ ، ڈاکٹر سید ، ۴ ، ۱۳ ،

۶۵ ، ۹۹ ، ۱۰۰ -

عبدالقہ الامون سہروردی ۳۸ -

عبدالقہ چغتائی ، ڈاکٹر ۲۰ ، ۶۵ ،

۷۰ ، ۸۵ ، ۸۹ -

عبدالقہ کوٹیلیم ، شیخ الاسلام ۳۹ ،

۵۰ -

عبدالقہ یوسف علی ، علامہ ۶۳ ،

۶۵ -

مسمود خان (شیرانی) ۲۳ ، ۳۰ ،

۳۶ ، ۳۷ ، ۳۸ ، ۵۰ ، ۵۱ ،

۵۳ ، ۷۰ -

مسمود سعد سلطان ۷ -

مشہود خان (شیرانی) ۲۳ ، ۳۷ ،

۳۸ ، ۳۹ ، ۵۰ ، ۵۳ ، ۵۶ ،

۵۹ ، ۶۰ -

مشیر حسین قندوانی ۵۵ -

مصطفیٰ ، شیخ ۸ -

مظہر محمود خان شیرانی ۱ ، ۱۳ ،

۱۵ -

مقبود خان (شیرانی) ۲۳ ، ۶۰ -

منظور میان (شیرانی) ۲۳ -

منہاج سراج ، قاضی ۷ -

منیر لاہوری ۵ -

مودود خان (شیرانی) ۲۳ ، ۵۰ ،

۶۰ -

موریسن ، تھیوڈور ۳۱ -

مہاراجا ہڑودہ ۷۹ -

میر تقی میر ۹ -

میٹنگ ، سن ۳۵ -

ن

نجیب اشرف ندوی ، پروفیسر

۶۶ ، ۷۳ ، ۹۰ ، ۹۸ -

نصیر الدین ۱۹ -

نظام الدین اسماعیل (شیرانی) ۲۳ -

نہار چند خان ۷۰ -

کولڈ سٹریم ۳۶ -

کوٹلیم ، عبداللہ ۵۹ -

ل

لوزک یا لیوزک ۱۳ ، ۶۳ ، ۶۵ -

م

مبارک کرمانی ، سید ۷ -

مجنون ۹۳ -

مراتب خان شیرانی ۲۵ -

محمد بن قوام بن رستم بن احمد

بلخی ۷ -

محمد بن مبارک کرمانی ، سید ۷ -

محمد انضال جہنجاہاوی ۱۰ -

محمد امین ، شیخ ۱۰ -

محمد حبیب ، پروفیسر ۶۵ -

محمد شاہ ۹ -

محمد شاہ ، پیر ۷۳ -

محمد شطیع ، مولوی ۳ ، ۸۷ -

محمد عبداللہ ٹونکی ، شمس العلیا مفتی

۲۷ -

محمد علی خان ، نواب ۲۳ ، ۵۹ -

محمد عمر ۳۸ -

محمد عمر حسینی ، سید ۵۸ -

محمد قاسم ۱۹ -

محمد محمود (شیرانی) ۲۳ -

محمد میکائیل (شیرانی) ۲۳ -

محمود دریائی ، قاضی ۸ -

محمود غزنوی ۱۷ ، ۶۳ ، ۹۶ -

مہر لاہوری ، شاہ ۸ -

ا

- عاشق نرید آبادی ، سید ۸۴ ،
 ۹۵ ، ۹۷ -
 عاتق ۵۹ ، ۶۰ -
 عیسیٰ ، سید ۴۴ -

ب

- بعقوب خان (شیرانی) ۲۳ -
 بنگ ۳۰ -
 بوسف ۵۸ -

و

- وجہی ۸ -
 وحید الدین سلیم ، مولوی ۶۳ -
 وزیر القولہ ، نواب ۲۲ ، ۲۳ ،
 ۲۵ -
 ولی احمد خان ، صاحب زادہ
 ۶۴ -
 ورنٹائیٹ ، ڈپٹی - ۶۴ -
 ولی ، حاجی ۳۸ -

مقامات

ز

- اکرہ ۹ -
 اجیر ۵۷ ، ۶۱ ، ۶۴ -
 احمد آباد ۱۹ ، ۲۳ ، ۶۸ -
 افریقہ ۳۶ -
 الجیریا ۴۹ -
 الہ آباد ۶۰ ، ۸۵ -
 امرت سر ۱۰ -
 انگلستان ۱۳ ، ۲۷ ، ۲۹ ، ۶۴ -
 اودھ ۴۹ -
 ایران ۳۵ ، ۴۹ -
 ایشیا ۳۶ ، ۴۵ ، ۴۹ -
 بارہا ۴۹ ، ۵۸ ، ۵۹ ، ۸۰ -
 بندہ جانیاز ۸۰ -
 بنگال ۶ -
 بھار ۶ -
 بھائی ۵۸ ، ۵۹ -
 بھوپال ۶۱ -
 بیجا پور ۸۵ ، ۸۶ -
 بیگم پورہ ۲۳ -

پ

- پاک و خند ، بر صغیر ۳ -

پ

- باغ چنوری والا ۹۴ -
 بالا کوٹ ۲۲ -
 بر صغیر ۳ ، ۶ -

- ہالی ۲۰ -
ہشتہ ۸۹ -
پنجاب ۴۱، ۵۱، ۶۱، ۹۱، ۹۳ -
ہورب ۶ -
ہونا ۸۵، ۸۶ -
پھلیرا ۶۰ -
ت
تخت سلیمان ۱۷ -
ترکی ۳۵ -
ٹ
ٹریبولی ۳۹ -
ٹوٹک ۱۹، ۲۱، ۲۲، ۳۳، ۲۵،
۲۷، ۳۷، ۵۳، ۵۶، ۵۷،
۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲،
۷۰، ۷۵، ۷۸، ۷۹، ۸۰،
۸۱، ۸۳، ۸۸، ۸۹، ۹۰،
۹۹، ۹۳ -
ٹیونس ۳۹ -
ج
جالور ۲۰ -
جودھپور ۱۸، ۲۰، ۲۱، ۲۵،
۲۷، ۲۸ -
جے پور ۲۵، ۲۷، ۳۷، ۸۱،
۸۳، ۸۹، ۹۳ -
ج
چٹوڑ ۷۵ -
چمیل، وادی ۹۱ -
ح
حصار ۹ -
حیلر آباد ۱۱ -
خ
خیر پور ۲۲ -
د
دائرہ ۱۰، ۷۳ -
دکن ۶، ۷، ۹، ۱۰، ۲۱،
۸۶ -
دھلی ۶، ۷، ۹، ۱۸، ۱۹،
۲۱، ۷۱، ۷۵، ۷۸، ۸۰،
۸۲، ۸۳، ۹۳ -
ڈ
ڈھاکہ ۶۰ -
ڈھانی شیرانیان ۱۹، ۲۳، ۲۵،
۶۰ -
ڈبلوانہ ۲۰ -
ڈیرہ اسماعیل خان ۷۱ -
ڈ
راجپوتانہ ۱۷، ۲۱، ۳۵، ۷۷ -
راجستھان ۹ -
رام پور ۸۲، ۸۳ -
راوی، دریا ۶۲ -
رئلام ۲۱، ۲۲، ۶۷، ۹۳ -

ک

- کالہیا واڑ ۷۳ -
 کٹھالہ ۲۳ -
 کراچی ۸۶ -
 کنکراج گھاٹ ۸۰ -
 کلکتہ ۶ / ۳۹ -
 کنزنگٹن ، شاہی ۷۴ -
 کھائو ۱۸ / ۱۹ / ۲۰ / ۲۲ -
 کھائو ، بڑی ۱۸ -
 کھائو ، چھوٹی ۱۸ / ۱۹ -
 کھٹو ۱۸ / ۱۹ -
 کیپ ٹاؤن ۳۸ -

کی

- کجرات ۶ / ۷ / ۱۸ / ۷۳ -
 کوالیار ۹۸ -

ل

- لاڈلنوں ۲۰ -
 لاہور ۵ / ۱۰ / ۱۳ / ۱۳ / ۲۷ -
 ۵۹ / ۶۰ / ۶۲ / ۶۳ / ۶۵ -
 ۶۶ / ۶۷ / ۶۸ / ۶۹ / ۷۳ -
 ۷۴ / ۷۵ / ۷۷ / ۷۸ / ۸۲ -
 ۸۳ / ۸۷ / ۸۹ / ۹۰ / ۹۷ -
 ۹۹ -
 لکھنؤ ۸۵ -
 لندن ۲۷ / ۲۸ / ۳۲ / ۳۳ / ۳۸ -
 ۴۰ / ۴۳ / ۴۷ / ۴۸ / ۵۲ -

رنگ-بہار ۷۷ -

روس ۳۳ -

رہنگ ۹ -

ژ

ژوب ۱۷ -

س

- سراندیب ۳۹ -
 سرحد ۶ / ۱۷ / ۲۲ -
 سرکھیچ ۱۸ -
 سوانا ۲۰ -
 سوئٹاتھ ۱۷ -

ش

- شام ۳۹ -
 شیرانی ، تحصیل ۱۷ -
 شیرانی پورہ ۲۱ -

ط

طور ۳۶ -

ع

عرب ۳۳ / ۳۹ -

ف

فیروز پور ۹ -

قی

قسططنیہ ۳۹ -

انتساب م -

اوزان یا وزن ۵ / ۱۲ -

پ

بحر ۳۳ / ۳۵ -

برج بہاشا ۶ -

پ

ہرے رتبہ ۶ -

ت

تاریخ عقائد م -

تثلیث ۳۶ -

تشبیہ ۳۵ -

تصویر شناسی ۳ -

تعمیہ ۱۲ -

تلمیح ۱۹ -

تنقید ۶۳ / ۶۵ -

ج

چکری (ذکری) ۸ -

د

دیستان ادب اردو ۶ -

دوہرہ ۷ -

ز

رباعی ۵ / ۱۲ -

رسم الخط ۷ -

ریشہ ۸ -

ز

زبان اردو کے معنی ۶ -

زمین ۳۵ -

س

سکہ شناسی ۳ / ۱۲ / ۸۸ -

ش

شواہد ، خارجی م -

شواہد ، داخلی م -

ع

عقیقات ۳ / ۱۲ / ۱۳ / ۵۳ -

۶۸ / ۳۱ / ۷۵ / ۷۷ / ۷۹ -

عروض ۵ / ۱۲ / ۶۵ / ۷۲ / ۶۱ -

علم خط ۳ -

ف

فن تاریخ گوئی ۱۲ -

ق

قصیدہ ۳۳ / ۳۵ -

ک

کتبہ شناسی ۳ / ۱۲ -

کھڑی بولی ۶ -

گ

گوجری ۱۰ / ۷۳ -

م

مجاورہ ۷ / ۱۰ -

۴ راب ۱۸ -

سلس ۳۳ -

مہر شناسی ۳ -

مہجور ۳ ، ۶۳ -

مہربانی ۱۰ -

مہنس کا نقشہ ۹۳ -

کتابیات

تذکرہ افغانی ۱۷ -

تنقید آب حیات ۷۵ -

تنقید ہر تھی راج واسا ۱۹ ، ۸۳ -

تنقید شعر المجہد ۳ ، ۱۱ ، ۶۳ -

۸۳ -

توزک جہانگیری ۱۸ -

ج

جماعت مجاہدین ۲۲ ، ۲۳ -

ح

حیات افغان ۱۷ -

خ

خالق باری ۳ ، ۸۳ -

د

داد سخن ۸ -

دکن میں اردو ۶ -

دیوان آفتاب ۶۱ -

دیوان حافظ ۵۶ -

دیوان حسن ۳ -

دیوان ذوق ۱۲ ، ۳۸ -

ڈ

آب حیات ۱۰ ، ۱۱ ، ۶۵ -

آئین اکبری ۱۸ -

اخلاق شہری ۵ -

اقتدار التوارخ ۲۱ -

پ

باغ و چار ۱۰ -

بہر التوارخ ۱۹ -

بہر الفضائل ۵ ، ۷ -

بکٹ قصہ ۱۰ -

بنگال میں اردو ۶ -

چار میں اردو ۶ -

ہر تھی راج واسا ۳ ، ۶۵ -

۸۳ -

پ

پنجاب میں اردو ۳ ، ۵ ، ۶۳ -

ت

تاریخ المائتہ ۱۷ -

تاریخ عربی ۱۰ -

ترجمہ خزائن الفتح ۶۵ -

دیوان معینی م -

قصہ چہار درویش ۱۰ -

سب رس ۸ -

کی

من

گجرات میں اردو ۶ -

سرحد میں اردو ۶ -

گلستان سعدی ۷۹ -

سلاطین دہلی کے مسکوکات اور

ل

نظام وزن و پیمائش ۷۶ -

لیٹلی مہنوں (مثنوی) ۸ ، ۱۰ -

سید احمد شہید ۲۱ ، ۲۲ -

م

ش

مشر ۸ -

شاہ نامہ م ، ۵۶ ، ۶۳ -

مثنوی عروۃ الوثقی شہابی ۵ ،

شعرالمعجم م ، ۶۳ -

۶۵ -

ص

مجموعۃ نغمز ۶۵ -

صحیفۃ زرین ۲۱ -

مرقاۃ الوصول الی اللہ و الرسول

ط

۱۹ -

مستحسن حالی ۳۳ -

طلوع و عروج اسلام ۵۳ -

ن

ی

نکات الشعرا ۹ -

نوردوسی ہر چار مقالے م ، ۷۱ ،

نوادو الانفاظ ۸ -

۸۸ -

ے

لی

یوسف زلیخا (مثنوی) ۱۰ ، ۶۳ -

قابوس نامہ ۶۳ -

معنی

شخصیات

ڑ

آدم علیہ السلام ۱۰۹ -

آبرو ، شاہ مبارک ۵۱ -

آرزو ، خان ۳۷ ، ۳۸ ، ۳۹ ، ۵۰ ،

- احمد ذکئی (۲۰۱ / ۲۰۳ / ۲۰۳)
 - ۲۱۲ / ۲۱۵ / ۲۱۶ -
 احمد ، سید ۳۷ -
 احمد ، سید (بن سید حسن) ۱۷۸ -
 احمد شاه ۳۹ -
 احمد ، شیخ ۱۵۳ / ۱۵۵ -
 احمد علی ۵۸ -
 احمد کبیر ولاحی ، سید ۱۷۸ -
 احمد کبیر ، شیخ ۱۸۹ -
 احمد کھٹو ، شیخ ۱۳۸ / ۱۶۱ ،
 - ۲۹۷ -
 احمد نبروانی ، شیخ ۱۳۶ / ۱۳۷ ،
 ۱۵۷ / ۱۵۹ / ۲۹۲ -
 اختیار الدین بدھو ۸۷ -
 اردشیر ۳۳ -
 ارسلان بن محمود ۵۸ / ۵۹ -
 اسپرنگر ۱۰۵ / ۱۰۷ / ۱۰۹ ،
 - ۲۷۷ / ۱۱۱ -
 اشرفن ، کار ۳۳ -
 اسحاق مغربی ، شیخ ۱۳۸ -
 اسفی ۵۷ / ۵۹ -
 اسماعیل سبسی ، شیخ ۱۷۸ -
 اشرف بیگ ، میرزا ۳۲ -
 امیطغری ۵۶ -
 اصغر گوندوی ، اصغر حسین ۳۱۲ -
 اکبر ، جلال الدین ۱۳ / ۱۶ ،
 ۲۰ / ۲۱ / ۲۲ / ۲۳ / ۲۵ ،
 ۲۷ / ۳۳ / ۳۳ / ۳۳ / ۳۳ ،
 ۵۳ / ۳۳ / ۳۳ / ۳۳ / ۳۳ ،
 ۳۱۵ / ۲۲۲ / ۸۸ / ۵۱ ،
 - ۳۱۶ -
 آزاد ، مولانا محمد حسین () ۳۹ ،
 - ۲۲۲ -
 اصف الدوله ، نواب ۵۰ / ۵۰ -
 آبی ۲۱۷ -
 آئیو ناک ۱۶۶ -
 ابراہیم ، دیوان ۱۳۱ -
 ابراہیم ، سلطان ۳۳ / ۵۷ / ۵۸ -
 ابراہیم ، سید ۱۸۰ / ۱۸۱ / ۱۸۵ -
 ابراہیم ، شاه ۱۷۹ -
 ابراہیم عادل شاه ۱۸۳ / ۳۰۳ ،
 - ۳۰۷ / ۳۰۵ -
 ابوالحسن شیخ محمد القریشی الاحمدی
 - ۱۸۰ / ۱۸۱ / ۱۸۳ -
 ابوالحسن عریض حسینی و حسینی
 سید ۱۰۷ / ۱۰۷ -
 ابوالحسن علی ، سید ۱۷۸ -
 ابوالفرج روفی ۵۵ / ۵۷ -
 ابوالفضل ۱۶۷ / ۲۱۹ / ۲۲۲ -
 ابوبکر یا ابی بکر ۲۱ / ۲۳ -
 ابوبکر نسیمی ۱۰۸ / ۱۱۳ -
 ابو سعید میرزا ، سلطان ۱۶۰ -
 اثیر الدین ۲ -
 احمد ۱۶۷ / ۱۸۶ -
 احمد (جتیدی) ۳۱۰ -
 احمد خان بھادو (عارف جنگ) ،
 سید ۲۸ / ۳۱ / ۳۶ =

- ۲۹۷ / ۲۹۸ / ۳۰۰ / ۳۰۱
- ۳۰۲
بارک الله چشتی ، شاه ۱۵۰ -
بهرالدین (قاضی خریا) ۳۰۸ / ۳۰۹ -
بهرالعرفان ، شاه ۳۱۷ -
بحری ، قاضی محمود ۳۰۸ / ۳۰۹ -
- ۳۱۰
بدایوانی ۵ / ۱۶ / ۲۱ / ۲۲
- ۱۳۳
بدرالدین ، شیخ ۱۳۰ -
بدرالدین دهلوی ، قاضی ۱۰۲ ،
- ۳۱۷
براؤن ، آرثر ۲۱۷ -
برنی ، مولانا ضیاءالدین ۷۱ / ۸۳
۹۱ / ۹۲ / ۹۵ / ۹۷ / ۹۹ -
برهان الدین جامی ، شیخ ۱۸۲ ،
- ۱۸۳ / ۳۰۳
برهان الدین ، شیخ ۱۳۸ / ۱۳۹ -
برهان الدین ، عبدالله قطب عالم ،
سید ۱۵۰ / ۱۶۱ / ۱۶۲
- ۲۹۷
بشیرالدین احمد ۲۹ -
بقرا خان ، نصیرالدین ۱۱۰ -
بکرماجیت ۱۰۹ -
بلاخین یا یلاک مین ۳۹ / ۴۳ ،
- ۵۴
بلای بیگم ۳۷ -
بلو سهارڈ یا بلو سهارڈ ، پرویسر
۳۰ / ۲۷۷ -
- ۲۰۳ / ۲۷۶ / ۳۰۵ / ۳۰۶
- ۳۰۷
اکبر شاه قلی ۳۲ -
البیرونی ، ابو ریحان ۵۶ / ۹۹ -
التمشی ، سلطان شمس الدین ۶۰ ،
۸۳ / ۱۱۱ / ۱۳۵ -
الیاس بھنگی ۹۱ -
انامی ۳۱۱ -
امانت الله ، مولوی ۴۲ -
امن ، میر ۳۵ / ۴۲ -
امین ۲۷۶ / ۲۷۸ / ۲۷۹ / ۲۸۰ ،
۲۸۲ / ۲۸۳ / ۲۸۵ / ۳۰۳ -
انشاء خان ، سید ۳۸ / ۴۲ -
الوری ، حکیم ۸ / ۱۰۷ / ۱۱۱ ،
- ۱۱۳
اوردا ۱۳ -
اوگستائی فان ۱۲ -
ایچی ، ڈاکٹر ۱۰۶ / ۱۰۹ ،
- ۱۱۰
ایٹن ۱۳ -

پ

- پاجا (یا بابو) جیو ۱۳۸ -
پایر ، ظہیر الدین ۱۳ / ۲۰ / ۴۳ -
پاتو خان ۱۲ / ۱۳ -
پاجن ، شیخ بہاؤ الدین ۵ / ۷ ،
۷۷ / ۱۳۶ / ۱۴۰ / ۱۵۰ ،
۱۶۲ / ۱۶۳ / ۱۶۵ / ۱۶۶ ،
۱۶۷ / ۱۶۸ / ۱۶۹ / ۱۷۰ ،
۱۷۱ / ۱۷۲ / ۱۷۳ / ۱۷۴ ،
۱۷۵ / ۱۷۶ / ۱۹۲ / ۲۹۲ ،
پاجا (یا بابو) جیو ۱۳۸ -
پایر ، ظہیر الدین ۱۳ / ۲۰ / ۴۳ -
پاتو خان ۱۲ / ۱۳ -
پاجن ، شیخ بہاؤ الدین ۵ / ۷ ،
۷۷ / ۱۳۶ / ۱۴۰ / ۱۵۰ ،
۱۶۲ / ۱۶۳ / ۱۶۵ / ۱۶۶ ،
۱۶۷ / ۱۶۸ / ۱۶۹ / ۱۷۰ ،
۱۷۱ / ۱۷۲ / ۱۷۳ / ۱۷۴ ،
۱۷۵ / ۱۷۶ / ۱۹۲ / ۲۹۲ ،

۱۵۵ ، ۶۰ ، ۱۰۸ ، ۱۱۱ -
 تاج الدين مفتي الملكى ، مولانا
 ۵۵ ، ۷۹ ، ۹۳ -
 تحيل ۳۱۶ ، ۳۱۸ -
 حسين ، محمد حسين عطا خان ، ۳۹ ،
 ۳۰ ، ۳۵ ، ۳۸ ، ۳۹ ، ۵۰ ،
 ۲۱۹ -

تقى اوحدي ۱۷۸ -
 تلک ۸۵ -
 تيمور ، امير ۷۲ ، ۱۶۱ ، ۲۹۷ -
 ث

ثزير ۳۰ -
 ثوثر مل ۵۳ -

ث

ثابت ، سيد ۱۷۸ -

ج

جام چالوه ۱۵۱ -
 جامى ، مولانا ۲۲۱ ، ۲۸۰ -
 جاهر موندهار ۸۷ -
 جلال الدين بانى بى ، شيخ ۱۳۸ -
 جلال الدين فيروز شاه خلجي ۸۶ ،
 ۱۱۰ -
 جلال الدين مسعود شاه ، ملك ۱۳۰
 جلال الدين آستاجى ، مولانا
 ۱۰۸ ، ۱۱۳ -
 جلال الدين ، خواجه ۱۶۰ -

بو على قلندر ، شيخ شرف الدين
 ۱۳۱ ، ۱۵۷ ، ۱۵۷ ، ۲۹۳ -
 جادر شاه كجراتى ۱۹۶ -
 جاز ۳۸ -
 بها بكري ، مولانا ۱۰۸ -
 جواز الدين ۲۷ -
 جواز الدين برناوى ، شيخ ۷۳ ،
 ۱۷۸ ، ۳۰۳ -
 جواز الدين زكريا ، شيخ ۸۵ ،
 ۱۳۱ ، ۱۵۷ -
 بهتا (با بهتا) خازن ، ملك ۷۰ ،
 ۸۷ ، ۹۶ -
 جبرام شاه ، عين الدوله ۵۹ -
 جدى رابعه ۲۳۱ -
 جدى سرک ۱۵۱ ، ۱۵۳ -
 جدى مفتى ۱۵۱ ، ۱۵۳ -
 جريل ۹۳ -
 جيتى ۵۷ -

پ

پنھا ، شيخ ۱۳۳ -
 پرائس ، وليم ۲۱۷ -
 پرتاپ سنگھ ۲۹۵ -
 پيارا ، شيخ ۱۳۹ ، ۱۵۷ ، ۲۹۵ -
 پير الله بھرسى ، پير ۲۱۷ -
 پير مالى ۷۱ ، ۸۷ -

ت

تاج الدين دبير ريزه يا سنگريزه

- جمال الدین هانسوی ، شیخ ۱۳۸ ،
 - ۱۳۹
 جانی ، مولانا ۶۰ / ۱۱۱ -
 چندی ۳۱۰ -
 جرجی ۱۴ / ۱۳ -
 جونا (یا جونانی) ، ملکہ ۸۷ / ۹۶ -
 جہانگیر ، نور الدین ۹ / ۲۵ / ۲۶
 - ۲۲۰ / ۳۰۴ -
 جینکس ۱۳ -

ج

- جراح دہلوی ۱۳۵ / ۱۳۵ -
 جراحی لال ، منشی ۳۷ -
 چنگیز خان ۱۰ / ۱۲ -
 چچو ، ملک ۶۹ / ۸۹ / ۹۱
 - ۹۶ -

ح

- حازم ، سید ۱۷۸ -
 حافظ ، خواجہ ۵ / ۶ / ۶۰
 - ۱۰۷ / ۲۱۹ / ۲۳۰ -
 حبیب الرحمن خان شروانی ، نواب
 - ۳۹ -
 حبیب اللہ ، شیخ ۱۷۹ / ۱۸۲ -
 حسام اذھنگ ۷۱ / ۸۷ -
 حسن ، امام ۲۰۵ -
 حسن بھٹی ۲۰۳ -
 حسن دہلوی ۱۳۳ / ۲۵۳ -
 حسن سجزی ، امیر ۱۰۸ / ۱۱۲ -
 حسن ، سید ۱۷۸ -
- حانی خان ۳۳ -
 خاقلی ۱۰۷ / ۱۱۱ / ۱۱۳ -
 خسرو ۱۸۳ -
 خسرو ترک آقہ ، امیر ۱۰۸ -
 خسرو خان ۱۳۳ -
 خسرو دہلوی ، امیر ۳ / ۵ / ۱۵
 ۳۰ / ۵۹ / ۶۴ / ۶۵
 ۶۵ / ۶۸ / ۸۵ / ۸۷ / ۸۷
 ۸۹ / ۹۰ / ۹۱ / ۹۳ / ۹۵
 ۹۶ / ۹۷ / ۹۸ / ۹۹ / ۱۰۱
 ۱۱۰ / ۱۱۳ / ۱۳۳ / ۱۳۵
 ۱۳۲ / ۱۵۳ / ۱۵۸ / ۱۵۹

و

راجا بهوج - ۲۶۶ -

رام - ۲۶۶ ، ۲۶۹ -

رام برتاب - ۲۹۵ -

راورث ، میجر - ۱۳ -

راون - ۲۶۶ -

رائث ، ایچ نیلسن - ۲۵ -

رائث ، نکلسن - ۲۰ -

رتن ، شیخ - ۱۶۳ ، ۲۹۷ ، ۲۹۸ -

رجب علی بیک سرور ، سرزا

- ۲۱۹ -

رحمت الله کجراتی ، شیخ - ۱۶۳ ، ۱۶۶ -

- ۱۶۵ -

رحمتی - ۳۱۱ -

رسول الله (صلعم) - ۲۱ ، ۲۲ ، ۲۳۸ -

- ۲۵۳ -

رشید ، ملا - ۳۱۷ -

رشید وطواط - ۳۰ ، ۱۰۷ -

رشید ، سلطانه - ۱۱۱ -

رفیع حاجب خیرات ، مولانا - ۱۰۲ ، ۱۰۳ -

- ۳۱۷ -

رکن الدین التبه ، ملک - ۶۶ ، ۸۷ -

- ۹۶ -

رکن الدین فیروز - ۱۱۱ -

رکن الدین کان شکر ، شیخ - ۱۶۳ -

- ۲۹۸ -

رودکی - ۱۱۳ -

رہو - ۱۰۵ ، ۱۰۶ ، ۱۰۹ ، ۱۱۰ -

- ۱۶۷ ، ۲۱۸ ، ۲۱۹ ، ۲۲۱ -

- ۲۲۲ ، ۲۳۰ ، ۲۹۳ ، ۲۹۴ -

- ۲۹۵ ، ۳۰۲ ، ۳۱۳ ، ۳۱۵ -

- ۳۱۶ -

خضر ، خواجہ - ۸۸ ، ۲۰۵ -

خلیل علی خان اشک - ۳۱ -

خواجگی ، مولانا - ۱۶۱ ، ۲۹۷ -

خواص خان - ۳۳ -

خوب محمد چشتی ، میان - ۱۹۰ ، ۱۹۱ -

- ۱۹۲ ، ۱۹۳ ، ۱۹۵ -

- ۱۹۷ ، ۱۹۸ ، ۲۷۶ ، ۲۷۷ -

- ۳۰۰ ، ۳۰۲ ، ۳۰۶ -

ز

زاغ دهلوی ، نواب میرزا - ۱۶۷ ، ۱۶۸ -

- ۳۰۲ -

ذالیا ، شہزادہ - ۱۹ -

داؤد ایلچی - ۲۱۷ -

درد ، میر - ۳۸ -

درکا برشاد نادر ، منشی - ۱ ، ۳۶ -

دقیقی - ۶۱ -

دوراک ، ڈاکٹر رٹولف - ۲۱۷ -

دولت خان - ۱۶ -

ڈ

ڈینی سن راس ، ڈاکٹر - ۲۸ -

ڈ

ذوالفقار - ۲۵۰ -

ز

- سنقر ۸۵ -
سودا، سرزا ۸ ، ۳۱ ، ۳۴ ، ۳۸ ،
- ۲۶۰ -
سوزنی ۱۰۷ -
سینالدین ، ملک ۱۵۳ ، ۱۵۴ -

س

- ش
شاه احمد کبیر ۱۸۳ -
شاه باجن ۱۶۶ -
شاه بزرگ الله چشتی ۱۵۰ ، ۱۵۱ -
شاه بد ۱۵۲ -
شاه برهان ۱۸۳ ، ۳۰۳ -
شاه بلیکه ۱۵۳ ، ۱۵۴ -
شاهجهان ۲ ، ۹ ، ۲۶ ، ۲۹ ،
۳۱ ، ۳۲ ، ۳۵ ، ۳۶ ، ۳۷ ،
۳۹ ، ۴۰ ، ۴۱ ، ۴۲ ، ۴۳ ، ۴۴ -
شاه عالم ۴۱ -
شاه عبدالله ۳۱۰ -
شاه علی جیو (با علی محمد) ۱۷۸ ،
۱۷۹ ، ۱۸۰ ، ۱۸۱ ، ۱۸۷ ،
۳۰۰ -
شاه عزیز ، سلطان ۱۵۳ ، ۱۵۵ -
شاهم بیگ ۱۶ -
شیل ، مولانا ۸۷ -
شجاع الدوله ، نواب ۳۹ ، ۴۰ ،
۵۰ ، ۵۱ -
شجاعت علی ۵۰ -
شروانی ، علامه ۳۹ -

- زلیخا ۲۲۹ ، ۲۸۰ ، ۲۸۱ -
زمان ، خان ۲۷ -
زین الدین ، شیخ ۱۳۵ -
س
ساجن ، ملک ۸۷ -
سجان رائے ۱۳۳ -
سقاؤ ، پروفسر ۹۹ -
سراج الدین ابوالبرکات ، شاه عالم
۱۵۰ ، ۱۵۱ ، ۱۵۲ ، ۱۵۳ ،
۱۵۴ ، ۱۵۵ ، ۱۵۶ ، ۱۶۲ -
سراج پروانہ ، شیخ اخی ۱۳۳ -
سرخوش ۲ -
سعادت علی ، سید ۴۰ -
سعدی ، شیخ ۵ -
سعدی شیرازی ، شیخ ۵ ، ۱۰۷ ،
۱۱۳ ، ۱۸۹ ، ۲۱۵ ، ۲۱۹ ،
۲۴۰ ، ۲۴۱ ، ۲۷۳ -
سکندر بن سنجہو ۱۵۵ ، ۱۵۶ ،
۲۹۶ -
سکندر ثانی علاؤالدین خلجی ۲۰۱ -
سکندر عادل شاه ۳۰۹ -
سلطان محمد ۷۱ ، ۸۲ ، ۹۰ -
سلیم ۸۸ -
سلیم ، شہزادہ ۱۹ -
سنائی ، حکیم ۵۷ ، ۵۹ ، ۱۰۷ -
سنجر ، سلطان ۳۰ -

شرف الدین احمد یحییٰ منیری، شیخ

۱۳۳ / ۱۵۷ -

شفیق اورنگ آبادی - ۲۹۳ -

شکر گنج - ۱۳۱ -

شمس اللہ قادری، حکیم، ۳۳،

۱۳۸ / ۲۷۸ / ۲۸۶ / ۲۸۷ -

۲۸۹ / ۳۰۸ / ۳۱۰ / ۳۱۱ -

شمس سراج عقیف، ۱۳، ۵۵، ۷۳،

۷۷ / ۸۱ / ۹۲ / ۹۳ / ۹۵ -

۱۱۲ / ۱۳۳ -

شوہر - ۱۳ -

شہاب الدین کستوری، مولانا

۷۲ / ۷۳ / ۸۷ -

شیخ چلی یا چلی، ۱۹۳ / ۱۹۵،

۱۹۶ -

شیرازی، پرویسر حافظ محمود خان

۵۲ / ۲۱۷ / ۲۹۵ -

شیر خان، ملک، ۱۳ -

شیر علی افغوس، میر، ۳۲ -

شیر شاہ قانون گو، ۳۱۸ -

شیریں، ۱۸۳ / ۱۸۹ / ۲۰۵ / ۲۲۰،

۲۹۹ -

شبلیخ، گرین، ۳۱۷ -

ص

صادق علی خان، نواب، ۳۸ -

صائب، ۸۸ -

صدر الدین کلیم، شیخ، ۱۳۵ -

صدر یار جنگ، نواب، ۱۰۲ -

صدیق، ۲۱۷ -

صلاح الدین ابور، ۲۷ -

ض

ضیا الدین نقشب، ۳۱ -

ضیاء برنی، ۱۵ / ۵۵ / ۵۸ / ۶۸،

۸۰ / ۸۲ / ۸۶ / ۹۰ / ۹۱،

۹۵ / ۹۷ / ۹۸ / ۹۹ / ۱۰۱،

۱۱۲ / ۲۶۳ / ۳۱۷ -

ط

طوالیسی، قاضی، ۲۷ -

ظ

ظریف محمد بن عبداللطیف نریشی

الاسدی، ۱۱۶ -

ظہور الحسن بن محمد کلیم اللہ، ۱۰۶،

۱۰۷ -

ظہوری، ۹۰ / ۲۱۹ -

ظہیر غازی، ۱۰۷ -

ع

عارف بن عبدالحق، شیخ، ۱۳۹،

۱۵۰ -

عارف جنگ، سید احمد خان بہادر

۲۸ -

عالمگیر، اورنگ زیب، ۲۶ / ۲۹،

۳۳ / ۱۸۳ / ۲۷۹ / ۲۸۶،

۳۰۸ / ۳۰۹ -

عبدالحق، شیخ احمد، ۱۳۸ / ۱۳۹،

۱۵۰ / ۱۵۷ -

- عبدالحق (جاهر سولدهار) ۷۵ ،
۸۷ -
عبدالحق ردلولی ، شیخ ۲۹۵ -
عبدالحق ، مولوی ۱۸۰ ، ۱۳۸ ،
۱۸۲ ، ۲۰۲ ، ۲۱۷ ، ۲۷۳ ،
۲۷۵ ، ۲۸۹ ، ۲۹۰ ،
۳۰۷ ، ۳۱۰ ، ۳۱۹ -
عبدالحکیم ، شیخ ۱۶۶ -
عبدالحمید لاهوری ۲۲۲ -
عبدالرحمان القربشی الاحمدی
۱۷۹ ، ۱۸۰ ، ۱۸۱ -
عبدالرحمان جامی ، مولانا ۲۸۰ -
عبدالحق صديقي ، ڈاکٹر ۳۱۲ -
عبدالشکور ، شیخ ۱۳۸ -
عبدالعزیز شمس سراج عقیف
تھانپری ۷۸ ، ۱۱۶ -
عبدالقادر خان چادر ۳۶ -
عبدالقادر ، پروفیسر سید ۲۰۳ -
عبدالقادر جیلانی ۲۷۹ -
عبدالقادر ، شاہ ۹ ، ۸ -
عبدالقوس گنگوہی ، شیخ ۱۳۸ ،
۲۹۵ -
عبداللطیف ، شیخ ۱۶۶ ، ۱۶۷ -
عبداللطیف قریشی الہدی ۱۱۶ -
عبدالمومن ۳۰۸ -
عبدالواسع جیلی ۱۰۷ -
عبدالواسع ہانسوی ، میر ۳۷ ،
۵۰ ، ۵۱ ، ۲۹۵ ، ۳۱۵ ، ۳۱۸ ،
۳۱۹ -
- عبدالله (بن عبدالمطلب) ۱۸۶ -
عبدالله بن عبدالرحمان ۱۳۸ -
عبدالله ، ڈاکٹر سید ۵۳ -
عبدالله ، شاہ ۳۱۰ -
عبدالله قطب شاہ ۳۱۸ -
عبد منجم ۱۰۸ ، ۱۱۲ -
عثمان رحمہ ۲۱ ، ۲۳ -
عثمان مختاری غزنوی ۵۹ -
عرفی ۲۱۹ ، ۲۲۰ -
عزیز الدین صوفی ، خواجہ ۱۳۳ -
عزیز اللہ متوکل ، شیخ ۱۵۰ ،
۱۶۲ ، ۱۶۳ ، ۱۶۵ ، ۲۹۸ -
عطاء اللہ ، شیخ ۱۶۳ ، ۲۹۷ ،
۲۹۸ -
عظمت اللہ بٹھوری ۱۰۶ -
علاؤ الدین ثانی برناوی ۱۷۶ ،
۱۷۸ -
علاؤ الدین ، شیخ ۱۷۶ -
علاؤ الدین عطا سلک جونی
۱۲ -
علاؤ الدین علی احمد صابری ،
شیخ ۱۳۹ -
علاؤ الدین قل ، شیخ ۱۳۳ -
علاؤ الدین کڑک ۸۷ -
علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ ۸۳ -
علاؤ الدین محمد شاہ خلجی ، سلطان
۶۵ ، ۸۳ ، ۸۵ ، ۸۶ ، ۱۰۲ ،

- عیاض الدین بلبن ، سلطان ۸۳ ،
 - ۸۶
 عیاض الدین تغلق ۱۱۲ ، ۱۳۳ -
 علی
 فتاحی نیشابوری ۲۱۷ -
 فتح خان ۱۵۲ ، ۱۵۳ -
 فخر الدین ۱۰۸ ، ۱۵۳ ، ۱۵۴ -
 فخرالدین قواس غزنوی ، مولانا
 ۱۰۲ ، ۳۱۷ -
 فخرالدین گھنٹ ، ملک ۶۹ ، ۸۷ ،
 - ۹۶
 فرحت الملک ، ۱۹ -
 فرخ میر ۲۶ -
 فرخی ۵۷ ، ۵۹ -
 فردوسی ۵۷ ، ۲۱۹ ، ۲۸۰ -
 فروشنه ۷۹ ، ۱۳۳ ، ۱۳۷ ، ۱۶۰ ،
 ۳۰۳ ، ۳۱۷ -
 فرهاد ۲۰۵ ، ۲۲۰ -
 فرید الدین عطار ، خواجہ ۲۰۵ -
 فرید الدین مسعود گنج شکر ،
 شیخ ۸۳ ، ۱۳۷ ، ۱۳۸ ،
 ۱۳۹ ، ۱۴۰ ، ۱۴۱ ، ۱۵۷ ،
 ۱۵۹ ، ۲۹۲ -
 فرید ، ثانی (یا ثالث) ۱۳۱ -
 فضل الدین محمد بن قوام بلخی ،
 مولانا ۱۱۱ ، ۱۶۳ -
 فضل حق خیر آبادی ، مولوی ۱ -
 فضیلت شہر شاہی ، قاضی ۲۷ -
 ۱۱۰ ، ۲۰۱ ، ۳۱۷ -
 علاؤ الدین محمود خلجی ۱۶۰ -
 علی روضہ ۲۱ ، ۲۳ -
 علی اکبر چندری ۳۱۰ -
 علی شیرنوائی ، امیر ۲۰۳ -
 علی متقی ، شیخ ۱۶۳ ، ۱۶۵ -
 علی محمد جیوگام دہلی ، شاہ ۱۷۸ ،
 ۱۷۹ ، ۱۸۰ ، ۱۸۱ ، ۱۸۶ ،
 ۱۸۸ ، ۲۹۸ ، ۳۰۰ ، ۳۰۲ -
 ۳۰۶ -
 علی محمد خان ۲۹۶ -
 عمر روضہ ۲۱ ، ۲۳ -
 عمر الحسینی الاحمدی ، شاہ ۱۷۸ ،
 ۱۷۹ ، ۱۸۰ -
 عید تولدی ۱۰۸ -
 عمیق بخاری ۱۱۳ -
 عنصری ۵۷ ، ۱۱۳ -
 غ
 غازی الملک تغلق شاہ ۱۳۳ -
 غالب ، میرزا اسد اللہ خان ۳۳ -
 غلام التقلین ، خواجہ ۳۱۳ -
 غلام فرید ، خواجہ ۱۷۲ -
 غلام محمد الصاری وٹا ۲۸۸ -
 غلام ہمدانی مصحفی ، شیخ ۳۱ ،
 ۳۶ ، ۳۷ -
 غوث اعظم ۲۰۵ -
 عیاض ۹۱ -

ک

- کاکلم ۳۱۱ -
کاسران سرزا ۱۶ ، ۲۱ -
کبیر ، شاه ۱۳۹ ، ۲۹۲ -
کرخی یا کرپی ، مولانا محمد بن قوام
۱۰۵ ، ۱۰۶ ، ۱۰۹ ، ۱۱۰ -

۱۱۱ ، ۲۹۵ ، ۳۱۴ -

- کرم شاه ، پیر ۳۱ ، ۳۶ -
کمال عتوت ۳۲۰ -
کمال محمد سیستانی ، شیخ ۱۹۲ -
کیتباد ۱۱۰ -

گ

- گارساں دتاسی ۲۰۴ -
گیرمن ، سرچارچ ۳۱۹ -
گلاب سنگھ ، منشی ۳۶ -
گلبند بیگم ۱۹ -
گلزار حسینی ۵۵ -
گلکرائسٹ ۳۱ ، ۳۲ -
گنج شکر ۱۵۷ -
گنگا تیلی ۲۶۶ -
گوپال نایک ۸۵ -
گهور ۳۱۸ -
گیسو درواز ، ابوالفتح سید محمد حسینی
۲۳۰ ، ۲۸۸ -

ل

- لامعی ۲۱۷ -
لدها پانجبان ۷۱ ، ۸۷ -

لیروز شاه چینی ۷۹ -

لیروز شاه تغلق ، سلطان ۸ ، ۶۸ ،

۷۳ ، ۷۴ ، ۷۵ ، ۷۸ ، ۸۶ ، ۱۰۲ ،

۱۱۶ ، ۱۳۳ ، ۱۳۴ ، ۱۳۶ -

لیروز شاه خلجی ، جلال الدین

۸۹ -

ن

نادر بخش صابر ، سرزا ۳۶ -

نارون ۶ -

ناسم علی خان ، نواب ۳۸ -

ناضی دریا ۳۰۸ ، ۳۰۹ -

نصرت ۴۰ -

نرا پاشا ، میرزا ۲۸ -

نطب الدین ابیک ، سلطان ۸۳ ،

۹۸ ، ۱۳۳ ، ۱۵۲ -

نطب الدین بختیار کاکای ، شیخ

۱۳۷ ، ۱۳۸ ، ۱۵۷ ، ۲۹۲ -

نطب الدین منور ، شیخ ۱۳۹ -

نطب عالم ، سید برهان الدین

عبد الله ۱۵۰ ، ۱۵۱ ، ۱۵۲ -

نطب عالم ، شاه ابراهیم ۱۷۸ -

نطب محمد ، شیخ ۱۶۶ -

نوام بن رستم بن احمد بلخی ۱۰۴ ،

۱۰۶ -

نومی شوستری ، مجدد الدین علی

۳۸ ، ۳۹ -

نویس ۲۱۲ ، ۲۱۳ -

نویسر سجزی ، ادبیر ۱۰۸ ، ۱۱۳ -

۲۷۷ / ۲۷۸ / ۲۷۹ / ۲۸۳ /

- ۲۸۵

محمد باقر ، ذاکتر ، ۳۵ / ۳۶ / ۳۷

۳۸ / ۳۹ / ۵۱ / ۵۲ / ۵۳ -

محمد بن پدر الدین اسحاق ، خواجه

- ۱۳۳

محمد بن سام ، معزالدين ، ۸۳ / ۹۸ -

محمد بن عارف ، ۱۵۰ -

محمد بن قوام بن رستم بن احمد بلخی

۶۰ / ۱۰۳ / ۱۰۶ / ۱۰۹ /

۱۱۲ / ۱۱۶ / ۱۱۷ / ۱۱۸ /

۱۲۰ / ۱۲۹ / ۲۹۷ / ۳۱۷ -

محمد بن مبارک کرمانی ، سيد ، ۵۵

۵۸ / ۷۲ / ۹۹ / ۱۳۳ -

محمد تغلق ، سلطان ، ۷۶ / ۸۷

۱۱۲ / ۱۳۳ / ۲۰۱ / ۲۰۲ -

محمد تقی میر ، سيد ، ۳۹ / ۴۱

۳۷ / ۳۸ / ۳۹ / ۴۶ -

- ۲۹۳

محمد تیغ جادو ، ۳۱۸ -

محمد جون پوری ، سيد ، ۳۰۸ -

محمد حبیب ، برویسر ، ۳۱۲ -

محمد حسن ، میرزا ، ۱۷۸ / ۳۰۰ -

محمد سیف الدین ، گیلانی زاده السید

- ۱۷۸

محمد شاه ، سلطان ، ۳۷ / ۱۵۱

- ۲۷۵

محمد شفیع ، برویسر ، ۱۱ / ۲۸ -

محمد صالح ، ۲۲۲ -

لدن ، ۱۳۹ / ۱۵۰ -

لطیف الدین کهنه سالی ، خواجه

- ۸۷

لطیف ، شیخ ، ۱۵۰ / ۱۶۲ -

لکشمی ، ۸۳ -

لهراسب ، شاه ، ۶۱ -

لیلی ، ۱۸۳ / ۱۸۹ / ۲۰۵ -

۲۱۱ / ۲۱۵ / ۲۹۹ -

م

مادر مومنان ، ۱۳۸ / ۱۳۹ / ۱۵۷ -

مادهو ، فقیر ، ۱۳۷ / ۲۹۲ -

مارتن ، جیمز ، ۵۰ -

مبارز خان ، ۱۳۱ / ۲۹۳ -

مبارک کرمانی ، سيد ، ۵۵ -

مجنون ، ۱۸۳ / ۱۸۹ / ۲۱۱ / ۲۱۲ -

۲۱۳ / ۲۱۳ / ۲۱۵ / ۲۹۹ -

محبوب عالم ، مولوی ، ۱۳۵ -

محرر ، ۳۸ -

محمد (سلیم) ، ۱۶۹ / ۱۷۱ / ۱۸۵ -

۱۸۶ / ۲۳۲ / ۲۷۹ -

محمد اسماعیل ، ۳۳ -

محمد اکبر شاه ، ۳۳ -

محمد اکرم رهنکی ، ۲۶۵ -

محمد امین چڑھا کسوی ، مولوی

- ۳۱۳

محمد امین ، شیخ ، ۱۸۳ / ۲۷۶

- پد قادری ۳۱ -
 پد قطب شاه ۲۰۳ -
 پد قلی قطب شاه ۲۰۰ ، ۲۰۲ ،
 ۲۰۳ ، ۲۱۰ ، ۲۱۶ -
 پد کلیم الله بن عظمت الله بنهروی
 ۱۰۶ -
 پد کيسو نواز ، حضرت سيد ۱۳۸ -
 پد معروف ۳۳ -
 پد واوت ۳۳ -
 پد ولی ۲۰۰ -
 محمود بن سيد ابرجی ۱۳۸ -
 محمود بيگلر (يا بيگلر) ، سلطان
 ۳ ، ۱۵۲ ، ۱۵۵ ، ۱۶۳ -
 محمود بنو ۷۳ ، ۸۵ -
 محمود دريائي (يا بھري) ، لائى
 ۱۷۶ ، ۱۷۷ ، ۲۰۲ ، ۳۰۸ ،
 ۳۰۹ -
 محمود ، سيد ۱۵۲ -
 محمود شاه خلجی ، ۱۹۶ -
 محمود غزنوی ، سلطان ۸۳ ،
 ۸۳ ، ۸۵ ، ۹۹ -
 محي الدين قادری زور ، ڈاکٹر سيد
 ۱۸۲ ، ۲۸۹ ، ۲۹۰ ، ۲۹۱ ،
 ۲۹۳ ، ۲۹۴ ، ۲۹۶ ، ۲۹۸ ،
 ۳۰۰ ، ۳۰۲ ، ۳۰۳ ، ۳۰۵ ،
 ۳۰۶ ، ۳۰۷ ، ۳۰۸ ، ۳۰۹ ،
 ۳۱۰ ، ۳۱۱ -
 مخدوم جہانیاں ۱۵۰ -
 مراد شاہ ، پير ۳۱ ، ۳۵ ، ۳۶ ،
 ۵۰ ، ۵۷ -
 مراد ، شہزادہ ۱۹ -
 مرتضیٰ ۲۲۳ ، ۲۵۰ -
 مرمع رقم خاں ۳۹ ، ۵۰ ، ۵۱ -
 مرمع منکی ۱۹ -
 مستنصر بالله ۸۳ -
 مسعود ثالث ۵۷ ، ۵۸ ، ۵۹ -
 مسعود حسن رضوی ادیب ، سيد
 ۳۱۳ ، ۳۱۶ ، ۳۱۷ -
 مسعود سعد ساہان ، خواجہ ۵۵ ،
 ۵۸ ، ۹۹ ، ۱۰۸ ، ۲۶۳ ،
 ۲۹۳ -
 مسعود شہید ، سلطان ۸۵ -
 مسعودی ۵۶ -
 مسیح الزمان ۱۳۳ -
 مشرف الدين سعدی ، شيخ ۱۰۷ -
 مشرقی ۳۱۱ -
 مصطفیٰ ، شيخ ۳۱ ، ۳۵ ، ۳۷ ،
 ۵۳ ، ۵۸ -
 مصطفیٰ (حلی الله عليه وسلم) ۱۷۱ -
 مصطفیٰ حبیب الله ، شاه ۱۸۰ ،
 ۱۸۱ -
 مصلح الدين شيرازی ، شيخ ۱۰۷ ،
 ۱۰۸ -
 معزالدين ، حاجی ۱۶۳ ، ۱۶۵ -
 معزالدين محمد بن سام ۸۳ ، ۹۸ -
 معین الدين چشتی ، شيخ ۱۳۵ -

- مقربى ، شيخ محمد شيرين ۱۷۸ -
 صفيّ الدين هانسي ، مولانا ۱۰۸ -
 مقبول احمد صمداني ، سيد ۳۱۳ -
 مقبول (دربان) ۱۵۳ -
 مقبول عرف توراباقد ، ملك ۸۷ -
 مقدسي ۱۱ -
 منجهله ، ميان ۱۵۵ ، ۱۵۶ -
 منجهن ، شاه ۱۵۰ -
 منگا طباط ۷۱ ، ۸۷ -
 منو چهرى ۵۷ -
 مناج سراج ، قاضى ۱۳ ، ۵۵ ، ۶۱ -
 موسى عليه السلام ۱۸۵ ، ۲۳۲ -
 ۲۳۳ ، ۲۵۸ -
 مولانا روم ۲۳۰ -
 مومن ۳۰۸ -
 موهن ، شيخ ۸۷ -
 مد چنلر ۸۶ -
 مهدى ، مير ۳۳ -
 مهرباب ۵۹ -
 ميرن ، نواب ۳۸ -
 مينان ، شيخ ۱۶۵ -
- ن
- نادر شاه ۳۰ -
 نادر ، منشى دوگا برشاد ۱ ، ۳۹ -
 ناصرالدين خسرو خان ۱۳۳ -
 ناصر الدين محمد شاه تغلق ۱۳۹ ،
 ۱۳۷ ، ۱۵۷ -
- ناصرالدين محمود شاه ، سلطان ۶۱ ،
 ۱۶۱ ، ۲۹۷ -
 نانلم غروي ۲۸۰ -
 نامى ۵۲ -
 ناپك بجه ، شيخ بابو ۷۱ ، ۸۷ -
 نتهو سولعل ۷۱ ، ۸۷ -
 نثار ۳۸ -
 نجم الدين حسين سجزي ، امير ۱۰۸ -
 نجم الدين ، قاضى ۱۵۵ ، ۱۵۶ -
 نصرالله بنگدي ، شيخ ۱۶۳ ، ۲۹۷ ،
 ۲۹۸ -
 نصرة الدوله والدين مطلق شق بهار
 ۷۹ -
 نصرى ، شيخ ۳۰۲ ، ۳۰۳ -
 نصيرالدين بقرا خان ۱۱۰ -
 نصيرالدين محمود ، شيخ ۱۳۳ ،
 ۱۳۵ -
 نصيرالدين هاشمي ۲۷۸ -
 نظام الدين اوليا ، خواجه ۷۲ ،
 ۸۵ ، ۱۳۳ ، ۱۳۵ ، ۱۳۹ -
 ۱۳۱ ، ۱۳۲ ، ۱۳۳ ، ۱۵۰ -
 ۱۵۷ ، ۱۵۹ ، ۱۶۷ ، ۱۷۷ -
 ۲۹۲ ، ۲۹۳ -
 نظامى ۱۰۵ ، ۱۰۶ ، ۱۰۸ ، ۱۱۳ ،
 ۲۲۰ -
 نلر ۳۱۱ -
 نظيري نيشا پوري ۲ ، ۲۱۹ -
 نواب علي ، بروفسر ۱۵۰ -

- نورالحسن ۱۰۷ -
 نورالدین مبارک، سید ۱۱۲ -
 نول کشور ۱۶، ۲۷، ۳۶، ۳۳،
 ۳۴، ۶۲، ۶۳، ۱۰۶، ۱۱۱،
 ۱۳۲، ۱۳۳، ۳۰۲، ۳۱۹ -
 نیا لشکرین ۸۵ -
 و
 وارث شاه ۳۱ -
 وارسته ۳۸، ۸۸ -
 وجہی، ملا وجہالدین ۱۵۸،
 ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰،
 ۲۲۱، ۲۲۶، ۲۳۷، ۲۳۹،
 ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۹۵، ۳۰۴،
 ۳۱۱ -
 وجہالدین، مولانا ۸۵، ۱۳۲،
 ۱۷۷، ۲۹۳ -
 وراہیر خلف اذتیا داس (یا)
- وراہیر روتیا داس ۱۱۶،
 ولی عمر ۸، ۲۵۵، ۳۰۲، ۳۱۰،
 ۳۱۱ -
 و
 ہارون الرشید، خلیفہ ۶۱ -
 ہاشم علی ۳۰۲ -
 ہاورتہ ۱۱ -
 ہرن مار، ملک ۸۷، ۹۶ -
 ہنونت ۲۶۹ -
 ے
 یحییٰ، سید ۱۷۸ -
 یحییٰ گجراتی، شیخ ۱۵۰، ۱۶۲ -
 یدادہ، سید ۱۳۹ -
 یعقوب، قاضی ۲۷ -
 یحییٰ الدولہ بہرام شاہ ۵۹ -
 یوسف ۲۸۰، ۲۸۳ -
 یوسفی، حکیم ۳۱۷ -

مقامات

- ۱۵۳، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۷۷،
 ۱۷۸، ۱۹۰، ۲۷۷، ۳۱۷ -
 اردا ۱۲ -
 اردو بالغ ۱۲ -
 اردو فن ۱۲ -
 ارمن ۱۰ -
 استنبول ۱۷۸ -
 اصفہان ۲۰۴ -
 ۱
 آذربائیجان ۱۰ -
 آکسفورڈ ۲۹۱ -
 آگرہ ۲۶، ۲۰۳، ۲۰۴ -
 اجپیر ۱۳۷، ۲۶۲ -
 اجودھن ۱۳۸ -
 آجین ۱۰۹ -
 احمد آباد ۲۶، ۱۱۰، ۱۱۶،

۷۹ / ۸۵ / ۱۵۶ / ۱۵۸

ج

۱۸۲ / ۲۰۱ / ۲۰۲ / ۲۰۳

چالندھر - ۲۹۵

۲۱۵ / ۲۱۶ / ۲۱۷ / ۲۲۰

جرمنی - ۱۳

۲۵۳ / ۲۶۰ / ۲۶۸ / ۲۷۷

جلال آباد - ۱۶

۲۷۸ / ۲۸۹ / ۲۹۱ / ۲۹۵

جنیور دیپ - ۱۱۷

۲۹۸ / ۳۰۴ / ۳۰۷ / ۳۱۹

جون پور - ۱۶ / ۱۶۰

دولت آباد - ۲۰۱

جھڑ - ۱۳۵

جے پور - ۸۸

دہلی (یا دلی) ۱۵ / ۲۸ / ۲۹

ج

۳۱ / ۳۲ / ۳۵ / ۳۷ / ۳۸

چانپا نیر (یا چنپا نیر) - ۱۹۶

۴۸ / ۵۵ / ۶۱ / ۶۳ / ۸۳

چین - ۱۰ / ۲۰۱

۹۷ / ۹۸ / ۹۹ / ۱۰۰ / ۱۰۳

چینائی - ۳۰۸

۱۱۱ / ۱۱۲ / ۱۳۱ / ۱۳۵

۱۳۹ / ۱۴۲ / ۱۴۳ / ۱۴۴

ح

۱۴۶ / ۱۴۷ / ۱۴۸ / ۱۵۶

حیدر آباد - ۲۱۷ / ۲۱۸ / ۲۸۶

۱۵۷ / ۱۵۹ / ۱۶۰ / ۱۶۱

۲۸۹ / ۲۹۰ / ۲۹۱ / ۳۰۸

۱۶۷ / ۱۶۹ / ۱۹۲ / ۲۰۱

- ۳۰۹

۲۰۲ / ۲۳۷ / ۲۹۱ / ۲۹۵

- ۲۹۷

خ

دہلی، نئی - ۳۱

خان پور - ۱۹۰

دھارویوال - ۶۰

دھور سنڈور - ۱۶۷

خراسان - ۱۰ / ۲۷ / ۱۱۲ / ۱۶۵

- ۲۶۷

دیو گڑھ - ۲۰۱

خوارزم - ۱۱

ڈ

ڈوکر - ۱۶۷

د

ڈھولن وال - ۶۰

دائرہ دیں پناہ - ۷۷

ڈیرہ بابا نانک - ۷۷

دکن (یا دکھن) - ۲۵ / ۵۵

طوس ۱۱ -

و

راہون ۲۹۵ -

ردولی ۱۳۸ -

رسول آباد ۱۵۶ -

رسول پورہ ۱۵۴ / ۱۵۵ -

روس، جنوبی ۱۰ -

س

سرائہو، تحصیل ۱۱۰ -

سرائے ۱۳ -

سرمد ۱۳۸ -

سمرقند ۱۰ -

سندھ ۹۷ / ۱۳۳ / ۱۳۴ / ۱۵۱ -

۱۶۵ / ۱۶۷ -

سوڈن ۱۳ -

سہجوال ۶۰ -

سیلان، جزیرہ ۱۶۵ -

سیناپٹن ۳۰۸ -

ش

شادی آباد ۱۶۵ / ۱۹۶ -

شاہ جہان آباد ۳۱ / ۳۵ / ۳۸ -

۳۹ / ۴۰ / ۴۹ / ۵۱ / ۵۴ -

شیراز ۲۱۹ / ۸ -

ص

صفاحان ۲۱۹ -

ط

طوالیسی ۳۷ -

ع

عجم ۷ / ۲۲ -

عظیم آباد ۳۸ -

علی گڑھ ۶۲ / ۶۳ / ۶۴ / ۶۵ -

۶۶ / ۶۷ / ۳۱۲ / ۳۱۳ -

۳۱۹ -

عوض (اودھ) ۶۴ -

ف

فارس ۳۲۰ -

فتح پور میٹری ۲۰۳ / ۲۰۵ -

فرانس ۱۳ -

فیض آباد ۳۹ / ۴۹ -

ق

قائن ۱۷۸ -

قرقرم ۱۰ / ۱۲ -

قصور ۱۳۷ -

قندھار ۱۶ -

ک

کابل ۱۶ / ۱۳۷ -

کاشغر ۱۲ -

کاغان ۷۸ -

کانگڑہ ۷۸ -

کراچی ۱۰۷ -

کوت پور ۱۰۷ -

کرمناں ۴۳ / ۸۵ -

گولکنہ ۲۰۳ -

ل

لاہور ۱۱۰ / ۲۰ / ۲۶ / ۳۱
 ۳۱ / ۳۵ / ۳۶ / ۵۱ / ۵۵
 ۵۷ / ۵۸ / ۸۳ / ۱۰۲ / ۱۳۸
 ۱۴۰ / ۱۶۷ / ۲۰۴ / ۳۱۲ -
 لنکھنؤ ۲۵ / ۳۸ / ۴۱ / ۶۶
 ۲۳۷ / ۳۱۲ -
 لندن ۵۱ / ۲۹۰ / ۲۹۱ -
 لنکا ۲۶۶ -

م

مالوہ ۵۵ / ۱۰۳ / ۱۶۰ / ۱۶۱
 ۱۹۶ / ۲۹۷ -
 مانڈورا ۱۱۶ -
 مدینہ ۲۱ / ۱۶۴ -
 مرشد آباد ۳۸ -
 ممبئی ۱۶۷ -
 مغرب انصلی ۱۴ -
 مکہ ۲۱ / ۶۱ / ۱۱۰ / ۱۸۶ -
 ملتان ۹۹ / ۱۳۷ / ۱۶۶ -
 منڈو (یا مانڈو) ۱۶۵ / ۱۹۶ -
 موہن وال ۶۰ -
 میسور ۳۰۸ -

ن

ناگپور ۱۳۵ -
 نرپاد (یا نڑپاد) ۱۱۶ / ۱۵۲ -

کرناتک ۲۰۱ -

کرنال ۱۹۳ -

کڑوا ۲۷ -

کڑہ یا کڑی ۷۰ / ۷۲ / ۱۰۳ / ۱۱۰ / ۱۱۱ / ۱۶۳ / ۳۱۷ -

کڑہ ہی ۱۱۱ -

کشپور ۱۰۰ / ۱۶۷ -

کلکتہ ۲۰ / ۲۶۳ -

کلپور ۱۳۹ -

کوہ لاق ۲۹۳ -

کھوٹوال ۱۳۷ -

کیمبوج ۲۹۱ -

ک

کجرات ۵۵ / ۱۱۰ / ۱۱۶ / ۱۴۴
 ۱۵۰ / ۱۵۱ / ۱۵۲ / ۱۵۳
 ۱۵۴ / ۱۵۶ / ۱۵۸ / ۱۶۰
 ۱۶۱ / ۱۶۳ / ۱۶۳ / ۱۶۷
 ۱۷۲ / ۱۷۶ / ۱۷۸ / ۱۷۹
 ۱۸۲ / ۱۸۳ / ۱۹۰ / ۱۹۷
 ۲۲۰ / ۲۷۶ / ۲۷۷ / ۲۷۸
 ۲۹۱ / ۲۹۶ / ۲۹۷ / ۲۹۸
 ۳۰۰ / ۳۰۲ / ۳۰۴ / ۳۰۵
 ۳۰۶ / ۳۰۷ / ۳۱۷ -

کنس اوردو ۱۲ -

کرجستان ۱۰ -

کنگا / دریا ۱۱۰ -

گوڑ ۱۶۷ -

گوگی ۳۰۸ / ۳۰۹ -

نصرت آباد ۳۰۸ ، ۳۰۹ -
نیشاپور ۱۱ -

و

واسط ۱۷۸ -
والکا ، دریا ۱۳ -
ورنگل ۲۰۱ -
وندھیاچل ۲۰۳ -

ۛ

ہالی ۱۶ -
ہانسی ۱۳۸ -
ہرات ۱۱ -

۴۹ ، ۸۱ ، ۸۲ ، ۸۳ ، ۸۴ ،
۸۵ ، ۸۶ ، ۸۹ ، ۹۰ ، ۹۶ ،
۹۸ ، ۱۰۱ ، ۱۰۲ ، ۱۰۳ ،
۱۰۵ ، ۱۰۶ ، ۱۱۲ ، ۱۱۷ ،
۱۲۶ ، ۱۲۷ ، ۱۲۸ ، ۱۲۹ ،
۱۳۱ ، ۱۳۲ ، ۱۳۳ ، ۱۳۴ ،
۱۳۵ ، ۱۳۷ ، ۱۳۸ ، ۱۵۶ ،
۱۶۰ ، ۱۶۱ ، ۱۶۳ ، ۱۶۵ ،
۱۷۶ ، ۲۰۱ ، ۲۰۳ ، ۲۰۶ ،
۲۱۷ ، ۲۱۹ ، ۲۲۷ ، ۲۶۶ ،
۲۶۷ ، ۲۸۹ ، ۲۹۰ ، ۲۹۱ ،
۲۹۷ ، ۳۰۲ ، ۳۱۳ ، ۳۱۵ -
ہندوستان ، شمالی ۲۶۰ ، ۲۷۵ -
۲۹۱ -

ے

یورپ ۱۱ ، ۱۳ ، ۵۱ ، ۱۰۵ ،
۲۰۲ ، ۳۰۵ ، ۳۰۶ -

ہندوستان (یا ہند) ۳ ، ۱۳ ،
۱۵ ، ۲۰ ، ۳۰ ، ۳۳ ، ۳۶ ،
۴۰ ، ۴۱ ، ۴۳ ، ۴۴ ، ۴۶ ،
۵۵ ، ۵۸ ، ۵۹ ، ۶۱ ، ۶۲ ،
۶۳ ، ۶۴ ، ۷۳ ، ۷۶ ، ۷۷ -

اصطلاحات

}

اردو ہیکی (اوردہ ہیکی) ۲۷ ، ۲۷ -
۲۸ -
اردو نے ازون ۱۳ -
اردو نے بزرگ ۱۵ ، ۱۶ -
اردو نے بیضا ۱۳ -
اردو نے حضرت ۱۵ -
اردو نے غفر قرین ۱۵ ، ۱۶ ، ۲۰ -
۲۳ ، ۲۴ ، ۲۵ ، ۲۶ -

آفرین ۱۲۰ -
آنی اوردہ ۱۳ -
احاد ۱۱۶ -
ادب ، ملفوظاتی ۱۳۳ -
ادبیات ۳۸ ، ۱۹۲ ، ۲۰۲ ، ۲۷۵ -
۲۸۹ ، ۲۹۰ ، ۲۹۱ -
اردا ہیکی ۲۸ -

- اردوئے عالی (با علیا) ۱۵ / ۱۶ -
 اردوئے لشکر ۱۵ / ۱۶ -
 اردوئے مظلا ۱۱ / ۱۳ -
 اردوئے معلیٰ ۹ / ۱۵ / ۱۶ / ۲۵ ،
 ۳۶ / ۳۷ / ۳۸ / ۳۹ / ۴۰ ،
 ۴۱ / ۳۸ / ۳۹ -
 اساوڑی ۱۷۷ -
 اسم اشارہ ۲۲۵ / ۲۲۶ / ۲۲۷ ،
 ۲۲۸ -
 اسم صفت ۱۹۳ -
 اسم ضمیر ۱۸۷ / ۲۲۳ / ۲۲۷ ،
 ۲۲۸ -
 اسم فاعل ۲۳۵ / ۲۵۸ -
 اسم ماضی ۲۵۲ -
 اشاریہ ۲۹۰ -
 اشہام یا ۲۰۸ / ۲۰۹ -
 اصطلاح اہل اردو ۵۰ / ۵۱ -
 اعداد ۱۱۳ -
 اعراب ۲۶۰ -
 انصیح السنہند ۲۲۲ -
 اقوال ، عربی ۲۲۳ -
 الفی سکے ۲۱ / ۲۲ / ۲۳ / ۲۴ -
 اللہی سکے ۲۲ -
 املا ۲۰۷ / ۲۰۹ -
 اسر ۲۳۳ / ۲۳۹ / ۲۵۸ -
 اوردا ۱۱ / ۱۳ -
 اوردو ۳۰ / ۳۲ -
 آوردہ ۲۸ -
 اول ۱۱ -
 ایراد ۲۲۱ / ۲۵۳ -
 پ
 بارہ سادہ ۱۸۵ -
 بحر ۱۷۸ / ۱۷۹ / ۱۸۷ / ۱۹۸ ،
 ۱۹۹ / ۲۰۰ -
 بدیع ۱۰۵ / ۳۱۷ -
 برنگ ۶۱ -
 بسط ۳ -
 بلاول ۱۷۷ -
 بند ۱۷۶ / ۱۸۵ / ۳۱۰ -
 بھاکرہ ۱۷۷ -
 بیت ۲۱۰ -
 بیان ۱۰۵ / ۳۱۷ -
 بہت ۱۳۸ / ۱۳۹ -
 پ
 پرچین کاری ۷۷ / ۷۸ -
 پردہ ۳ / ۱۱۵ / ۱۳۲ / ۲۹۳ -
 پنگل ۱۹۸ -
 پی ۷۷ -
 پرزی ۷۷ / ۲۹۳ -
 پان ۱۶۸ / ۱۷۳ / ۱۷۶ / ۳۰۱ -
 ت
 تاریخ ، مکتوبی ۱۹۳ -
 تاریخ ، ملفوظی ۱۹۳ -
 تال ۳ / ۴ -
 تال ادھیا ۱۹۷ / ۳۰۶ -

تبه ۷۸ -

ج

تجسس ۱۱۴ -

چیستان ۱۴۲ -

تخلص ۱۵۶ / ۱۸۵ / ۳۰۱ -

ح

ترانه ۳ -

حاصل دصغر ۲۵۰ / ۲۵۱ / ۲۵۸ -

تحفیف ۲۰۸ / ۲۰۹ -

حال و قال ۱۵۶ -

تذکره ۲۸۶ / ۲۸۷ -

حرف علت ۹۸ -

تذکیر و تانیث ۲۲۹ / ۲۳۷ -

حروف استعراک ۲۳۷ -

تصرف یا تصرف ۹۶ / ۱۲۰ /

حروف حلقی ۲۶۰ -

۲۲۸ / ۲۳۳ / ۲۵۱ / ۲۶۰ /

حروف عاطفه ۲۳۰ / ۲۳۷ / ۲۷۸ -

۲۶۱ -

حشو ۲۸۰ / ۲۸۵ -

تصوف ۱۳۳ / ۱۳۴ / ۱۹۰ /

خ

۱۹۲ / ۳۰۹ -

تعذیه ۸۲ -

خرق ۱۳۴ -

تعلیق ۱۱۶ -

خوم گاه ۷۶ / ۱۱۲ -

تجسیم ۷۸ / ۱۱۶ -

خط لاهوری ۱۱۶ -

تئوین ۱۱۳ -

خلافت نامه ۸۳ / ۱۳۹ -

ط

خیاسی ۱۹۸ / ۱۹۹ -

تبه ۱۵۷ -

خیال ۳ / ۴ / ۱۵۷ -

ذ

توئی ۱۷۷ -

دانگانه یا دهنگانه ۷۷ / ۹۷ -

توئی ، ملاتی ۸۵ -

دبستان ۲۰۳ / ۲۷۶ -

ج

دبستان اردو ۲۹۶ -

جازه ۱۹۳ / ۲۵۵ -

دبستان اکبری ۲۰۴ / ۳۰۵ -

چکری (ذکری) ۷۳ / ۸۵ / ۱۴۲ /

دبستان دکن ۲۰۴ / ۲۰۵ / ۲۷۷ -

۱۵۷ / ۱۷۶ / ۲۹۳ /

۳۰۲ -

۳۰۲ / ۳۰۳ -

دبستان هرات ۲۰۵ -

جوهر ۵۷ / ۵۸ -

دبستان ، مغولی ۲۰۶ -

ذو سطنه ۱۴۲ -

دو حه یا دو حره ۱۳۲ / ۱۳۳ /

۱۴۰ / ۱۴۱ / ۱۴۲ / ۱۴۵ /

۱۴۶ / ۱۴۸ / ۱۵۸ / ۱۶۰ /

۱۶۷ / ۱۷۰ / ۱۷۱ / ۱۷۳ /

۱۷۶ / ۱۹۸ / ۲۰۰ / ۲۲۲ /

۲۶۸ / ۲۹۲ / ۲۹۳ / ۲۹۵ /

۳۰۱ -

دهتاسری ۱۷۷ -

دیساکه ۱۷۷ -

دو گیری ۱۷۷ -

ذ

ذومعنی ۱۱۴ -

ز

رباعی ۸۹ -

ردیف ۱۸۵ -

روز مره ۹۱ / ۹۳ / ۹۵ / ۱۳۰ /

۲۴۷ / ۲۶۲ / ۲۶۵ -

ریخته ۱ / ۲ / ۳ / ۴ / ۵ / ۶ /

۷ / ۸ / ۹ / ۳۹ / ۴۰ / ۴۱ /

۴۲ / ۴۳ / ۴۸ / ۱۳۰ / ۱۳۲ /

۱۶۹ / ۱۷۰ / ۲۹۳ / ۲۹۵ -

ز

زحافات ۱۹۸ -

س

سباعی ۱۹۸ -

سجج ۱۹ -

سرقه ۲۴۲ -

سلوک ۲۲۳ -

سنه الهی ۲۲ / ۲۴ -

سیام ویرازی ۷۷ -

سی حرف ۱۸۵ -

ش

شجره ۷۳ / ۷۷ / ۱۷۹ -

ص

صرف و نحو ۷۷ / ۲۲۱ -

صرفی خصوصیات ۲۲۵ -

ض

ضرب المثل ۹۲ / ۹۳ / ۹۴ / ۹۵ /

۲۲۱ / ۲۴۰ / ۲۶۲ / ۲۶۶ /

۲۶۸ / ۲۶۹ / ۲۷۱ -

ضمیر متفصل ۲۵۳ -

ع

عروض ۱۰۵ / ۱۵۸ / ۱۹۰ /

۱۹۷ / ۱۹۸ / ۱۹۹ / ۳۰۶ /

۳۱۷ -

عقله ۱۷۳ / ۱۷۴ / ۱۷۶ / ۱۸۵ /

علاق ۱۷۶ -

غ

غزل (موسیقی) ۳ -

ق

قک انبات ۲۰۹ -

ق

قصیدہ ۱۸۰ / ۱۸۱ -

قول ۲ / ۲۹۲ -

ک

کائنات ۱۵۷ -

کلیان ۱۵۷ -

کنیت ۱۱۳ / ۱۸۰ -

ک

کند ۱۵۷ -

ل

لاحقہ ۲۶۰ -

للت ۱۵۷ -

م

ماخذ ۳۱ / ۱۳۲ / ۲۲۲ / ۲۷۱ -

۲۸۸ / ۲۹۱ / ۳۰۷ / ۳۰۹ -

۳۱۹ -

مادۃ تاریخ ۱۹۳ -

مثالی السانہ ۲۱۷ -

مجاز ۱۳۸ -

معاورہ ۵۶ / ۸۷ / ۸۸ / ۸۹ / ۹۰ -

۹۱ / ۹۲ / ۹۳ / ۹۴ / ۱۳۲ -

۱۶۶ / ۱۶۷ / ۲۰۰ / ۲۲۱ -

۲۲۷ / ۲۳۰ / ۲۳۳ / ۲۳۹ -

۲۵۳ / ۲۵۷ / ۲۶۲ / ۲۷۷ -

مرادف ۷ / ۱۰۳ / ۱۰۴ / ۱۱۹ -

۱۲۰ / ۱۶۳ / ۲۵۸ / ۳۱۵ -

سجع ۲۱۸ -

سماز الیہ ۲۲۶ -

سماز (بهر) ۱۹۹ -

مقدر ۲۳۲ -

مقدمہ ۲۱۸ -

مقطع ۵ / ۱۸۵ -

مقتول ۲۱۸ -

مقابوہ ۱۱۳ -

مقولہ ۲۲۳ / ۲۲۳ / ۲۷۱ -

مکاشفہ ۱۸۳ / ۱۸۵ -

مکرمی ۱۳۲ -

مملووظات ۱۲۳ / ۱۳۴ / ۲۹۲ -

مناجات ۱۶۹ / ۲۱۰ / ۳۰۰ -

۳۱۱ / ۳۱۰ -

موسیقی ۱۳۷ / ۱۳۲ / ۲۹۲ -

۲۹۳ / ۲۹۸ -

ن

نثار ۲۶ -

نستعلیق ۲۰ / ۲۱ / ۲۰۷ -

نسخ ۱۱۶ / ۲۰۷ -

و

وار ۱۳۳ -

وزن ۱۶۳ / ۱۷۶ / ۱۷۸ / ۱۸۵ -

۱۸۷ / ۱۹۲ / ۱۹۸ / ۱۹۹ -

۲۰۰ -

ے

یورت ۱۱ -

کتابیات

- القبول ۱۸۶ -
 انوار العیون ۱۳۸ -
 انوار المجالس ۱۳۳ -
 ب
 باراہی سنگھتا ۱۱۶ -
 باغ اردو ۳۲ -
 باغ و چار ۳۵ ، ۳۲ -
 بیابوتھیکا جیوگریفورم عراقیکورم
 ۱۲ -
 بحر الفضائل ۵۸ ، ۸۶ ، ۱۰۲ ،
 ۱۰۳ ، ۱۰۶ ، ۱۰۹ ، ۱۱۰ ،
 ۱۱۳ ، ۱۱۵ ، ۱۱۶ ، ۱۲۰ ،
 ۱۶۳ ، ۱۵۵ ، ۲۹۵ ، ۳۱۶ ،
 ۳۱۷ -
 برتھالڈ ۱۲ -
 برہان قاطع ۳۲۰ -
 بری ہتھ سمیتہ ۷۸ -
 بزم آخر ۲۸ -
 بناکتی ۱۲ -
 بوستان سعدی ۲۱۵ -
 بچار عجم ۵ ، ۸۸ -
 بیاض سراقی ۳۱۱ -
 پ
 بران ۱۱۷ -
 آثار الصنادید ۳۱ ، ۳۶ -
 آئین اکبری ۱۶ ، ۲۸ ، ۵۵ ،
 ۱۱۰ ، ۱۶۷ ، ۳۱۹ -
 اخبار الاخبار ۱۳۵ ، ۱۳۶ ، ۱۳۸ ،
 ۱۵۹ ، ۱۷۶ ، ۲۹۲ ، ۳۰۲ ،
 ۳۰۳ -
 اختیارات بدیمی ۲۰۳ -
 اختیارات لعل شاہی ۲۰۳ -
 ادات الفضل ۱۰۲ ، ۱۰۳ ، ۳۱۷ -
 اردو شہ ہائے ۱۸۲ ، ۱۸۳ ،
 ۲۸۹ ، ۲۹۰ ، ۳۰۲ ، ۳۰۵ ،
 ۳۰۷ ، ۳۰۹ ، ۳۱۰ -
 اردوئے قدیم ۱۳۰ ، ۱۳۸ ، ۲۷۸ ،
 ۲۸۶ ، ۲۸۹ ، ۳۰۸ ، ۳۰۹ ،
 ۳۱۰ -
 اردوئے معلیٰ ۳۴ -
 ارشاد نامہ ۱۸۲ -
 اساسی ۱۱۳ -
 اسرار عشق ۳۰۸ -
 اعجاز سخن ۲ -
 الفضل الفوائد ۱۳۳ -
 اللہ خدائی ۳۱۶ ، ۳۱۷ ، ۳۱۸ -
 النظمی ۱۱۳ -
 اسواج خوبی ۱۹۰ ، ۱۹۱ ، ۱۹۲ ،
 ۲۷۷ -

- پس پردہ ۲۸۹ -
 پوائش لسانی ۳۱۹ -
 ت
 تاج الحقائق ۲۱۸ -
 تاریخ آل یوسف ۶۸ -
 تاریخ بیهقی ۸۵ -
 تاریخ رشیدی ۲۸ -
 تاریخ زبان اردو ۳۷ -
 تاریخ شیر شاہی ۴۲ -
 تاریخ فرشتہ ۱۳۳ / ۱۳۷ -
 ۳۰۳ -
 تاریخ فیروز شاہی ۱۳ / ۱۵ -
 ۶۸ / ۷۸ / ۸۱ / ۸۶ / ۱۱۰ -
 ۱۱۲ / ۱۱۶ / ۱۳۳ / ۲۶۳ -
 تاریخ مغول (انگریزی) ۱۱ -
 تاریخ وصف ۲۱۹ -
 تحفۃ الابرار ۱۳۳ -
 تحفۃ السعادت ۳۲۰ -
 تحفۃ الکرام ۱۵۰ / ۱۵۱ -
 ۱۵۲ / ۱۵۳ / ۱۵۵ / ۱۶۲ -
 ۱۶۶ / ۱۶۷ -
 تحفۃ المجالس ۱۳۸ -
 تحفۃ الہند ۳۱۹ -
 تحقیق الفتویٰ ۱ -
 تذکرہ خسرو ۳۱۳ -
 تذکرہ گلزار ابرار ۱۶۶ -
 تذکرہ گلستان سخن ۳۶ -
 تذکرہ میر حسن ۲۹۳ -
 تذکرہ نکات الشعراء ۳۹ -
 تذکرہ ہندی ۳۵ / ۳۸ / ۳۹ -
 ۵۰ -
 ترجمہ حکیم رفاعیہ ۱۷۸ -
 ترجمہ قرآن ۸ -
 توریت ۱۸۵ / ۱۸۶ -
 توزک بابری ۱۳ -
 تہذیب المعاصرو ۱۱۳ -
 قیوم نامہ ۲۶۵ -
 ث
 ثنائے بھدی ۶۸ -
 ج
 جام جہاں نما ۱۹۰ -
 جامع التواریخ ۱۲ -
 جامع القواعد ۲۲۸ -
 جامع الفوائد ۲۶۷ / ۲۶۹ -
 جلوۃ خضر ۲ / ۳۵ -
 جواہر اسرار اللہ ۱۷۸ / ۱۷۹ -
 ۱۸۰ / ۱۸۱ / ۱۸۳ / ۱۹۸ -
 ۳۰۳ -
 جواہر المعادن ۱۰۵ / ۳۱۷ -
 جواہر خسروی ۳۱۳ -
 جواہر فریدی ۱۳۸ / ۱۴۰ -
 جہاں کشا ۱۲ -
 ج
 چار درویش ۵۰ / ۵۰ -

دیوان ابوالفرج رومی ۵۷ -
 دیوان مغربی ۱۵۸ / ۱۸۳ -
 - ۳۰۰ -

دیوان رانی غنیر خان ۶۵ -

ذ

ذکیرز ۱۳ -

ذ

ذکر میر ۳۰ -

ذ

رسالہ اخوان الصفا ۳۲ -

رسالہ اردوئے قدیم ۳۳ -

رسالہ ایشیائیک موسائٹی بنگال
 - ۳۹ -

رسالہ درامتیق زبان اردوئے معانی
 - ۳۶ -

رسالہ عبدالواسع ۱۳۳ / ۲۹۵ -

رسالہ ہندی لغات ۳۷ -

رشد نامہ ۱۳۸ / ۱۳۹ / ۲۹۶ -

روحة الصفا ۱۲ -

ریاض الادبیہ ۱۰۳ -

ز

زبان رشتہ ۳۹ -

زمان گویا ۱۰۳ / ۱۱۳ / ۳۱۷ -

س

ساقی نامہ ۲۸۳ -

سب زم ۱۳۸ / ۱۵۸ / ۲۱۷ -

۲۱۸ / ۲۲۰ / ۲۲۱ / ۲۲۲ -

چہند چہندان ۱۹۷ / ۳۰۶ -

ح

حبیب البحر ۱۲ -

حوت البقا ۱۸۲ -

حصرت نامہ ۶۸ -

حمد ہاری ۳۱۸ -

خ

خالق ہاری ۳۱۳ / ۳۱۴ / ۳۱۵ -
 - ۳۱۶ -

خاور نامہ ۳۱۱ -

خزائن الفتوح ۶۵ / ۹۰ / ۹۱ -

خزینۃ الاسفیا ۱۳۹ / ۱۵۷ /
 ۱۶۳ / ۱۶۷ / ۱۷۷ -

خزینۃ الامثال ۲۶۲ / ۳۱۹ -

خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم
 - ۳۶ / ۱ -

خلاصۃ التواریخ ۱۳۳ -

خوب ترنگ ۱۹۰ / ۱۹۱ / ۱۹۲ -
 ۱۹۷ / ۲۷۷ / ۳۰۶ -

د

داستان امیر حمزہ ۴۱ -

درۃ قادریہ ۲۱۹ -

دریائے لطافت ۳۸ / ۴۲ -

دستور الافاضل ۱۰۲ / ۳۱۷ -

دستور العمل ۲۹۵ -

دکن میں اردو ۱۳۵ / ۲۷۸ -

دلائل فیروز شاہی ۱۱۶ -

مخالف السوکه ۱۳۵ / ۱۳۶ -

صراح ۳۲۰ -

صرف اردو منظوم ۳۲ -

صفت احمدی ۱۹۰ -

صداقة كبر ۵۸ -

صمد باری ۳۱۹ -

ط

طبقات اکبری ۱۶ / ۱۱۰ -

طبقات ناصری ۱۳ / ۱۵ / ۶۱ -

طوطا کھانی ۳۱ -

طوطی نامه ضیاءالدین نقشبندی ۳۱ -

طوطی نامه (مجد قادی) ۳۱ -

ظ

ظہور الاسرار در شرح غزن اسرار

۱۰۶ -

ظہیر الانشاء ۳۵ / ۹ -

ع

عروس عرفان ۳۰۹ / ۳۱۰ -

عشق نامه ۱۳۸ -

عنایت نامہ الہی ۶۸ -

عین عطا ۳۹ -

غ

غرائب اللغات ۳۷ / ۵۰ / ۵۱ -

۳۱۵ / ۳۱۸ / ۳۱۹ / ۳۲۰ -

غرة الکمال ۸۹ / ۹۶ / ۱۳۲ / ۲۹۳ -

۲۳۰ / ۲۳۳ / ۲۳۵ / ۲۳۹ -

۲۴۰ / ۲۶۲ / ۲۷۳ / ۲۷۵ -

۲۹۵ / ۳۰۳ -

سراج السالکین ۱۳۱ -

سراج اللغة (خان قرزو) ۳۹ -

سروری ۳۲۰ -

سفرنامه چنگیزی ۱۳ -

سکندر نامہ ۱۱۱ -

سیر الاولیا ۵۸ / ۶۰ / ۶۸ -

۸۵ / ۱۳۳ / ۱۳۹ -

۱۵۲ / ۲۹۳ -

سیر العارفین ۱۱۱ -

ش

شاه نامہ ۱۰۲ -

شرح گلستان سعدی ۱۰۶ -

شرح غزن اسرار ۶۰ / ۱۰۵ -

۱۰۶ / ۱۰۷ / ۱۰۸ / ۱۰۹ -

۱۱۱ / ۱۶۳ / ۳۱۷ -

شرح الشعرا ۸۷ -

شرف نامہ ابراہیم قازوق ۱۰۳ -

شرف نامہ احمد منبری ۵۸ / ۷۹ -

۳۱۷ -

شعر العجم ۸۷ / ۸۹ -

ص

صباح ۳۲۰ -

امروز شامی ۸۶ -

ق

قرآن السعدین ۶۲ / ۶۳ / ۶۴

۹۶ / ۱۱۰ -

قرآن (محمّد) ۱۳۷ / ۱۶۷ / ۲۱۹

۲۹۲ -

قصائد انوری ۱۱۱ -

قصه حسن و ذل ۲۱۷ -

طلب مشتری ۲۱۸ / ۳۱۱ -

قواعد زبان هندوستانی (انگلیزی)

۳۲ -

ک

کتاب الهند ۵۶ / ۹۹ -

کتاب پاراهی ۷۳ / ۷۸ -

کتاب چشتیه ۱۳۲ / ۱۷۶ / ۱۷۷

۱۷۹ / ۲۹۳ / ۳۰۳ -

کشف اللغات ۳۲۰ -

کلمة الحقائق ۱۸۲ -

کلیات محمد قلی قطب شاه ۲۰۰

۲۰۲ -

ک

گرفته صاحب ۱۳۱ -

گلستان (سعدی شیرازی) ۳۲

۲۳۲ -

گلستان سخن ۳۶ -

ل

لسان الشعرا ۱۱۳ -

ف

فرهنگ آملیه ۲۸ / ۳۷ / ۲۶۲ -

فرهنگ آند راج ۵۷ / ۶۲ -

فرهنگ بهار الفضائل ۹۰ / ۱۳۹

۱۶۳ / ۲۹۷ -

فرهنگ جہانگیری ۳۲۰ -

فرهنگ رشیدی ۵۷ / ۳۲۰ -

فرهنگ شرفنامه احمد منیری ۷۹ -

فرهنگ قوسی ۳۸ -

فرهنگ نامہ شیخ زادہ عاشق ۱۱۳ -

فرهنگ نامہ قراسی ۵۸ / ۱۰۲

۱۰۳ / ۳۱۷ -

فرهنگ نورالابصار ۲۸ -

فسائد عجائب ۲۱۹ -

فوائد الفوائد ۱۱۲ / ۱۳۳ / ۱۳۵

۱۳۶ / ۱۳۷ / ۲۹۲ -

فہرست فارسی مخطوطات (مرتبہ

آلہوتاب) ۱۶۶ -

فہرست کتاب خانہ اودہ ۵۵ / ۱۰۵

۲۷۷ -

فہرست مخطوطات فارسی ۱۰۵ -

فہرست مخطوطات هندوستانی ۳۰

۲۷۷ -

فہرست مسکوکات اندرین میوزیم ۲۰ -

فہرست مسکوکات ہبلک میوزیم

۲۵ -

فہرست مسکوکات شاہان مغلیہ

۲۰ -

- لطائف الطوائف ٣٠ -
 لغت فارس احمدی ١١٣ -
 لبراسب نامه ٦١ -
 لیلی مجنون (مثنوی) ٢٠٥ / ٢٠٤ -
- م
- مائت سادات ٦٨ -
 ماء و بکر ٣١٠ -
 متخلص قرآن ١١٣ -
 مثنوی خوب ترنگ ١٩٢ -
 مثنوی لیلی مجنون ٢٠١ / ٢٠٣ -
 مثنوی یوسف زلیخا ٢٤٦ / ٢٤٤ -
 مجمع الاولیا ١٣١ / ١٤٤ / ٣٩٣ -
 محیط اعظم ١٢٨ -
 غزن اسرار ٦٠ / ١٠٥ / ١٠٦ -
 ١٥٩ -
 غزن الاصفیا ٢٩٢ -
 غزن نکات ٢٩٨ -
 مرآت احمدی ١٥٠ / ١٥١ -
 ١٥٢ / ١٥٣ / ١٦١ / ١٦٥ -
 ١٥٤ / ١٥٨ / ١٩٠ / ٢٩٦ -
 ٢٩٤ / ٣٠٠ / ٣٠٣ -
 مرآت سکتوری ١١٠ / ١١١ -
 ١٥٣ / ١٥٥ / ١٥٦ / ١٦٢ -
 ١٦٣ / ٢٩٦ -
 مصحف ٢٢٣ -
 مطلع السعدین ٣٨ -
 معراج العاشقین ٢٨٨ -
 مفتاح الفتوح ٩٠ -
- مفرح القلوب ٤٩ / ٨٠ / ٨١ -
 ٨٢ / ٩٠ / ٩٣ / ٩٥ -
 مقامات بدیع ٢١٩ / ٢٤٣ -
 مقامات حریری ٢١٩ -
 مقامات حمیدی ٢١٩ / ٢٤٣ -
 مقدمه جاز الله زنجیری ١١٣ -
 مقدمه نکات الشعرا ٣٩ -
 ملفوظات مخدوم جهانیان ١٣١ -
 من لکن (مثنوی) ٣٠٩ / ٣١٠ -
 مناقب محمد شاهی ٤٣ -
 منتخب التواریخ ١٦ / ٢٢ / ٢٣ -
 ٢٤ / ١٣٢ -
 منتخب الباب ٣٣ -
 منتخب رشیدی ٣٢٠ -
 مرقیومیشل رحیمز آف دغلی ٣٣ -
 منتخب الآمال ٣٢٠ -
 مؤید الفضلا ٣٣ / ٣٣ / ٥٨ -
 ٨٠ / ٣٢٠ -
- ن
- نامه مراد ٣٥ / ٣٦ / ٣٤ / ٥٢ -
 نجم الامثال ٩٣ / ٩٣ / ٢٦٢ -
 نصاب سه زبان ٣١٨ -
 نکات الشعرا ٣٩ / ٢٩٣ -
 نور الابصار ١١ / ٣٠ -
 نو طرز مرصع ٣٠ / ٣٥ / ٣٩ -
 ٥٠ / ٢١٩ -
 نیومستک سیلینک ٢٩ -
 نیه قلوب ٣١١

هفت اقلیم ۱۱۱، ۶۰ -

هیر وارث شاه ۳۱ -

ی

یادگار اثریات دهل ۳۳ -

یوسف زلیخا (مثنوی) ۱۸۳، ۲۶۶، ۲۶۷

۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱

- ۳۰۳

و

واقعات دارالحکومت دهل ۲۹ -

وصاف ۱۲ -

ه

هابسن جابسن ۱۱، ۳۰ -

هتدیش ۷۹ -

صحت نامہ اغلاط

صحت	غلط	سطر	صفحہ
آن جا	آجاں	۲۰	۴
دن دین	دن این	۲۱	۶
ہاہند	ہاہند	۱۰	۱۱
ختم	گم م	۱۱	۱۲
دوسراغہ	دوسراغہ	۵	۱۴
سرے پر برقی	سرے بچ پر بری	۳	۱۸
بادشاہ غازی ضرب	...بادشاہ غازی	۳	۲۱
اردوے ظفر قرین	ضرب اردوے ظفر قرین	۳	۲۱
X تمام	تمام	۲	۲۲
عدد دواعی	میدودواعی	۵	۲۲
نہر جاری ہے	نہر جا رہی ہے	۷	۳۲
دو دستہ	دو دشتہ	۸	۳۲
داخل ہوتے ہیں	داخل ہوتے ہیں	۱	۳۰
۱۱۹۳ء	۱۱۹۳ء ح	۲ (حواشی)	۳۰
۱۱۹۶ء	۱۱۹۳ء ح	۷	۳۵
شراب کچھ خوار	شراب کچھ خوار	۸	۶۹
خضر خان	خضر خان	۷	۸۹
نوزائیدہ	نوزائیدہ	۳ (حواشی)	۹۶
نیلچ	میلچ	۱۰	۱۰۰
حلیہ	جلہ	۱۵	۱۱۳
ان کو نعمت	ان کو یہ نعمت	۳	۱۳۷
تساؤ (۱)	تساؤ (۱)	۲۳	۱۵۱
محروم	روم	۱۱	۱۵۳
مقرر	مقر	۹	۱۵۵

صفحہ	سطر	خط	صحیح
۱۶۵	۷	ابن	باہن
۱۷۰	۳	روی نوشین	روی نوشین
۱۷۱	۵	زکھوۃ	زکھوۃ
۲۰۹	۲۳	دینا	دینا
۲۱۳	۱ (حواشی)	غالب	غالباً
۲۲۱	۲۵	حرف	حرف
۲۲۵	۱۷	ذانس	ذانس
۲۳۲	۱	ہوں پد کر کے	پد ہوں کر کے
		بولے	بولے
۲۳۵	۶	بازار سے بازار	بازار سے بازار
۲۵۵	۹	بازار میں بازار	بازار میں بازار
۲۳۶	۱۳	اس سے ظاہر کہ	اس سے ظاہر ہے کہ
۲۳۹	۲۵	کے گا	کرے گا
۲۴۱	۱۸	ہور در بریاں	ہور در بریاں
۲۵۰	۱۳	ہور	ہور
۲۵۳	۹	برہمانی	برہمانی
	۱۵	بھی دیتا	بھی دیتا ہے
۲۶۳	۱ (حواشی)	'سارا مار' کو اردو	'سارا مار' اردو
۲۶۷	۱۲	بولیچہ ہیں کہ	بولیچہ ہیں کہ
		بھوک ہور نیماں	بھوک ہور نیماں
		ہور ولیاں کی	نیماں ہور ولیاں
		نیماں میراث ہے	کی میراث ہے
۲۷۳	۸	نلمتے	نلمتے
۲۷۴	۱۶	نیرے	نیرے
۲۷۶	۱۰	سولہویں صدی عیسوی	دسویں صدی عیسوی
۲۷۷	۱۶-۸	ہوسکتا ہے	خوب پد چشتی
۲۷۹	۱۹	دبے کر	دھکر